مقالات جامعی

جدیدیت و مغربیت پر مشتمل جدید افکار کا محاسبہ علمی کرتی
سید خالد جامعی کی محققانہ تحریروں کا مجموعہ

جلد :سویم

مرتب کردہ

ڈاکٹر محمد علی جنید

Karachi University Research Forum

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

Kurf©2020کرف™
جامعہ کراچی دارٌالتحقیق برائے علم و دانش© ۲۰۲۰
عنوان:مقالات جامعی:جلد سویم۔
مقالہ نگار ومحقق:سید خالد جامعی۔
مرتبہ،تدوین،پیشکش،تہذیب،سرورق:ڈاکٹر محمد علی جنید۔
جنس:مقالات و تنقید ۔
ایڈیشن:دویم۔
کلید:جدیدیت،مغربیت،فلسفہ،علمیت،علم کلام،اسلام،ایڈورڈ سعید،، سرقہ،ٹیکنالوجی،جھاد،شاعری،اوردو ادب،توہین رسالت،سید خالد جامعی،داکٹر محمد علی جنید،کرف،مکتبہ جامعہ کراچی۔

www.facebook.com/kurf.ku
www.facebook.com/groups/kurfku
www.kurfku.blogspot.com

جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم و دانش

تعارف

سید خالد جامعی صا حب اردو زبان میں جدیدیت اور پس جدیدیت کے تناظر میں ایک بڑا نام ہیں عصر حاضر میں جدید فلسفہ ،مغربیت ،جدیدیت ،مسلم جدت پسند شخصیات و کُتب پر انکا تحریری سرمایہ،نقد و جرح محققین کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں ہے ۔

خالد جامعی صاحب ۱۹۵۸ کو پیدا ہوئے،اور ۱۹۸۵ میں انھونے جامعہ کراچی،شعبہ ابلاغ عامہ سے اپنا ماسٹر کیا ۔انکا تعلق کچھ عرصہ طلبہ سیاست سے بھی ر ہاہے ،سمجھیں جس جدت پسندی ،جمہوریت و مغربیت پر انکا قلم نقدی سخاوتوں کا مظاہرہ کرتا ہے وہ ان سب عملی مباحث سے نا صرف واقف حال ہیں بلکہ ان سے انکا تعلق کسی نہ کسی بنیاد پر رہا ہے ۔

لہذا اس کوچہ اور فکری بحث کی مبادیات سے انھیں عملی واقفیت بھی طلبہ سیاست کے دوران بخوبی رہی ،انھونے لبرلسٹس،لیفٹسٹوں،لبرل جمہوریوں کو قریب سے دیکھا،خالد جامعی صاحب ،بعد ازاں ایک طالب علمانہ دور سے گزر کر جامعہ کراچی سے انتظامی طور پر بہ سلسلہ روزگار وابستہ ہوگئے ،انھونے اس دوران نظمیہ جاتی گوناگوں ذمہ داریاں سرانجام دیں جن میں ہماری معلوما ت کی رو سے اسٹنٹ رجسٹرار ،ڈپٹی رجسٹرار سے لیکر ناظم شعبہ تصنیف و تالیف تک کی ذمہ داریاں خاص الخاص ہیں ۔

ایک قولِ جامعی کے مطابق جب انھونے شعبہ تصنیف و تالیف[1] کی ذمہ داریاں ۲۰۰۱ء میں سنبھالیں تو جو خدمات انھونے سرانجام دیں اور اس پیشہ ورانہ سفر میں جو کامیابیاں بٹوری اسکا حال ذیل میں خود انکی زبانی پیش کیا جاتا ہے۔

---

[1] Karachi university press

شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ میں اہم ذمہ داریاں ادا کرتے ہوئے راقم الحروف کو تین برس گزر چکے ہیں۔ ۲۵ جنوری ۲۰۰۱ء کو راقم نے اس شعبے کی نظامت سنبھالی، تب شعبے کے سالانہ اخراجات ۲۷ لاکھ روپے تھے، اب الحمدللہ شعبے کے اخراجات صرف ۲۳ لاکھ روپے سالانہ ہیں۔ میری نظامت سے قبل ۲۰۰۰ء میں شعبہ تین لاکھ روپے کے خسارے میں تھا، الحمدللہ اب اس کا خسارہ ختم ہوگیا ہے اور ۲۰۰۳ء میں ہمیں تیس لاکھ روپے کا خالص نفع حاصل ہوا ہے اور کارکردگی کا معیار پہلے کے مقابلے میں بہت بہتر ہے۔ سالانہ اخراجات کی مد میں پچاس لاکھ روپے سالانہ بچت کسی تبصرے کی محتاج نہیں، اخراجات میں پچاس لاکھ روپے کی بچت شعبے کے رفقائے کار کے بے لوث تعاون، دیانتداری اور انتھک محنت کے بغیر ممکن نہ تھی۔

- -

طویل عرصے کے بعد شعبے کے زیرِ اہتمام نئی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہوا۔ جناب ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کے عہدِ نظامت میں اس طرف خصوصی توجہ دی گئی۔ عبدالمجید سالک کے کالموں کا انتخاب ''افکار وحوادث'' کے نام سے دو جلدوں میں، مہدی علی صدیقی کی خودنوشت سوانح ''بلاکم وکاست'' اور بروشسکی زبان کی قواعد

''شمول بوق'' اور ڈاکٹر عاقل برنی کی کتاب "Risk Theory and Insurance" شائع ہوئی۔

''جریدہ'' جو شعبے کا علمی وتحقیقی رسالہ ہے، اس کا آخری شمارہ نمبر سترہ، ۱۹۸۵ء میں شائع ہوا تھا اس کے بعد جریدہ بند ہوگیا۔ الحمدللہ سترہ سالہ تعطل کے بعد جریدہ باقاعدگی سے دوبارہ شائع ہونے لگا، شمارہ نمبر اٹھارہ اصطلاحاتِ ابلاغیات، شمارہ نمبر انیس اصطلاحاتِ جمالیات، شمارہ نمبر بیس اصطلاحاتِ ماحولیات اور شمارہ نمبر اکیس لسانیات نمبر تھا۔ شمارہ نمبر بائیس وادیِ سندھ کے رسم الخط پر دنیا بھر میں ہونے والے تحقیقی کام کا احاطہ کر رہا ہے۔ اس شمارے میں موئن جودڑو کی دو ہزار مہریں پڑھنے والے پاکستانی محقق مولانا ابوالجلال ندویؒ کے نوتحقیقی مضامین شامل ہیں جو وادیِ سندھ کے رسم الخط کے بارے میں نئے انکشافات پر مشتمل ہیں۔

ابو جلال کی یہ شاہکار اتکشافاتی تحقیق رب العالمین کے فضل و کرم سے ہم أن لاین پیش کرچکے ہیں ،اسکے علاوہ لغتِ متروکاتِ اردو، جیسی اہم أن لاین اشاعت کی برقی اشاعت خالد جامعی کے سبب ممکن ہوئی ہے ،ہماری ساری ذاتی أن لاین برقی اشاعتیں کسی نہ کسی صورت میں انکے تعاون کی مرہونِ منت ہیں ۔

خالد جامعی نے مرحوم ڈاکٹر خالد حسن صاحب کی لغت متروکات اردو کو قابلِ اشاعت بنانے میں جس علمی جانفشانی کا مظاہرہ کیا اسکو جتنا سراہا جائے کم ہے۔

جناب خالد جامعی صاحب کا تعلق جامعہ کراچی کے دبستان فکر سے ہے[2]

اور اس علم کلام کے بانی و مبتدی جناب ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ہیں ،اور ان سے جو نام پھوٹے ان میں جناب پروفیسر ڈاکٹر علی محمد رضوی،جنابُ پروفیسر زاھد صدیق مغل،جناب امین اشعر ،مولانا محمد احمد ،جناب ڈاکٹر محبوب الحسن رضوی ،سید خالد جامعی اور ڈاکٹر عبدالوہاب سوری خاص الخاص ہیں ۔

خالد جامعی اگر ایک رسمی سے ناظم الشعبہ ہوتے تو کوئی انھونی بات نہ ہوتی کہانی میں نیا موڑ یہ أیا کہ جب اِن لوگوں نے پاکستانی معاشرے پر نگاہ ڈا لی تو انداذہ ہوا کہ جدیدیت ،پس جدیدیت اور سائنس نے پوری اُمت مسلمہ کے نئے عصری مذہب کا درجہ حاصل کر لیا ہے ،اس پر مستزاد مغربی علم سیاسیات کے سبب اب تمام علمی و مذہبی جواز ،عدم جواز ،حق وباطل،صحیح و غلط کا فیصلہ مغرب سے اخذ کردہ سیاسی فلسفیانہ قدروں اور ان سے اخذ کردہ نیم پختہ افکار کی روشنی میں کیا جا رہا ہے ۔

اور اسے سے کیا عامی کیا خاصی ،کیا امیر کیا غریب،کیا مسٹر اور کیا مولوی کون ہے جو اس مرعوبیت کی فضا میں تر بتر نہ ہوا ہوچناچہ ان حضرات نے اول مغربی علوم و کتب کو کنگھا لنا شروع کیا ،دن رات دنیا بھر میں سیاسیات،فلسفہ،قانون ،سائنس و ٹیکنالوجی،معاشیات اور دیگر علوم میں ہونے والی تحقیقات سے نا صرف خود واقفیت حاصل کی بلکہ ساتھ ساتھ جامعات اور مدارس کے طالبان علم کی بھی تربیت کا أغاز کیا ۔

میری کبھی ڈاکٹر جاوید صاحب سے ملاقات تو ہو نہ سکی ہے کیونکہ میں بھی جامعہ کراچی و دیگر جامعات کے طلبا کی علمی تربیت سے ہٹ کر میل ملاپ ،أنے جانے گھومنے سے پرہیز کرتا ہوں ۔

ایک ہمارے أزاد خیال جدت الفکر جامعاتی ساتھی نے میری توجہ جریدوں کی طرف اس دوران کروائی جب خاکسار جامعہ میں پی۔ایچ ۔ڈی کی تحصیل میں مگن تھا لہذٰا خالد جامعی صاحب کی تحریروں سے أشناہ ہوا اور خالد جامعی صاحب سے ملاقات،تبادلہ خیال کا سلسلہ شروع ہوا جو اب قریباً چھ ،سات سال سے جاری ہے ۔

[2] Karachi University School of thought.

اور مجھے معلوم ہوا کہ جامعی صاحب عرصے سے نہ صرف ہر ہفتہ ایک دن خاص کسی اہم کتاب پر تبصرہ کی نشست اپنے شعبہ میں رکھتے ہیں بلکہ ،توسیعی لیکچروں کا سلسلہ بھی چلتا رہتا ہے ،جن طلب علموں کی تربیت کی جاتی ہے ان سے بھی لیکچر دلوائے جاتے ہیں ۔

خالد جامعی صاحب کی لو گوں کی علمی خدمت و رہنمائی کی یہ کیفیت ہے کے وہ رات گئے تک لوگوں کی رہنمائے فر ماتے رہتے ہیں ،خاکسار ویسے تو انکا کوئی شاگرد نہیں نہ اس قسم کی نشست کا حصہ ہے مگر ان سر گرمیوں سے نہ صرف واقف ہے بکہ خود بھی متلاشیان علم کو وہاں جا نے کا مشورہ دیتا رہتا ہے۔

خالد جامعی کی مشہور فلسفی وہاب سوری صاحب ،صدر شعبہ فلسفہ ،جامعہ کراچی سے خاص علمی یاری و دوستی ہے اور اس ضمن میں خالد صاحب کا کھل کر ساتھ دیتے ہیں سوری کے آن لائن لیکچر آرام سے گوگل کرکے آن لائن ڈھونڈھے جا سکتے ہیں ۔

ایک اندازہ کے مطابق خالد جامعی کے ذاتی کتب خانے میں مختلف علوم پر ۲۰۰۰۰ کتب موجود ہیں ،انکے دفتر کی میزوں کرسیوں پر بھی جا بجا کتابیں،کتب کی فوٹو اسٹیٹیں براجمان دیکھی جاسکتی ہیں ،مطلب کاغذ اور خالد جامعی کی باہم خاص شناسائی و دوستی ہے اور یہ خاکسار کا بھی حال ہے جبھی میں ان سے اکثر علمی امر سے زیادہ تحریروں کی ہی بات کرتا ہوں کہاں ،چھپی،کب چھپی،مطبع کونسا ہے اور لکھاری یا محقق کون ہے ؟

جدیدیت پر تو خیر خاکسار نے بھی مطالعہ جاتی کافی نگاہ ڈالی ہے مگر مسلم جدیدیت کو جس زاویے فکر سے خالد جامعی نے دیکھا اور بیان کیا ،وہ انکا طرز اندازہے جو نرالا و منفرد ہے اور جو ان ہی کا ہی طرہ امتیاز ہے۔

میں ایک سیاسی سائنسدان و عالم کے طور پر رواجی پاکستانی جامعات کی علمی بوسیدگی کا شکار تھا ،اور مجھے اس کے اعتراف میں کوئی خوف و شرم نہیں کے جریدوں نے اور ان میں چھپنے والی تحریروں نے ہی خاکسارکو جان رالز ،ہیبر ماس ،فوکالٹ اور کارل پوپر سے واقف کروایا مطلب ہم جس جدیدیت کا راگ علمی بنیادوں پر آلاپ رہے تھے وہ بھی سمجھیں کارل مارکس پر آکر دم توڑ دیتا ہے ۔ پس جدیدیت اور ما بعد حریت سے تو ہمارے اکثر اساتذہ بھی واقفِ حال نظر نہیں آتے ہیں تو وہ ہمیں کیا واقف کرواتے اور نا نصاب میں یہ مباحث ذیر بحث لائے جاتے ہیں ۔

میرے علم کے مطابق پاکستان میں جامعہ کراچی کا شعبہ فلسفہ ،واحد شعبہ ہے جہاں یہ مباحث اور فلسفہ سائنس پڑھائے جا تے ہیں اور جامعہ کراچی مکتبہ فکر اس ضمن میں قابل تعریف ہے کے اس نے اُس وقت جب جامعات میں اساتذہ و طالب علموں میں ایک مخاصمانہ بعد ،دوری پائی جاتی ہے ،اساتذہ پڑھاتے کم ہیں اور دفتروں میں خواتین سے نیناں زیادہ لڑاتے ہیں ،پسند نا پسند پر طالب علموں کامیاب اور ناکام قرار دیا جاتا ،ہے انھیں عرصہ تک لٹکایا جاتا ہے ،اس دبستانِ فکر نے نہ صرف طلبہ و طالبات کو بتایا کہ

سادگی نہیں ایسی اس میں کہ تم صدقے جاو واری جاو

-اپنی تہذیب سے نا واقف پکارے جاو

ڈس لیا اس تہذیب کی نَم کو خود اجگرِ ذات نے

،نسل گھٹتی جاتی ہے اور مقلد بڑھتے جاتے ہیں۔

آج مکتبہ جامعہ کراچی نے مسٹر اور مولوی کو ساتھ بٹھا دیا اور دونوں کا اتفاق ہے ،اور دونوں باہم شیر و شکر ہوکر صرف ایک تہذیب ،ایک حکومت ایک،روایت اور ایک ہی اصول کے رائج کرنے کے لئے بے قرار ہیں اور وہ ہے دین اسلام ،کلمہ شہادت ، قران و سنت اور آثارِ سلف و صالحین کی تعلیمات سے اخذ کردہ تہزیب و تمدن،حکومت و روایت،اور اُصولی ظابطہ حیات۔

مکتبہ غامدیت ویسے تو پاکستان میں پیدا ہوا مگر اس کے پیش رو ارتقائی طور پر معتزلہ،سرسید،چکڑالوی،پرویزی ماکاتب فکر ہیں ۔مگر دین کو جتنا مختصر و محدود اس مکتبہ فکر نے کیا اور جس طرح انھوںنے مردہ ہوتی پرویزیت کو نیا جنم دیا ،اس پر مستقبل کے معتزلہ جناب جاوید غامدی صاحب کو امام قرار دینگے۔

غامدیت نے ایک طرح سے مسلمانوں کی مذہبی اقدار کے طرف رجعت کے عمل کو معاشرے میں قران و حدیث کی طرف نئی نسل کے جھکاو کو بند باندھ کر روکنے کی کوشش کی ہے اور اس عمل میں ۲۰۰۰ء سے پاکستان میں پروان چڑھتے بے لگام ذرائع ابلاغ نے اہم کردار ادا کیا ہے،اوپر سے ایک ماننے والی بات یہ ہے جناب غامدی نے جو لوگ تیار کئے ہیں وہ تزویراتی لب و لہجہ،متانت اور ھلم کے حامل نرم و ٹھنڈے لہجہ کے ذریعے عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں ۔

قران کو ماخذ تسلیم کرکے وہ ہی پرانی پرویزی مکھی کے پروں کو نئی چینی ساختہ غامدی مکھی کی پشت پر مار دیا گیا ہے ،جس کے ذریعے دینی علمیاتی نراجیت کا مظاہری کیا گیا ہے حدیث کو ماخذ دین سے درجہ تنزلی سے روشناس کراکے قران کی من چاہی ،سیاق سباق سے ہٹ کر تشریح ،توضیح و تاویل سے اپنانے کی ناکام کوشش کی گئی ہے،

روز سو کر اُٹھتے ہیں نئی سنت کی فہرست جاری کردی جاتی ہے ،اگر مسواک کرکے قلم اُٹھاتے ہیں تو سنت گھتادیتے ہیں ورنا مسواک کو قلم بنا کر بڑھا دیتے ہیں ۔

غلام احمد قادیانی،چکڑوالوی،پرویزی طاغوطیت سے پولیٹیکل سائنس اور پالیٹیکل اکانومی کے اصولٗ ضوابط نکالے جاتے ہیں .علمیاتی بنیادوں کی ایسی نراجیت سوائے ملحدوں و تشکیکیوں کے اور کہیں نہ دیکھی گئی نہ سنی گئی۔

غامدیت پر ویسے تو بہت کچھ لکھا گیا ،سنا گیا ،مولانا صلاح الدین یوسف ،مولانا رفیق چوہدری ،حافظ زبیر نے اس پر خوب لکھا ۔مگر یہ بھی ماننے کی بات ہے کہ غامدی حدیث اور اس سے اخذ کردہ فقہی دلایل کو خاص اہمیت ہی نہیں دیتےہیں جو اثر ہوتا اس میدان میں ایک نیا شہسوار پیدا ہوا جس نے نا صرف مغرب کو خوب پڑھا بلکہ وہ مسلم جدیدیت کے دلایل ،وسایل اور علمیت کا بھی واقفِ حال ہے ،ہیرے سے ہیرا ،لوہے سے لوہا کاٹنے کی مثل کو اپناتے ہوئے جگہ جگہ یہ علمی تعاقب کیا کہ اگر جدیدیت و مغربیت ہی تمہاری بنیاد ہے تو لو جناب تم نے تو مغرب کو بھی صحیح نہی سمجھا

،جانا اور پہچانا جو اس کے دم پر ایسی بڑی بڑی خود ساختہ دلیلیں قایم کی جایں اسلام کے دائرے میں رہنا توچاہیں مگر اسلام ایک ترمیم شدہ ،مغرب ذدہ خالصتاً اصطلاحاتی لبرلائزڈ اسلام ہو نا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر تنزیل شدہ اسلام ہو ۔

نا تم مغربی کلاسیکیت سے واقف اور نہ تمہیں روحِ روشن خُیالی ،حریت فکر ،نشاۃ ثانیہ کے نفس مضمون سے لینا دینا تمہارا طریقہ کار سوفسطایوں اور تھیو سوفیوں کی مانند نرم ،گرم حلم سے لبریز شریں زبانی ٹھری مگر بھایوں یہ علمی سے ذیادہ شاعروں کا خاصہ ہے اور تم اپنی حلاوت کے نیچے کیسے مذہب شکن نشتروں سے مزین بیٹھے ہو۔

خالد جامعی نے اشراق کے مضامین اور المیزان کو بار بار پڑھا اور بار بار نئے تناظر میں غامدیت کا علمی تعاقب کیا،میں نے جب خالد جامعی کی جریدہ ،الواقعہ،البرھان اور ساحل میں غامدیت پر چھپنے والی تحریروں کو جمع کیا اور انھیں مقالاتِ خالد جامعی کی اولین برقی جلدوں کی صورت میں پیش کرنے کا فیصلہ کیا اُسی کے ضمن میں یہ تیسری برقی جلد پیشِ خدمت ہے اس میں صاحب مضمون سے اختلافِ علمی کی گنجایش موجود ہے جسکے ضمن میں ان سے خط و کتابت ممکن ہے۔

یہ تیسری جلد جدیدیت سے متعلق ہے ،اسکےبعد والی جلدیں دیگر جدید مباحث پر نقد سے مزین ہونگی خالد جامعی کی دیگر تحریروں کو پسند کرنے والے حضرات کو یہ سلسلہ امکان ہے کے پسند أئے،اسکے ساتھ میں یہ بھی واضح کردوں ،خالد جامعی سے جب میں اس بابت ملنے گیا ور مقالات پر کام سے أگاہ کیا اور ان سے انکی زندگی کی بابت معلومات دریافت کرنا چاہی تو انھونے مجھے فرمایا میرا خیال ہے اسکی کوئی ضرورت نہیں ہے أپ اگر صرف مقالہ جمع کرکے پیش کرنا چاہیں تو اجازت ہے جبھی میں ان کی حیات کے پہلووں کو اتنی وضاحت و صراحت سے عیاں نہیں کرسکا جیسا اسکا حق تھا۔

ڈاکٹر محمد علی جنید

عقل و فلسفه

جدیدیت کیا ہے:اور کیانہیں ہے؟

دنیا کی ۲۳ روایتی، الہامی دینی تہذیبوں میں انسان عبد تھا۔ وہ جو اس نیلی کائنات میں خدا کے آگے سر بسجود ایک ہستی تھا جو اپنی آخرت کی اصلاح کے لیے فکر مند اور مستقبل کی حقیقی زندگی کے لیے کوشاں رہتا تھا۔ لیکن اٹھارہویں صدی میں جدیدیت کی آمد کے بعد یہ عبد جو بندگی کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا یکایک آزاد ہوگیا بندے[1] سے آزاد فرد[2] ہوگیا یہ اصطلاح بھی صرف اس کے حیاتیاتی وجود کی علامت تھی لہٰذا اس کے سیاسی وجود کی وضاحت کے لیے شہری[3] کی اصطلاح استعمال کی گئی جو خود مختار مطلق[4] ہوتا ہے۔

اسی آزاد خود مختار وجود کے لیے ایک ایسی ریاست قائم کی گئی جو ری پبلک[5] کہلائی۔ ایسی ریاست جہاں عوام کا حکم ارادہ عامہ[6] کے تحت چلتا ہے۔ اس کے سوا کسی کا حکم چل نہیں سکتا۔ اگر کسی ریاست میں کسی اور کا حکم بہ ظاہر چل رہا ہے تو اس حکم کے چلنے کی اجازت بھی عوام کی اجازت سے ملی ہے اور یہ اجازت مطلق نہیں ہے حاکم حقیقی عوام اس اجازت کو جب چاہیں منسوخ کرسکتے ہیں مثلاً پاکستان کے دستور آئین میں اللہ کی حاکمیت کو سب سے بالاترحاکمیت کے طور پر قبول کیا گیا ہے۔

اصولاً منشور بنیادی حقوق کے تحت ایسی حاکمیت کو قبول نہیں کیا جاسکتا ہےلیکن پاکستانی معاشرہ ابھی جدید نہیں ہوسکا ہے بلکہ ابھی روایات اور مذہب کے شکنجوں میں جکڑا ہوا ہے لہٰذا مجبوراً مذہب کو بھی عوام کی اجازت سے دستور میں عارضی طور پر حاکمیت دی گئی ہے مگر یہ حاکمیت حتمی نہیں عوام جب چاہیں کثرت رائے سے حاکمیت الہ کی اس شق کو منسوخ کرسکتے ہیں۔ 2009ء میں یہ حادثہ ہوچکا ہے جب ایم کیو ایم نے قومی اسمبلی کی ایک کمیٹی کے اجلاس میں دستور سے خدا کی حاکمیت کی شرط ختم کرنے کے لیے قرار داد پیش کی تھی قرارداد کی مخالفت پاکستان پیپلز پارٹی نے کی۔ رائے شماری ہوئی تو خدا کی حاکمیت دو ووٹوں کی برتری سے برقرار رہی۔

---

[1] **Mankind۔**
[2] **Human being۔**
[3] **Citizen۔**
[4] **Sovereign۔**
[5] **Re-public۔**
[6] **General will۔**

ایک پاکستانی اخبار نے سرخی لگائی ۔''خد ا کی حاکمیت دو ووٹوں کی اکثریت سے بچ گئی'' جدید انسان **قائم بالذات، فاعل مختار مطلق،** ہدایت میں **خود کفیل،** خارجی ذریعۂ ہدایت سے بے نیاز اور ماوراء اپنے فیصلے خود کرنے کا حقیقی مجاز، ہر خارجی بیرونی ذریعۂ علم کی حاکمیت و رہنمائی سے ماورا، خیر و شر خلق کرنے کا اختیار رکھنے والی ہستی ہے، ہر ایک کی عبادت سے بے نیاز اپنے معبد میں خوداپنی عبادت میں مصروف لا فانی، نورانی، حیوانی وجود ہے۔ لہٰذا جدیدیت میں صرف انسان ہی اصل حقیقت اصل وجود ہوتا ہے کیونکہ اس کے وجود میں شک نہیں کیا جاسکتا ہے لہذا وہی مرکز کائنات ہوتا ہے کیونکہ یہاں خدا مرکز کائنات نہیں ہوتا ہے بلکہ یہ کائنات بھی انسان کے لیے ہے[7]۔

<u>ٹائن بی کے الفاظ میں حقیقت کے ادراک کے دوطریقے ہیں</u>:

۱۔ ایک سائنسی[8] .

دوسرا شاعرانہ یا پیغمبرانہ[9]

پہلے طریقے سے علم مشاہدے و تجربے سے ملتا ہے دوسرے طریقے سے ملنے والا علم محض شاعرانہ حقیقت ہے۔ ٹائن بی کے خیال میں لاشعور کی شاعرانہ سطح پر قابل فہم مشاہدہ کا نام ہی پیغمبری ہے۔ جدید انسان صرف وہ ہے جو حسی، تجربی، اختیاری سائنسی ذریعۂ علم پر یقین رکھتا ہے ،اور غیر حسی، غیر تجربی، غیر طبعی، ما بعد الطبیعیاتی، الہامی مذہبی ذرائع سے ملنے والے علم کو جہل، ظلمت و گمراہی تصور کرتا ہے کیونکہ ان ذرائع سے ملنے والے علم کی تصدیق تجربہ گاہ میں آلات سائنس سے نہیں ہوسکتی ہے۔

لہٰذا یہ تمام علوم جہالت میں شمار ہوتے ہیں جدید انسان وہ ہے جو ان جہالتوں سے ماوراء ہے اور خیر و شر کے پیمانے خود خلق کرتا ہے کسی الہامی روایتی دینی علم سے پیمانے اخذ نہیں کرتا اس لیے جدیدیت تاریخ کا انکار کرتی ہے سترہویں صدی سے پہلے کے زمانے کو تاریخ کا تاریک ترین زمانہ[10] قرار دیتی ہے جدیدیت ماضی کا انکار کرنے کے باوجود ماضی سے کلاسیک کے نام پروہ

---

[7] **جامعی صاحب کا اشارہ یہاں مغربی فکر کی طرف ہے۔معج**

[8] **Scientific trust.**

[9] **Poetic truth.**

[10] **Dark ages-**

تمام تصورات نظریات عقائد قبول کرتی ہے جو اس کی ابلیسیت سے ہم آہنگ ہیں۔ مثلاً وہ یونان سے ارسطو کا نظریۂ ابدیت دنیا لے کر آخرت کا انکار کرتی ہے۔ سترہویں صدی سے پہلے کے انسان کو انسان تسلیم نہیں کرتی ہے،جدیدیت کے خیال میں اصل انسان تو روشن خیالی کے فلسفے کے بعد ظہور پذیر ہوا ہے۔ جدید انسان ہی حقیقی معنوں میں صاحب علم ہستی ہے جو روشنی سے منور ہے کیونکہ اس نے جہالت کی تاریخ کا انکار کرکے مذاہب سے بغاوت کرکے اپنے لیے زندگی کا راستہ اپنی ہی روشنی اپنی ہی رہبری و رہنمائی میں خود طے کرنے کا فیصلہ کیا ۔نشاۃ ثانیہ، روشن خیالی، جدیدیت انسان کی اسی خود کفالت، فارغ البالی، خود انحصاری، خود مختاری اور آزادی کامل کا نام ہے جدید انسان کو زندگی کا سفر طے کرنے کے لیے اپنے سواکسی اور ذریعہ سے رجوع کرنے کی کوئی ضرورت نہیں جدیدیت، جدید انسان کا یہ دعویٰ کہ عقلیت آفاقی ہوتی ہے اور عقلیت کی بنیاد پر آفاقی اقدار آفاقی نظام آفاقی اخلاقیات وضع کی جاسکتی ہے پس جدیدیت [11]نے رد کردیا اس نے بتایا کہ عقل اپنی تاریخ تہذیب ثقافت میں محصور و مقید مسدود محدود ہوتی ہے مغرب میں اب اس رائے پر عمومی اتفاق ہے اس موقف کی تفصیلات کا مطالعہ کرنے کے لیے درج ذیل کتابوں کو دیکھیے:

1	Habermass	Towards the understanding of Rationality.
2	Mclntyre J. Gray	Reading in the philosophy of social science.
3	Focault.-M	Madness and civilization
4	J. Gray	False Dawn
5	J.Gray	Enlightenment wake
6	R. Rorty	contingency, Irony and Solidarity
7	R. Rorty	Heidegger and Progress

[11] **Postmodernism.**

8	R. Rorty	Relativity objectivity philosophical papers vol[12] II

جدیدیت مغربیت، جدید انسان، جدید فلسفے، جدید تعقل غالب کو سمجھنے کے لیے افلاطون و ارسطو، ڈیکارٹ، ہیوم، کانٹ کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔

ہیوم اور کانٹ نے جدیدیت کے فکری اور عملی تسلط میں مرکزی کردار ادا کیا ہے کانٹ کا کمال یہ ہے کہ اس نے عقلیت اور تجربیت کو ملا کر جدید سائنسی انقلاب کی فکری اساس کو ممکن بنایا اور سائنسی طبعی تجربی علمیت کو ہی اصل العلوم قرار دے کر ان تمام علوم کو دائرے سے خارج کردیا جو عقلیت اور تجربیت کے مادی حسی طبعی معیارات پر پورا نہیں اترتے اس طرح جدیدیت نے تمام ما بعد الطبیعیاتی سوالات کا انکار کردیا اور ایک نئی ما بعد الطبیعیات جنم دی جو علمیت[13] سے ما بعد الطبیعیات[14] نکالتی ہے، لہٰذا ڈیکارٹ، ہیوم اور کانٹ کی علمیت سے جو ما بعد الطبیعیات نکلی وہ ہائیڈیگر کے الفاظ میں حاضر و موجود کی مابعد الطبیعیات[15] تھی۔

جدیدیت کو سمجھنے کے لیے جدید تصور نفس، جدید شخصیت، جدید معاشرت، جدید ریاست، جدید ما بعد الطبیعیات کے نظریات سے واقفیت ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جدیدیت اور جدید انسان کی پیدائش کا تاریخی پس منظر جاننا بھی ضروری ہے وہ کون سے تاریخی عوامل و اسباب تھے جنہوں نے جدیدیت اور آزادی کے عقائد کو ابھرنے پنپنے کا موقع دیا۔ روایتی معاشرہ کمرشل معاشرے میں کیسے تبدیل ہوا کا مرس اور لبرٹی کے تصورات نے روایتی زندگی پر کیا اثرات ڈالے۔ جمہوریت، سرمایہ داری، بنیادی حقوق کے قافلے کس طرح وجود میں آئے۔ جدیدیت سے پہلے مغرب عیسائیت کی آغوش میں تھا لہٰذا جدیدیت کے ظہور، فروغ اور ارتقاء کو سمجھنے کے لیے، عیسائیت کی تاریخ کا مطالعہ بھی نہایت ضروری ہے۔ عیسائیت میں مذہب اور ریاست کی تفریق تھی کیونکہ عیسائیت کے پاس شریعت نہیں تھی لہٰذا عیسائی رومن ایمپائر نے ریاست کے لیے قوانین رومی قوانین سے لیے رومۃ الکبریٰ دو حصوں میں تقسیم تھی:

---

[12] **ان مباحث کے مذید حوالوں اور تحقیق کے لئے کرف کی شایع کردہ کتب تحریر از:ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری،ڈاکٹر عبدالوہاب سوری اور ڈاکٹر علی محمد رضوی کی ناگریزی کتب کا مطالعہ کریں۔معج**

[13] **Epistemology**

[14] **Metaphysics**

[15] **Metaphysic of Presence**

۱۔ شہر خدا[16]:

۲۔شہر انسان[17]: ۔

ایک جگہ خدا کا یعنی انجیل کا کلیسا کا اور پوپ کا حکم چلتا تھا دوسری جگہ ریاست جہاں بادشاہ کا رومی قانون چلتا تھا۔ پوپ زمین پر خدا کا نمائندہ تھا لہٰذا اس کی رائے مذہبی معاملات میں قطعی حتمی رائے تھی اس رائے سے کسی کو اختلاف کی اجازت نہ تھی لہٰذا عیسائیت میں کسی مذہبی مکتب فکر کو پنپنے کی اجازت نہیں دی گئی جس مکتب فکر نے پوپ کی رائے سے اختلاف کیا اسے صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ کلیسا نے رومی ریاست کے انتظامی ڈھانچے کی اتباع میں اپنے مذہبی ڈھانچے کو رومی بیوروکریٹک اسٹرکچر میں تبدیل کردیا پادریوں کے مناصب مرتبے قائم کردیے گئے ان مناصب سے گزر کر ہی سب سے اونچے منصب پوپ تک کوئی پہنچ سکتا تھا لہٰذا پادریوں میں دائمی مسابقت پیدا ہوگئی[18]۔

گیارہویں صدی میں پوپ گریگوری[19] کو جب اپنے اقتدار کی گرفت کمزور محسوس ہوئی اور اسے اندازہ ہوا کہ فرانس، جرمنی، برطانیہ کی بادشاہتیں آزاد ہونے کی کوشش کررہی ہیں تو اس نے ان ریاستوں کی بغاوت کو کچلنے کے بجائے بغاوت کا رخ مسلمانوں کی طرف موڑ کر عالمی صلیبی جنگوں کا آغاز کرادیا اس نے تمام عیسائی بادشاہتوں کے سامنے امت مسلمہ کا نام نہاد خطرہ دکھا کر ان سب کو عظیم مذہبی جنگ پر آمادہ کیا ان جنگوں کے لیے سرمایہ بادشاہوں نے کلیسا سے سود پر حاصل کیا جس نے کلیسا کے تقدس کو نقصان پہنچایا یہ مذہبی جنگ پانچ سوسال تک جاری رہی جس میں تمام یوروپی بادشاہوں کے کئی سو بیٹے بھانجے بھتیجے عیسائی مذہبی ریاست کے غلبہ کی راہ میں مارے گئے اس طرح پوپ نے پانچ سو سال تک عالمگیر جنگ برپا کراکے کلیسا کے خلاف بغاوت کا رخ عالم اسلام کے خلاف موڑ دیا **<u>جوناتھن لیانس</u>**[20] کی کتاب[21] کے باب سوم کا مطالعہ پوپ کے بارے میں صلیبی جنگوں کے حوالے سے چونکانے والے انکشافات کرتا ہے۔

---

[16] City of God۔
[17] City of man۔
[18] **پوپ کے انتخاب کے لئے اعلی ترین اسقف جن سازشوں،ہتھکنڈوں،رشوت ستانی،دجل وخبث کا شکار تھے،اسکے لئے ڈریپر،ڈیوارانٹ کی کتب سریزر بورجیا کی داستان حیات اور ڈرامہ سیریز سیزر بورجیا دیکھیں۔معج**
[19] Pope Gregory VII۔
[20] Jonathan Lyons۔
[21] Islam through western Eyes۔

<u>THE WESTERN IDEA OF ISLAM</u>:

In a separate appeal dated March 1, 1074, to “all who are willing to defend the Christian faith;’ the pope reports that a visitor from “the lands beyond the seas” had informed him that “a race of pagans has strongly prevailed against the (Eastern(Christian empire and with pitiable cruelty has already almost up to the walls of the city of Constantinople laid waste and with tyrannical violence seized everything; it has slaughtered like cattle many thousand Christians”[22]

This statement was almost surely a belated reference to the decisive defeat of the Byzantines at Manzikert two and a half years earlier at the hands of the Muslim Seljuq Turks. A further sense of the pope’s military ambitions may be seen in a letter to Henry IV of Germany three months later.

Gregory here announces that he has already succeeded in rousing “Christians everywhere. that they should seek by defending the law to lay down their life for their brothers.” He says that fifty thousand “men from Italy and from beyond the Alps” are ready to march at his command, and he asks Henry to safeguard the church during his planned absence According to traditional historical accounts, Pope Gregory’s general commitment to the idea of holy war, his zeal in expanding papal prerogatives by force if necessary, his emphasis on indulgence for Christian holy warriors, his desire to extend Rome’s influence eastward, and his denunciations of pagans and Saracens alike cast him in the role of father of the anti-Muslim Crusades launched two decades later by Pope Urban II (r. 1088-1099), his former aide and protege. The literature on the origins of the Crusades is, of course, extensive. Writing in the eighteenth century, Edward Gibbon (1910:6, 35)

---

[22] **2002:55-**

sees Gregory as animating the entire enterprise against the Muslims. Steven Runciman's classic History of the Crusades praises the pope's "imaginative statesmanship" in laying out the new policy of holy warfare (1951-1954, 1:99). Recent studies take a somewhat more measured and nuanced view

(Riley-Smith 1986),(Asbridge 2004; Tyerman 2006)

Gregory VII, then, becomes a significant link in a logical-and chronological-chain of events culminating in Urban's call to the anti-Muslim Crusade. in November 1095 in the French town of Clermont. Thus Jonathan Riley Smith opens The First Crusade and the Idea of Crusading with the following summary of Western historical consensus: "There is general agreement that the (First(Crusade was the climacteric of a movement in which the eleventh century Church reformers, locked in conflict with ecclesiastical and secular opponents, turned to the knights of the Christian West for assistance. Pope Urban's message to the faithful at Clermont is believed to have been the synthesis of ideas and practices already in existence

"holy war, pilgrimage, the indulgence" (1986:1)

On the level of archaeological analysis, however, things look quite different, especially if, following Michel Foucault, we suspend the overriding search for historical unities. First of all, we can see from his official correspondence that Gregory VII is clearly casting the Saracens as a threat to individual Christians-even "many thousand Christians" -but never as an existential danger to Christendom as whole. Second, he is often confused about the nature of the enemy and assigns the adversary, whether described as "pagan" or "Saracen," no particular ideological content beyond a general hostility to Christian interests. For example, he accuses the "pagans" who now rule most of Spain of "ignorance of God" (1990:6-7(,

clearly not recognizing their direct religious and ethnic affinities with the Muslim .Arabs and Berbers of North Africa, home to his interlocutor Anazir

More confusion arises when we see how Gregory elsewhere distinguishes Saracens and pagans as he bemoans the levels to which the church has sunk of late: "Its ancient colors are changed, and it has become the laughingstock, not only of the Devil, but of Jews, Saracens, and pagans" (1990:195). He is also more than prepared to paint rivals closer to home-the Normans, the Lombards, or even the troublesome citizens of his adopted Rome-as far greater concerns than any pagan or Saracen and to blame Europe's secular rulers for fostering a culture of violence, instability, and war for profit: But now everyone, as if smitten with some horrible pestilence, is committing every kind of abominable crimes without any impelling cause. They regard neither divine nor human law; they make nothing of perjury, sacrilege, incest or mutual betrayal. Fellow citizens, relatives, even . brothers, capture one another for the sake of plunder, extort all the property of their victims and leave them to end their lives in misery, a thing unknown anywhere else on earth. Pilgrims going to or returning from the shrines of the Apostles are captured, thrust into prison, tortured worse than by any pagan and often held for a ransom greater than all they have.[23]

عیسائی دنیا پر پوپ کے ظلم و تشدد [24]، جادو گری کے الزام میں ہزاروں عورتوں کے قتل عام وغیرہ کے نتیجے میں جرمنی میں پروٹسٹنٹ ازم کا ظہور ہوا کیلون ازم اور پیورٹن ازم برطانیہ اور سوئٹزر لینڈ میں کیتھولک کلیسا کی حاکمیت کے خلاف بغاوت کے مظاہر تھے اس کے نتیجے میں پورے یورپ میں عیسائی مذہبی فرقوں کے درمیان سالہا سال تک خوفناک مذہبی جنگیں ہوئیں اسی عہد میں

[23] **Jonathan Lyons. Islam Through Western Eyes: From the Crusades to the war on Terrorism: Chapter 3: page :46 , 47. 2012. Columbia Press. USA. New York.**
[24] **Inquisition.**

قوم پرست ریاستوں کا ظہور ہوا اور قومی چرچ بھی وجود میں آنے لگے کلیسا کی عالمی حیثیت مجروح ہوئی مذہبی بنیاد پر ریاستوں کے خاتمے کا معاہدہ آگیا مذہبی جنگیں بند ہوگئیں۔

سولہویں صدی میں یورپی عیسائی حکومتوں نے پوری دنیا پر یلغار کی اور دنیا کے بہت بڑے حصہ کو غلام بنالیا۔ کولونیل ازم کے ذریعے یوروپ میں سونے کے دریا بہنے لگے، مال و دولت کا سیلاب آگیا اسی سیلاب نے جدید سائنس و ٹیکنالوجی کے لیے وسائل کا انبار مہیا کردیا اور ایجادات کے فکری و نظری انقلاب کو عملی انقلاب میں تبدیل کردیا۔ عیسائی یوروپی جب دنیا بھر کو تاخت و تاراج کررہے تھے تو کلیسا نے انہیں کوئی سرزنش نہیں کی کلیسا کی جانب سے لوٹ مار کی اس حرام دولت پر کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہیں کیا گیا یوروپ کے تقریباً ہر گھر نے لوٹ مارکی اس دولت سے استفادہ کیا۔

سرمایہ دارانہ شخصیت، معاشرت، حکومت، ریاست کی تعمیر میں لوٹ مار کی اس دولت نے کلیدی کردار ادا کیا۔ جب وہ شخصیت، انفرادیت، معاشرت، ریاست، حکومت وجود میں آگئی جس کا اصل سبب پوپ اور چرچ کی غفلت تھا تو لبرل انقلاب نے عیسائی مذہبی حاکمیت کے خلاف زبردست بغاوت کردی دنیا دار دین کی پابندیاں کیسے برداشت کرسکتا ہے جب کلیسا نے لوگوں کے دنیا دار بننے پر کسی رد عمل، افسوس، دکھ کا اظہار نہیں کیا تو اس نے لوگوں کی گناہ گار زندگی کو عملاً سند جواز مہیا کردی....... انہیں لبرل آزاد خیال...... اخلاقیات سے بے پروا بنانے میں کلیسا نے مجرمانہ کردار ادا کیا اگر ہیبر ماس کے الفاظ مستعار لیے جائیں تو گرجا کی خاموشی مجرمانہ خاموشی[25] تھی۔

امریکہ و یوروپ کے لوگ روحانی طور پر دیوالیہ ہوچکے تھے کالونیل ازم کے ذریعے ان کے ضمیر سیاہ، غیرت، مذہب اخلاق سے محروم ہوگئے تھے جبر و تشدد اور دوسری قوموں پر بہیمانہ مظالم نے ان کی عیسوی مذہبی شناخت انفرادیت، مذہبیت، کو پارہ پارہ کردیا تھا مگر تاریخی روایتی طور پر وہ عیسائی ہی تھے لیکن ان کا طرزِ فکر، طرزِ حیات بدل چکا تھا اور کیتھولک عیسائی اخلاقیات کے ساتھ ہم آہنگ نہیں تھا لہٰذا اس خلاء کو جدید فلسفے نے پُر کردیا اور گناہ گار، خبیث زندگی کا، اخلاقی، علمی، منطقی، فلسفیانہ، عقلی جواز "آزادی" کے فلسفے کے ذریعے دیا گیا اس بدلے ہوئے انسان کی نفس پرستی کا مذہبی جواز پروٹسٹنٹ ازم نے دیا اور اس جدید مادہ پرست مذہب کی روشنی سے استفادہ کرتے ہوئے اسکاٹش انلائٹنمنٹ نے ارتکاز سرمایہ اور سرمایہ میں مسلسل اضافے کا فلسفیانہ جواز مہیا کیا تاکہ آزادی و لذت میں اضافہ کیا جاسکے۔ حالات ساز گار تھے موسم اچھا تھا لہٰذا آزادی، بے

[25] **Criminal Silence.**

راہ روی، عقلیت پرستی، لذت پرستی، شہوت اندوزی نے مغرب کے تمام علاقوں میں جڑ پکڑ لی یہی جدیدیت کا تاریخی ارتقاء ہے جدیدیت کے وجود اس کے ارتقاء اور اس کے اظہار کے پس منظر کو جانے بغیر ہم جدیدیت کی حقیقت سے آگاہ نہیں ہوسکتے۔

جدیدیت کے دو بڑے اور اہم ترین مظاہر کانٹ اور اسکاٹش انلائٹنمنٹ ہیں جدیدیت کی فکر کو کانٹ کے بغیر سمجھا نہیں جاسکتا ہےان دونوں مظاہر پر اصل غلبہ پروٹسٹنٹ ازم کا ہے کانٹ پروٹسٹنٹ عیسائی تھا اور اسکاٹش انلائٹنمنٹ بھی پروٹسٹنٹ ازم کے زیر اثر تھی جس کے ذریعے جدید معاشیات کا ظہور ہوا۔ اسکاٹش انلائٹنمنٹ کے ذریعے سادگی، فقر، درویشی، دنیا سے گریز اور کم سے کم تمتع کی تاریخی روحانی صفات کو قابل ملامت بنادیا گیا بہترین آدمی وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ دولت رکھتا ہے لہٰذا جینٹل مین[26] اسکاٹش انلائٹنمنٹ میں اس شخص کو قرار دیا گیا جو دولت مند ہو یہ سبق پروٹسٹنٹ ازم نے دیا تھا کہ جو دنیا میں کامیاب ہے وہی آخرت میں بھی کامیاب ہوگا جو یہاں ناکام ہے اس کا آخرت میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے ۔

لہٰذا جدید معیشت نے انسان کا جو تصور پیش کیا وہ خالص مادہ پرستانہ ہے جس کا مقصد اپنے ذرائع آمدنی میں اضافہ ہے تا کہ اس سے وہ زیادہ سے زیادہ خواہشات پوری کرکے اپنی آزادی میں اضافہ کرسکے زندگی کے ہر شجر سے خوشی کے خوشے چن سکے اس کا مقصد لذت، معیار زندگی، میں مسلسل اور مستقل اضافہ ہے۔ اسی لیے جدیدیت میں سرمایہ اور آزادی لازم و ملزوم ہیں سرمایہ آزادی کے براہ راست متناسب ہے سرمایہ جتنا بڑھتا ہے آزادی کا دائرہ اتنا ہی وسیع ہوتا ہے آزادی کے دائرے کی وسعت لامحدود ہے کیتھولک ازم فقر وفاقہ، درویشی، رہبانیت، سادگی اور سیدھی سادی زندگی کو حضرت عیسیٰ اور دیگر انبیاء کی اتباع میں قابل فخر طرز زندگی کے طور پر پیش کرتا ہے لیکن کالونیل ازم کے بعد جب یوروپی لوگوں کا طرز زندگی، معاشرت، انفرادیت تبدیل ہوئی تو ان کی گناہگار زندگی کیتھولک ازم کے بجائے پروٹسٹنٹ ازم سے ہم آہنگ ہوگئی لہٰذا لوگ یا تو دہریے، ملحد مذاہب سے آزاد ہوگئے یا کیتھولک ازم سے نکل کر لوتھر کی عیسائیت میں داخل ہوگے جہاں ہر شخص کو انجیل کی تشریح کا اختیار تھا کیتھولک کلیسا کی غفلت، لا پرواہی اور کالونائزیشن کے خلاف دانستہ خاموشی نے آزادی، ترقی اور معیار زندگی میں مسلسل و مستقل اضافے کی اقدار کو یورپ کے عیسائیوں کے لیے ایک فطری طرز زندگی بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

---

[26] **Gentle man۔**

جدیدیت کے اہم مفکرین ڈیکارٹ، اسپینوزا، لائبنز، لاک، برکلے، ہیوم، ہیگل مارکس، نشچے، روسو، والٹیر، ٹاکو ویلی، ہابس، کانٹ وغیرہ ہیں کانٹ نے ہیوم سے اثر پذیر ہو کر تجربیت و عقلیت کے آمیزے سے وہ فلسفہ علم پیش کیا جس کے نتیجے میں سائنٹفک میتھڈ کے معیار پر نہ اترنے والے علوم علم کی اقلیم سے خارج کردیے گئے اس نے ما بعد الطبیعیات کا انکار نہیں کیا صرف یہ کہا کہ ہمارے پاس وہ ذرائع اسباب وسائل ہی نہیں ہیں جن سے ہم ماوراء طبیعیاتی امور تک رسائی حاصل کرسکیں۔ جدیدیت کو سمجھنے کے لیے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فائدہ مند رہے گا:

1	Adarno	The dialectics of Enlightenment
2	Marcuse	One dimensional man
3	Kant	what is enlightenment[27]
4	Focault	What is enlightenment?
5	Danial bell	Cultural Contradictions of Capitalism.
6	Hana Aren	The betrayal of Tradition.

اٹھارہویں صدی سے پہلے کی دنیا قدیم تھی جو اٹھارہویں صدی کے بعد ایک دم جدید ہوگئی اس جدید دنیا کے بنیادی اعتقادات، نظریات اور ایمانیات کیا تھیں انکا مختصر جایزہ لیتے ہیں۔

---

[27] **Article.**

جدید انسان اٹھارہویں صدی سے قبل اور اٹھارہویں صدی کے بعد:

1۔ ہر تہذیب کا انسان کسی نہ کسی بالاتر و برتر اعلیٰ ہستی کی پرستش کرتا تھا۔ اب انسان خود اپنی پرستش کرنے لگا۔

2۔ علم باہر سے، خارجی ذریعے سے، روایت سے، وحی سے یا آسمان سے آتا تھا۔ بعد ازاں علم خود انسان سے عقل سے میسر آنے لگا۔

3۔ انسان علم کے لیے خارج کا محتاج تھا۔ اب سے انسان علم کے لیے کسی خارج کا نہیں صرف داخل کا، عقلیت کا محتاج ہے۔

4۔ کائنات خدا کا مرکز تھی۔ اب کائنات انسان کا مرکز ہوگئی۔

5۔ اصل علم حقیقت الحقائق کا علم تھا۔ مگر نئے علم کی رو سے اصل علم سرمایے میں اضافے کا علم قرار پایا۔

6۔ شروع شروع میں ما بعد الطبیعیات پہلے تھی جبکہ علمیت مابعد الطبیعیات سے نکلتی تھی۔ اسکا معکوس یہ ہوا کہ اب علمیت پہلے آگئی چناچہ سوال کھڑے کئے گئے کہ ہمارے ذرائع علم کیا ہیں؟اور ہم ان سے کیا جان سکتے ہیں؟ کیا نہیں جان سکتے ہیں ؟ اس علمیت سے ما بعد الطبیعیات نکالی گئی لہٰذا ما بعد الطبیعیات کا علم علمیت کے دائرے سے باہر ہوگیا اور جہالت شمار کیا گیا۔

7۔ اول انسان روشنی رہنمائی کے لیے خارج، آسمان، وحی، نبی، بڑے آدمی کی طرف دیکھتا تھاکیونکہ ہر آدمی علم میں خود کفیل نہ تھا۔ مگر اب انسان اپنی رہنمائی کے لیے صرف اپنی طرف دیکھنے کا پابند ہوا تمام خارجی ذرائع علم لا یعنی ٹھہرے انسان پیغمبر باطن کے ذریعے ذاتی علم میں خود کفیل ہوگیا۔ ریاست کا علم فلاسفہ سے لینے لگا۔

8۔ پہلے ما بعد الطبعیات کا علم اہم ترین تھا۔ جدید دور میں اب طبیعیات کا علم اہم ترین ہوگیا۔ لہٰذا Metaphysics of Presence وجود میں آئی۔

9- دور قدیم میں دنیا غیر اہم اور آخرت سب سے اہم تھی۔ دنیا کو انسان آخرت کی کھڑکی سے دیکھتا تھا۔ معکوس یہ ہوا کہ اب صرف دنیا اہم ترین ہوگئی اور آخرت خارج ہوگئی خدا ختم کردیا گیا مذاہب کو جہالت قرار دیا گیا۔

10- علم اور زندگی کا مقصد آخرت میں کامیابی تھا۔ اب علم اور زندگی کا مقصد صرف اور صرف دنیا میں کامیابی رہ گیا۔

11- انسان خدا کی عبادت کرتا تھا۔ اس کے لیے عبادت گاہ جاتا تھا۔ اب انسان خود اپنی عبادت کرنے لگااور کسی عبادت گاہ میں جانے کی ضرورت نہ رہی۔

12- انسان علوم نقلیہ کو اہم علوم عقلیہ کوغیر اہم سمجھتا تھا علوم عقلیہ یعنی مال کمانے کے علم کو علوم کی تلچھٹ سمجھا جاتا تھا۔ مال جمع کرنا زیادہ سے زیادہ تمتع فی الارض کرنا غیر اخلاقی کام تھے ہر تہذیب کے بڑے لوگ انبیائ، فلاسفہ ،علماء سادہ فقیرانہ زندگی بسر کرتے تھے فقر پر فخر کرتے تھے۔ جدید نتیجہ یہ تھا کہ صرف علوم عقلیہ اہم قرار پائے سب سے اہم علم وہ جس سے سب سے زیادہ مال کمایا جاسکے مذہب، علوم نقلیہ علوم کی تلچھٹ میں بھی شمار نہیں کیے گئے انھیں علم کے دائرے سے باہر نکال دیا گیا۔ اعلیٰ معیاری عالیشان زندگی گزارنا اصل مقصد ہوگیا۔

13- علم کی بنیاد یقین تھی۔ بعد ازاں علم کی بنیاد ڈیکارٹ کے بعد شک پر رکھی گئی ایسا طریقہ علم جو شک سے یقین تک پہنچائے لہٰذا ڈیکارٹ کے بعد تمام فلسفی ریب و شک میں ہی گرفتار رہے۔

14- ما بعد الطبیعیات پانچ بنیادی سوالات سے بحث کرتی تھی۔ میں کون ہوں؟، کہاں سے آیا ہوں؟، کہاں جاؤں گا؟، مجھے کس نے پیدا کیا؟، میرا انجام کیا ہے؟ مگر اب ما بعد الطبیعیاتی سوالات کی جگہ حاضر و موجود دنیا کی ما بعد الطبیعیات[28] وجود میں آگئی۔

15- اول حفظ مراتب کی تہذیب موجود تھی اور مراتبِ وجود متعین تھے مغربی مساوات موجود نہ تھی۔ اب فرد آزاد ہوگیا سب افراد مساوی ہوگئے۔ کسی کے لیے تکریم باقی نہ رہی۔

16- ترقی معیار زندگی میں اضافہ قابل قدر کام نہیں تھے۔ اب ترقی اور معیار زندگی میں اضافہ ہی اصل قابل قدر کام قرار پائے۔

---

[28] **Metaphysic of Presence-**

17- نفس انسانی روحانی[29] ہوا کرتا تھا تھا۔ اب نفس انسانی میں Soul کی جگہ اسپرٹ، مائنڈ، شعور، ذہن، سائیکی نے لے لی۔

18- علمی تناظر بتاتا تھا کہ :حقیقت کا ڈھانچہ موجود ہے ہمارا ذہن اگر اسے اسی طرح پہچان لے جیسا کہ حقیقت ہے تو ہم حقیقت کو پہچان لیں گے حقیقت موجود ہے انسان خالق حقیقت نہیں ہے اور نہ حقیقت خلق ہوسکتی ہے۔ مگر ہوا کیا کانٹ نے بتایا کہ حقیقت کا کوئی ڈھانچہ کائنات میں موجود نہیں ہے اصل حقیقت تو میرا ذہن ہے جو حقیقت کو ڈھانچے مہیا کرتا ہے۔ انسان حقیقت کا حامل ہی نہیں حقیقت کا خالق و عالم بھی ہے میں جو خلق کرتا ہوں وہی حقیقت ہے میں دنیا کو ویسا بنادوں گا جیسا بنانا چاہوں گا۔

19- دنیا عارضی تھی۔ اب دنیا ابدی[30] ہوگئی۔

20- لوگ خدا کی پرستش اور آخرت کی جستجو کرتے تھے۔ / لوگ اپنی پرستش اور سرمایہ و دنیا کی جستجو کرنے لگے۔

21- انسان تسخیر قلوب کرتا تھا۔ مگر اب انسان تسخیر کائنات میں مصروف ہوگیا۔

22- خیر و شر کے پیمانے متعین تھے۔ اب خیر و شر ذہن انسانی عقلیت سے دریافت کرسکتا ہے ہر زمانے کے خیر و شر مختلف ہوسکتے ہیں۔

23- خدا کو تسلیم کرنے کے باعث لوگ ثواب اور عذاب کے قائل تھے گناہ کا وجود تھا اور ہر گناہ خلش ہوسکتا تھا۔ جب خدا کو خارج کردیا گیا تو گناہ و ثواب بھی بے معنی ہوگئے گناہ [31]کی جگہ خلش[32] نے لے لی۔ واضح رہے کہ ہر خلش گناہ نہیں ہوتی ہے۔

24- گناہ گار لوگ نیک لوگوں سے رجوع کرتے تھے اور اعتراف گناہ کرتے تھے عبادت گاہ مثلاً کلیسا جاتے تھے وہاں عالم موجود ہوتا تھا۔ پھر خلش میں مبتلا لوگ کلیسا کے بجائے نفسیاتی ماہرین اور ان کے کلینک سے رجوع کرنے لگے دین کے عالم کی جگہ یہاں سائیکو تھراپسٹ آگیا۔

---

[29] **Soul-**
[30] **Eternal-**
[31] **Sin-**
[32] **Guilt-**

25۔ عورت حیا دار تھی عفت و عصمت اس کا زیور تھا۔ اب حیاء کی جگہ شرم[33] اور خلش نے لے لی۔ حیاء[34] تہذیب سے خارج ہوگئی۔

26۔ آزادی معیار، منہاج اور قدر نہیں صرف صلاحیت تھی۔ اب آزادی معیار، منہاج، قدر، اصول، عقیدہ اور ایمان بن گیا۔

27۔ انسان اقدار و روایات، اساطیر، الہام، وحی، مذہب، اتھارٹی کا پابند تھا۔ / انسان پبلک لائف میں صرف ارادہ عامہ [35] کا تابع ہوگیا اور ذاتی زندگی کے دائرے میں مطلق آزاد خود مختار ہوگیا۔

28۔ بندگی قدر تھی لوگ عبد تھے کسی کو جواب دہ تھے۔ اب آزادی قدر ہوگئی لوگ خود خدا ہوگئے اور کسی کو جواب دہ نہیں رہے۔

29۔ علوم نقلیہ کو عروج ملا عالم وہ کہلاتا تھا جو حقیقت الحقائق اور ما بعد الطبیعیات کا عالم ہو۔ اب علوم عقلیہ کو رواج ملا عالم وہ کہلایا جو زیادہ سے زیادہ پیسے کما سکے سب سے زیادہ پیسہ سٹے باز، بینکر، اور تفریحات فلم کی صنعت کے لوگ کماتے ہیں۔

30۔ لوگ خدا کی معرفت، قربت، خوشنودی کو سب سے اہم کام سمجھتے تھے۔ مگر اب لوگ دولت سرمایہ کے حصول اور خواہش نفس کی تکمیل کو سب سے اہم کام سمجھنے لگے۔

31۔ لوگ کسی خیر کسی الحق اور نجات کے لیے جیتے تھے۔ اب لوگ اب صرف خود کے لیے جیتے ہیں۔

32۔ لوگ ایثار قربانی، خدمت، محبت میں لذت محسوس کرتے تھے۔ / لوگ ان اقدار کو احمقانہ سمجھنے لگے۔

33۔ فرد خاندان، قبیلے، گروہ میں رہ کر اجتماعیت کے ذریعے اپنا اظہار کرتا تھا اس کی شناخت وہ خود نہیں تھا۔ اب ہر فرد آزاد ہوگیا ہے انفرادیت پرستی نے سب کو جدا جدا کردیا اب لوگوں کی شناخت

[33] **Shame-**
[34] Modesty-
[35] **General will**

پیشے سے ہوتی ہے انجینئر، ڈاکٹر، سائنس داں، پروفیسر، ٹیچر، وغیرہ اسی لیے لوگ وزیٹنگ کارڈ مانگتے ہیں۔

34۔ عالم اسے کہا جاتا تھا جس کی صحبت میں بیٹھ کر خدا یاد آئے۔ دنیا، دنیا کی لذتیں، نعمتیں حقیر نظر آنے لگیں اور خدا کی محبت تمام محبتوں پر غالب آجائے۔ اب عالم اسے کہا جاتا ہے جو دنیا کا علم سکھاسکے جس کے ذریعے زیادہ سے زیادہ پیسہ کمایا جاسکے اس کے سوا تمام علوم جن سے پیسہ نہ ملے وہ جہالت قرار پائے۔

35۔ آزادی، ترقی، مال سے مال بنانا مقصد تھا نہ اصول نہ ضرورت ہر عمل کی بنیاد صرف آخرت میں نجات تھا، آزادی آخرت کی نفی ہے ترقی کا اصول نفس غیر مطمئنہ کے حصول کا سبب ہے مال سے مال بنانا نجات کے منافی تھا۔ اب آزادی ترقی اور سرمایہ سے سرمایہ کمانا ہی مقصد اصول ہدف ہے ہر عمل کی بنیاد صرف یہ ہے کہ اس سے آزادی میں لذت میں اضافہ ہوا یا نہیں۔

جدیدیت میں انسان پرستی کی مختلف شکلیں

انفرادی انسان پرستی[36]۔ لبرل ازم، لیبریٹرین۔ اس مکتب فکر میں فرد کی آزادی کے دائرے کو وسیع کرنا سب سے اہم قدر ہے اس مکتب فکر کے یہاں آزادی کا انفرادی دائرہ اجتماعی دائرے کے مقابلے میں اہم ہے لہٰذا یہ مکتب فری مارکیٹ پر یقین رکھتا ہے۔ آزادانہ مقابلہ کا قائل ہے ہر فرد کو اس کی صلاحیت کے مطابق مارکیٹ سے حصہ ملنا چاہیے[37] اس مکتب کے یہاں منفی آزادی[38] کا تصور ملتا ہے۔

اجتماعی انسان پرستی[39] ، نیشنل ازم (قوم (۔ سوشل ازم (کلاس)، فاشزم (فرد کی پرستش اجتماعیت کے لیے)، ریس ازم (نسل) ، کمیونزم (کمیونٹی) ۔ عورت[40] فاشزم اجتماعیت کی وہ شکل ہے جہاں اجتماعیت کسی ایک فرد میں حلول کرجاتی ہے فرد کی پرستش اس اجتماعیت کی راست پرستش ہے اجتماعیت کا اظہار کسی ایک فرد کی پرستش کی صورت میں ہوتا ہے جو نجات دہندہ ہوتا ہے۔ مسولینی، اسٹالن، الطاف حسین اس کی مثال ہیں۔

---

[36] **Individual human worship**
[37] **Each according to his ability۔**
[38] **Negative Freedom۔**
[39] **Collective human worship۔**
[40] **Feminism۔**

انسان پرستی کی یہ دونونشکلیں اصلاً آزادی کے تصور کی دو شکلیں ہیں انفرادی آزادی[41] جسے Negative Freedom کہا جاتا ہے دوسرا اجتماعی آزادی[42] جسے کہا جاتا ہے لبرل ازم وغیرہ منفی آزادی کے حامل ہیں جہاں فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادی دی جاتی ہے مثبت آزادی کے حاملین میں انارکزم، فیمن ازم، نیشنل ازم، فاشزم، سوشلزم وغیرہ ہیں جہاں اجتماعیت کے ذریعے کسی گروہ یا طبقے یا صنف یا نوع یا نسل کی آزادی کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔

جدیدیت کے علمیاتی اظہارات:

1۔ عقلیت۔

2۔ تجربیت۔

۳۔ رومانی تحریک[43]۔

۴۔ پس جدیدیت (پوسٹ ماڈرن ازم)۔

جب ان سب کا اختلاط ہوا تو اس سے سائنٹفک میتھڈ لوجی نکلی جو جدیدیت کی علمی توجیہ ہے۔

جدیدیت کی ما بعد الطبیعیاتی تشریحات:

Realism[46] – [45]Idealism – [44]Materialism وغیرہ وغیرہ ان سب میں مشترک قدر انسان پرستی ہے All isms- under the condition of humanism لیکن کوئی مابعدالطبیعات علمی بنیادوں پر یقینی دعویٰ نہیں کر سکتی لہٰذا ما بعدالطبیعات کی علمی بنیاد ہی نہیں رہی ہے۔

---

[41] **Negative Freedom۔**
[42] **Positive Freedom۔**
[43] **Romanticism۔**
[44] **عینیت۔**
[45] **حقیقت پسندی۔**
[46] **مادیت پسندی۔**

خیر القرون کی اصطلاح کا مطلب کیا ہے؟

عہد حاضر کا خدا ا علیٰ معیارِ زندگی ہے جو سرمایہ سے حاصل ہوتا ہے امت اسی میں مبتلا ہے یہ بھول گئی ہے کہ انقلاب امامت کے لیے بھوکا رہنا پڑتا ہے اپنا معیار زندگی کم کرنا پڑتا ہے اور مسلسل کم کرنے پر راضی رہنا ہوتا ہے۔ بھوکا رہنا،خالی پیٹ ہونا کوئی عیب نہیں یہ اللہ کے مقربین کی صفت ہے کم کھانے کم سونے، کم بولنے دنیا سے کم سے کم تمتع کرنے کے باعث اہل اللہ پر اسرار کھلنے اور ان کے درجات بلند ہوتے ہیں ، کھاتے رہنے سے بھوک نہیں مٹتی بھوک کم کھانے اور کھانا ترک کرنے سے مٹتی ہے، مستقل کھاتے رہنے والا ہمیشہ بھوکا ہی رہتا ہے جو بھوک کو قبول کرے اس کی بھوک مٹ جاتی ہے نفس قانع ہو جاتا ہے اس لیے صحابہ و صلحائے امت کثرت سے روزے رکھتے تھے۔

انبیاء کی تہذیبوں میں روزے رکھنا عام بات ہے لوگ لذات دنیا سے کنارہ کش رہتے ہیں تب ہی ان پر حکمت کے چشمے القاء ہوتے ہیں ، لذت و چٹخارے میں مبتلا قوم کے معدے ہمیشہ کچھ نہ کچھ طلب کرتے رہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کی قوم اس کی مثال ہے جسے حالت جہاد میں بھی من و سلویٰ پسند نہ تھا اسے قسم قسم کے کھانے درکار تھے۔ جب جمعہ کے خطبے میں ہم یہ سنتے ہیں کہ خیر القرون قرنی ۔ تو اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ دور جب آخرت ہر رویے پر غالب تھی جب دنیا سب سے حقیر شے تھی جب اللہ کی رضا اور معرفت ہی حاصل زندگی تھی دنیا سے تمتع کم سے کم تھا۔ کوئی ترقی ، دنیا طلبی، لذات و آسائش کی تلاش میں سرگرداں نہیں تھا فقر کی خود اختیاری زندگی پر سب کو فخر تھا وہ کفار کی طرح دنیا سے تمتع کو درست نہیں سمجھتے تھے اور عیش و عشرت کی زندگی کے طالب اور حریص نہ تھے وہ صرف اور صرف حریص آخرت تھے اور اس میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی تگ و دو میں مصروف رہتے تھے۔ اگر خیر القرون ہی اصل معیار ہے تو ہمارا موجودہ طرز زندگی اس کی نفی ہے۔ جدیدیت [ماڈرن ازم] اور خیرالقرون کی جستجو ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے دنیا اور دین برابر نہیں ہوسکتے۔

جو آخرت کو ترجیح دے گا وہ دنیا کا نقصان کرے گا جو دنیا کو ترجیح دے گا وہ لازماً آخرت کا نقصان کرے گا یہ ارشاد رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔

صحابہ کرام کی محبت کا مرکز و محور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تھی، ان کا جینا اور مرنا، کھانا پینا صرف اور صرف اسلام کے لیے تھا۔ اپنی ذات کو وہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے فنا کر چکے تھے۔ ان کا حال ام المومنین حضرت جویریہؓ کے الفاظ میں یہ تھا:

''اخترت اللّٰہ و رسولہ '' میں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو اختیار کر لیا ہے۔[47]

یہ الفاظ آپ نے اپنے والد اور قبیلۂ بنی مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار سے اس وقت کہے جب وہ آپ کو رہا کرانے کے لیے بہت سا مال و دولت بطور فدیہ لے کر آئے اور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت جویریہ کی رہائی کا مطالبہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جویریہ موجود ہیں جانا چاہیں تو لے جاؤ۔ باپ نے کہا کہ رسالت مآب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں میرے ساتھ جانے کی اجازت دے دی ہے۔ ساتھ چلو مگر جواب انکار میں ملا۔ باپ نے اپنی عزت کا واسطہ دیا لیکن حضرت جویریہ نے خود کو دین اسلام کی محبت میں گرفتار کر لیا تھا۔ اس گرفتاری سے رہائی پر تیار نہ ہوئیں اور آپ کے ایمان و استقامت کے باعث نہ صرف آپ کے والد بھائی بلکہ پورا قبیلہ مسلمان ہو گیا۔ حضرت جویریہ کی سوکن ام المومنین حضرت عائشہؓ کا اعتراف محبت دیکھئے فرمایا :

''ما اعلم امرأۃ اعظم برکۃ منھا علیٰ قومھا۔ ''

''میرے علم میں کوئی عورت ایسی نہیں ہے جو جویریہؓ سے زیادہ اپنی قوم کے لیے باعث خیرو برکت ہو''۔

سوکن کا یہ اعتراف ایمان اور اسلام کی خیرو برکت کا نتیجہ ہے اور قرن اول کی روحانیت کا ثمر ہے۔ اسی روحانیت کا اثر یہ تھا کہ ام المومنین حضرت حبیبہ کے والد حضرت ابوسفیانؓ صلح حدیبیہ کے بعد اہل مکہ کے نمائندے بن کر صلح سے متعلق بعض معاملات کے بارے میں گفتگو کے لیے مدینہ طیبہ حاضر ہوئے اور اپنی بیٹی ام حبیبہؓ کے گھر کاشانۂ رسالت میں ان سے ملنے گئے۔ جب گھر میں داخل ہوئے تو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بسترجو بچھا ہوا تھا لپیٹ دیا۔ حضرت ابو سفیان نے پوچھا کہ یہ تم

---

[47]۔ زرقانی: شرح مواہب الدنیہ ۔ج :۲۔ ص:۲۵۵۔

نے کیا کیا، آیا یہ بستر میرے لائق نہیں ہے یا میں بستر کے لائق نہیں ہوں تو آپ نے فرمایا ابا جان آپ مشرک ہیں اور یہ رسول اللہ کا بستر ہے اس لیے آپ اس بستر پر بیٹھنے کے لائق نہیں ہیں۔ [48]

حضرت زینبؓ بنت ام مسلمہؓ سے روایت ہے کہ حضرت زینب ،حضرت ام حبیبہؓ کے والد حضرت ابو سفیانؓ کی وفات پر ان کی خدمت میں حاضر ہوئیں [آپ کی وفات کو تین دن گزر چکے تھے] حضرت ام حبیبہ نے ایک خوشبو جو زعفران وغیرہ سے بنائی جاتی ہے جس میں سرخ و پیلا رنگ ہوتا ہے منگائی اور ایک بچی کے لگائی پھر اپنے رخساروں پر بھی لگائی اور فرمایا مجھے خوشبو استعمال کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن میں نے رسالت مآبﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ:

کسی صاحب ایمان عورت کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی بھی میت کا تین دن سے زیادہ سوگ منائے۔البتہ شوہر پر چار مہینہ دس دن سوگ منائے گی۔ میں نے رسول اللہﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرنے کے لیے اپنے رخساروں پر خوشبو لگا لی ہے[49]۔

کیا عصر حاضر میں یہ رویہ کسی دینی گھرانے میں اختیار کرنا ممکن ہے؟کتنی بدعات رسوم و رواج کے نام پر اختیار کر لی گئیں ہیں۔ ظہر، مغرب،اور عشاء ، اور فجر کی بارہ سنت موکدہ نمازوں کے بارے میں رسالت مآبﷺ کی تاکید سننے کے بعد حضرت ام حبیبہؓ کا ارشاد تھا:

''فما برحت اصلیهن بعد[50]''

''جب میں نے آپ کا یہ ارشاد سنا ہے کبھی ان رکعتوں کا ناغہ نہیں کیا۔''

ام المومنین حضرت صفیہؓ کے باپ حیی ابن اخطب قبیلہ بنی نضیر کے سردار تھے۔ ان کا سلسلہ نسب حضرت موسیٰ کے بھائی حضرت ہارون تک پہنچتا تھا۔ حضرت صفیہؓ کی والدہ قبیلہ بنی قریظہ کے سردار کی بیٹی تھیں[51] غزوۂ خیبر کے بعد حضرت صفیہؓ حضرت دحیہ کلبیؓ کو رسالت مآبﷺ نے عطا کیں بعد میں بعض اصحاب کے مشورے پر انہیں آزاد کر دیا کہ وہ اپنے وطن چلی جائیں یا مسلمان ہو کر آپ سے نکاح کر لیں۔ حضرت صفیہؓ نے فرمایا:

---

[48] عماد الدین ابن کثیر۔حافظ:البدایہ والنهایہ ۔ ج٤:۔ ص: ١٤٣۔

[49] جامع ترمذی: باب ماجاء فی عدة المتوفی عنهاز وجها۔
[50] احمد شیبانی،امام ۔ مسند احمد ۔
[51] زرقانی ۔شرح مواہب الدنیہ ۔ ج٣: ص:٢٥٦ذہبی:سیر اعلام النبلاء: ج:٢۔ ص:٢٣١۔

''اختیار اللہ و رسولہ لقد کنت اتمنی ذٰلک فی الشرک[52] ''

''میں تو اللہ اور اس کے رسول کو اختیار کرتی ہوں تو الحمد اللہ اللہ نے ایمان کی دولت سے نواز دیا میری تو اسلام لانے سے پہلے بھی یہی خواہش تھی''

اللہ کے لیے اللہ کے رسول کو اختیار کرنا یہی مطلوب ایمان ہے۔ عرب کے دو بڑے قبیلوں سے وابستہ ان خاتون کا نکاح خیبر سے واپسی پر راستے میں منعقد کیا گیا۔ دوسرے دن ولیمہ ہوا، صحابہ کرام نے اپنے اپنے سامان میں سے کھجور پنیر گھی وغیرہ لے آئے ایک دستر خوان پر رکھ کر کھا لیا گیا یاور وہیں ولیمہ ہو گیا[53]

کیا جمعہ کے خطبے میں خیر القرن قرونی کی حدیث سننے والے دنیا میں آباد ایک ارب مسلمانوں میں سے کوئی ایک بھی عصر حاضر میں ولیمے کے لیے اس طرح کی دعوت کا تصور بھی کرسکتا ہے؟ اگر کسی سے کہہ بھی دیا جائے تو وہ ایسی دعوت کو اپنے پیغمبر کی اتباع میں بھی قبول نہیں کرے گا کیونکہ یہ سادگی عہد حاضر کے غالب پر تعیش تعقل سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ ام المومنین حضرت صفیہؓ کے بارے میں ان کی باندی نے حضرت عمرؓ سے شکایت کی کہ وہ یہود کی طرح اب تک یوم السبت کی تعظیم کرتی اور یہود کے ساتھ صلۂ رحمی کرتی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے حقیقت معلوم کرنا چاہی تو فرمایا کہ جب سے اللہ نے یوم الجمعہ عطا فرمایا ہے میں یوم السبت کی تعظیم نہیں کرتی، یہودیوں سے میری قرابت داری ہے ان کے ساتھ صلۂ رحمی کرتی ہوں پھر انہوں نے اپنی باندی سے پوچھا کہ کہ تم نے یہ شکایت کیوں کی باندی نے کہا کہ مجھے شیطان نے بہکا دیا تھا۔ آپ نے باندی کو سزا نہیں دی بلکہ فرمایا اچھا جاؤ تم آزاد ہو[54]۔ عفو و درگزر، کرم، محبت، انتقام سے گریز، عطا، سخاوت کا یہ رویہ خیر القرن میں عام تھا۔ اب مفقود ہے۔ ام المو منین حضرت میمونہ کثرت سے نماز پڑھتی تھیں ، غلام آزاد کرنے کا بھی بہت شوق تھا ان کے خوف خدا اور صلۂ رحمی کا اعتراف میں آپ کی سوکن حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں :

---

[52] **زرقانی :شرح مواہب الدنیہ ۔ج:۳۔ ص: ۲۵۸ ۔**

[53] **ذہبی:سیر اعلام النبلاء: ج۲:ص۲۳۲: صحیح بخاری: جلد۲:،ص: ۶۰۶: باب غزوہ خیبر۔**

[54] ابن حجر عسقلانی،حافظ اصابہ: ج۷:،ص:۷۴۱ ۔

''افھما کانت من اتفانا اللّٰہ واوصلنا للرحیم[55]''

''میمونہ ہم لوگوں میں خوف خدا اور صلہ رحمی میں ممتاز مقام رکھتی تھیں''

اتباع رسالت کا عالم یہ تھا کہ آپ حج یا عمرہ کے لیے مکہ آئیں تھیں طبیعت خراب ہوئی تو اپنے بھانجے سے کہا کہ مجھے مکہ سے لے چلوں کیونکہ مکہ میں میرا انتقال نہیں ہو گا۔ رسول اللہ نے مجھے پہلے ہی اطلاع دے دی ہے کہ تم کو مکہ میں موت نہیں آئے گی اور رسالت مآبﷺ کی اطلاع کے مطابق آپ کا انتقال مدینہ سے قریب مقام سرف میں ۵۱ ہجری میں ہوا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں آپ کا نکاح اور ولیمہ سات ہجری میں ہوا تھا.

عہد رسالت میں جہیز کا کوئی تصور نہ تھا لہٰذا احادیث کی کسی کتاب میں جہیز کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ حضرت علیؓ[56] نے مہر میں اپنی ذرع یا اس کی قیمت دی تھی ان کے پاس مہر ادا کرنے کے لیے اس کے سوا کچھ نہ تھا۔ رسالت مآبﷺ نے حضرت فاطمہ کو ایک چادر ، ایک مشکیزہ چمڑے کا ، ایک گدا جس میں اذخر نام کی گھاس بھری ہوئی تھی اور چند چیزیں دیں۔ کیا عہد حاضر میں کسی دین دار گھرانے میں اس سادگی سے نکاح ممکن ہے؟ ایسے نکاح کو نہایت ذلت و حقارت سے دیکھا جائے گا اور کنجوس ، لیئم کے طعنے دیئے جائیں گے اس رویے کے ساتھ مسلمان پوچھتے ہیں کہ اللہ کی نصرت کب آئے گی؟ اسلامی انقلاب کب آئے گا اور استخلاف فی الارض کب عطا ہو گا؟ حضرت حسن کے بارے میں رسالت مآبﷺ نے فرمایا تھا:

'' ابنی ھذا سیدہ ولعل اللّٰہ ان یصلح بہ بین الفنتین عظیمتین من المسلمین[57] ''

''میرا یہ بیٹا سید[58]ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اللہ مسلمانوں کے دو گروہوں میں صلح کرائے گا۔''

---

[55] اصابہ وزرقانی۔شرح مواہب: بحوالہ طبقات ابن سعد۔
[56] بعض روایتوں کی رو سے عثمانؓ نے اس ضمن میں انکی اعانت فرمائی تھی،ایک روایت کی رو سے آپنے کچھ مزدوری بھی اس تیاری کے ضمن میں فرمائی تھی ۔معج
[57] صحیح بخاری: مناقب الحسن والحسین ۔۔الترمذی:ج:۲:ص۲۱۸:فی المناقب
[58] یعنی اپنے دور کے مسلمانوں کا سردار(امام الوقت:امیر) ہوگا،سید کے اصل معنی سردار کے ہیں۔معج

حضرت حسنؓ نے اس حدیث کے مطابق عمل کرتے ہوئے اپنی خلافت کے چھ سات ماہ بعد حضرت معاویہؓ سے صلح کر لی اور آپ کے حق میں دست بردار ہو گئے تھے۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا تو جواب دیا کہ :

اگر خلافت حضرت معاویہ کا حق تھی تو ان کو مل گئی اور اگر میرا حق تھی تو میں اپنے حق سے دست بردار ہو گیا۔

آپ کے اس اقدام کے نتیجے میں امت ایک بار پھر متحد ہو گئی اس سال کو امت کی تاریخ میں ”عام الجماعتہ،، کا سال کہا جاتا ہے۔ جب امت ایک بار پھر مجتمع ہو گئی تاریخ میں کیا کوئی ایسی مثال دکھائی جاسکتی ہے کہ اللہ کے لیے کوئی فرد سلطنت حکومت سے دست بردار ہو جائے؟۔ امت کو جوڑنے کے لیے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کرے اس وقت تو امت کا ہر گروہ خلافت ، حکومت ، اقتدار کی تگ و دو میں شب و روز مصروف ہے۔ سیاسی اسلام ، اسلام کا نفاذ بذریعہ حکومت و قوت اس عہد کا مقبول ترین نعرہ ہے۔ مگر امت میں دور دور تک کوئی حسنی نہیں جو کسی دوسرے اسلامی گروہ، اسلامی جماعت ، اسلامی قیادت کے حق میں دستبردار ہو کر امت کو اکٹھا کر دے۔

یہ پارہ پارہ امت کیا کبھی مجتمع بھی ہوسکے گی؟ اگر نہیں تو اسے استخلاف فی الارض کیسے مل سکے گا؟ حضرت حسنؓ نہایت امیر ترین آدمی تھے لیکن مال راہ خدا میں خرچ کرتے تھے۔ بعض اوقات ایسابھی ہوا کہ آپ نے اپنے موزے تک بھی اللہ کے راستے میں خرچ کر دیئے اور صرف جوتے روک لیے کیا عہد حاضر میں کوئی امیر دین دار اس طرز زندگی کو اختیار کرنے کا تصور بھی کرسکتا ہے جس امت پر دنیا کا غلبہ ہو اور اس قدر کہ قرنِ اول کے طرزِ زندگی کا عصر میں تصور کرنا بھی محال ہو گیا ہو تو اس امت کو دنیا پر غلبہ کیسے عطاہوسکتا ہے جو دنیا میں گرفتار ہے اور دنیا ہی جس کا ہدف اور مقصود ہے اللہ نے اس امت کو ا ہل دنیا کے سپرد کر دیا ہے۔

خیر القرن کا خاص وصف مصیبتوں پر صبر اور اللہ سے بہترین مستقبل کی امید تھی۔ تمام صحابہ رسالت مآب ﷺ کے اس ارشاد پر عمل کرتے تھے کہ:

”ما من مسلم تصیہ مصیبة فیقول ما امرہ اللہ بہ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اللّٰھم اجرنی فی مصیبتی واخلف لی خبرا منھا الا احلف اللہ لہ خیراََ منھا۔،،

’’جس صاحبِ ایمان پر کوئی مصیبت آئےاور کوئی چیز فوت ہو جائے اور وہ اس وقت تک اللہ تعالیٰ سے وہ عرض کرے جو عرض کرنے کا حکم ہے کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہم سب لوٹ کر جا نے والے ہیں اے اللہ مجھے میری اس مصیبت میں اجر عطا فرمااور جو چیز مجھ سے لی گئی ہے اس کے بجائے اس سے بہتر مجھے عطا فرمائے تو اللہ تعالیٰ اس چیز کے بجائے اس سے بہتر ضرور عطا فرمائے گا۔‘‘

ام المومنین حضرت سلمہؓ کو شوہر کے انتقال کے بعد عدت مکمل ہونے پر حضرت عمر اور ابوبکر نے رسالت مآبﷺ کی جانب سے نکاح کا پیغام دیا تو آپ نے اسے قبول کرنے کے بجائے تین عذرات پیش کیے۔ وقت کے پیغمبر اور حکم راں کی جانب سے نکاح کی پیشکش ہو رہی ہے اس سے بڑی سعادت کیا ہوسکتی ہے لیکن اس لمحۂ مسرت میں بھی نفس کا کوئی تقاضہ ایمان کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا ہے۔ ایمان کا تقاضہ یہ ہے کہ ذات رسالت مآبﷺ کے سامنے بھی اصل بات پیش کر دی جائے کیونکہ اگر کوتاہی ہوئی تو ایمان باقی نہیں رہے گا یہ احساس ذمہ داری اس قرن کا خاص وصف تھا آج اس کی آرزو بھی نہیں ملتی۔ ان عذرات کے بیان کا مقصد رسالت مآبﷺ کے سامنے اصل صورت حال پیش کرنا کہ آپ اگر فیصلہ تبدیل کرنا چاہیں تو کر لیں اور یہ خوف کہ رسالت مآبﷺ کی رفاقت حاصل ہو اور آپ کی خدمت میں کوتاہی ہو، حقوق کی ادائیگی نہ ہوسکے، عذر یہ تھے:

[۱] میں بہت غیرت مند ہوں۔

[۲] میرے کئی بچے ہیں۔

[۳] میری عمر بہت زیادہ ہو گئی ہے۔

[٤] میرا کوئی ولی مدینہ میں نہیں ہے۔

یہ دیانت داری ، صاف گوئی ، سچائی ہر اس مومن کے لیے دین کو مطلوب ہے جو اسلامی انقلاب کی آرزو رکھتا ہے اور دنیا بھر سے اس آرزو کی خاطر جہاد کے لیے تیار ہے لیکن اپنے نفس کے خلاف جہاد پر قطعاً آمادہ نہیں ہے اس لیے ہمارا خاندانی اور معاشرتی نظام مسلسل شکست و ریخت اور زوال کا شکار ہے۔

ام المومنین حضرت زینبؓ نے رسالت مآبﷺ کے حکم پر ایک غلام حضرت زید بن حارثہؓ جو رسالت مآبﷺ کے منہ بولے بیٹے تھے اور علم و دین میں ممتاز ترین فرد تھے انہیں قبول فرما لیا اور جب نباہ نہ ہوسکا تو مکہ کے دو بڑے خاندانوں کی عورت ہونے کے باوجود اپنے شوہر سے طلاق بھی بخوشی قبول فرما لی۔ رسالت مآبﷺ نے ان کی دل جوئی کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا اور یہ پیغام حضرت زید ہی لے کر گئے تو اللہ کی اس نیک بندی کا جواب یہ تھا:

" ما انا بصانعة شیئاً حتیٰ او امر ربی فقامت الیٰ مسجدھا [59]"

"کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے میں اللہ سے استخارہ ضرور کروں گی یہ کہہ کر اپنے مصلے پر کھڑی ہو گئیں"۔

یعنی نماز شروع کر دی ، اللہ سے یہ تعلق تھا کہ سورۃ احزاب کی آیت نازل ہوئی اور آسمان پر آپ کا نکاح ہوا، اللہ رب العزت آپ کے ولی بن گئے۔ حضرت زینب اس بات پر فخر کرتی تھیں کہ میرا نکاح میرے اللہ نے کیا جب کہ دیگر ازواج مطہرات کا نکاح ان کے اولیاء اور اہلِ خاندان نے کیا ہے۔

" فقول زوجکن اھالیکن و زوجنی اللہ من فوق سبع السموات[60]"

حضرت زینب کا نکاح اللہ کے حکم سے آسمانوں پر ہوا تو سب سے شاندار ولیمہ بھی آپ کا کیا گیا تھا۔ بخاری[61] کی روایت ہے کہ اس شاندار ولیمے میں صرف بکری ذبح کی گئی تھی ۔کیا روئے ارض پر کوئی ایسا صاحب حیثیت مسلمان عصر حاضر میں موجود ہے جو متمول بھی ہو، حکمراں بھی ہو، اور اس کے ولیمے میں صرف ایک بکری پر دعوت ولیمہ منعقد ہوسکے یہ تصور کرنا بھی عصر حاضر کے دینی ذہن کے لیے ناقابل قبول ہے اگر اس بیان میں شک ہو تو اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر ہر دینی مزاج رکھنے والا مسلمان غور کر لے ! حضرت زینبؓ کے بارے میں ام المومنین ام سلمہؓ اور حضرت عائشہؓ کی گواہی ہےکہ آپؓ بہت صالحہ، کثرت سے روزہ رکھنے والی اور شب بیدار ہونے والی تھیں[62] میں نے ان سے زیادہ دیندار، متقی و پرہیزگار، سچ بولنے والی، صلہ رحمی کرنے والی، صدقہ کرنے والی اور اپنی جان کو نیکی اور تقرب الی اللہ کے کاموں میں زیادہ کھپانے والی کوئی

---

[59]صحیح مسلم :جلد۱:ص۴۶۱۔

[60]صحیح بخاری ۔ جلد:۲۔ ص:۔۱۱۰۴

[61]بخاری۔ ج۲:۔ ص:۷۷۷... صحیح مسلم۔ج :۱،ص: ۴۶۱۔

[62]زرقانی۔ شرح مواہب الدنیہ۔

عورت نہیں دیکھی[63]۔ کیا عہد حاضر کی کوئی دینی ساس، بہو اور سوکن ایک دوسرے کے بارے میں کبھی اس طرح کے کلمات دیانتداری سے ادا کرسکتے ہیں اس معاشرت کی عدم موجودگی میں اسلامی انقلاب کے کیا معانی ہیں ؟ حضرت زینبؓ[64] کوتاہ قامت تھیں اور ان کے ہاتھ بھی اسی لحاظ سے چھوٹے تھے لیکن سخاوت ، انفاق، کارِ خیر میں ان کے ہاتھ لمبے تھے، حضرت عائشہ کا قول ہے کہ رسالت مآبﷺ نے فرمایا:

" قال لنا امرعکن لحوقاً اطوالکن باعاً فبشرھا لبسرعة لحوقھا بہ وھی زوجة فی الجنة[65]

"رسول اللہ نے ان کے بارے میں یہ خوشخبری دی ازواج مطہرات میں میری وفات کے بعد سب سے پہلے میرے پاس آنے والی میری وہ بیوی ہو گی جو سب سے زیادہ لمبے ہاتھوں والی ہو گی یعنی کار خیر میں بہت خرچ کرنے والی[اور وہ جنت میں بھی رسول اللہ کی بیوی ہیں۔"

رسالت مآبﷺ کے وصال کے بعد ازواج النبیﷺ اپنے ہاتھ ناپا کرتی تھیں اور آپ کے فرمان اطوالکن باعاً کا ظاہری مطلب ہی لیتی تھیں لیکن جب رسالت مآبﷺکی وفات کے بعد سب سے پہلے حضرت زینبؓ کا انتقال ہوا تو ازواج مطہرات کو اطوالکن باعاً کا مطلب سمجھ میں آیا سب سے زیادہ سخی اور فیاض۔ اور تمام ازواج مطہرات کی گواہی ہے کہ واقعی ام المومنین زینبؓ ہم سب میں سب سے زیادہ سخی اور فیاض تھیں۔ حضرت زینبؓ کی فیاضی کس درجے کی ہو گی اس کے لیے حضرت عائشہؓ اور حضرت ام المومنین سودہ بنت زمعہؓ کی فیاضی کے صرف دو واقعات پیش کیے جاتے ہیں۔ ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے درہموں سے بھری ہوئی ایک تھیلی ان کی خدمت میں بھیجی، تھیلی حضرت سودہؓ نے لی اور سب درہم ضرورت مندوں پر تقسیم فرما دئیے۔

حضرت عروہؒ کی روایت ہے کہ: میں نے ایک دفعہ دیکھا کہ حضرت عائشہؓ نے ستر ہزار درہم صدقہ کیے اور ان کے اپنے کرتے میں پیوند لگ رہا تھا یقیناً یہ ازواج فیاضی میں حضرت زینبؓ سے کم ہوں گی تو اندازہ کیجیے کہ حضرت زینبؓ کی فیاضی کس درجے کی ہو گی کیا عہد حاضر کے دینی

---

[63] **صحیح مسلم: باب فضائل عائشہؓ۔**

[64] **حضرت زینبب نامی دو زوجائیں نبی اکرمؐ کی زوجائیں تھیں،ایک آپکی پھوپھی زاد ،جناب زید بن حارثہؓ کی اول زوجہ محترمہ یعنی زینب بنت حجشؓ اور دوسری زینب بنت خزیمہؓ تھیں غالباً انھی کی طرف اشارہ ہے،باقی کسی صحیح روایت سے انکا کوتاہ قد ہونا ثابت نہیں ہے صحیح آثار ام المومنین صفیہ بنت حئیؓ کی کوتاہ قامتیت کی بابت ثابت ہیں۔معج**

[65] **ذہبی ۔سیر الاعلام النبلاء ۔ ج:۲: ص:۲۱۵۔**

گھرانوں میں ایسی فیاض عورتیں موجود ہیں۔ عہد حاضر کی دینی مزاج عورتیں اتنی دنیا دار اور اس قدر حریص دنیا ہیں کہ اندازہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا تمام وقت صرف کپڑے بنانے ، کھانے پینے اور گھومنے پھرنے کے لیے وقف ہے۔ ایسی ماؤ ں کی گود سے قرن اول کی نسل کیسے پیدا ہوسکتی ہے جب وہ مائیں ہی مفقود ہیں تو قرن اول کا معاشرہ روئے زمین پر کیسے ظہور کرسکتا ہے ؟ رسالت مآبﷺ نے حضرت زینبؓ کے بارے میں حضرت عمرؓ سے کہا تھا کہ زینبؓ کو کچھ نہ کہو اس لیے کہ وہ ادھہ ہیں کسی صحابی نے ادھہ کا مطلب دریافت کیا تو فرمایا کہ ادھہ کے معنی ہیں خشوع و خضوع کرنے والی اور آپ نے آیت کریمہ پڑھی :

ان ابراهیم حلیم او منیب

''برد بار اور خشوع و خضوع کرنے والے اور اللہ کی طرف توجہ کرنے والے۔''

حضرت زینبؓ کی وفات پر حضرت عائشہؓ نے کہا تھا:

'' ذہبت حمیدة سعیدة مقزع الیتامی، والارامل''

''ایک ستودہ صفات نیک بخت اور یتیموں و بیواؤں کی سہارا عورت دنیا سے رخصت ہو گئی۔''

ایسی نیک بخت عورتوں کی کثرت کے بغیر نہ اسلامی خاندان بن سکتا ہے نہ اسلامی معاشرت جنم لے سکتی ہے افسوس کہ کسی اسلامی تحریک کے نصاب ، نظام تعلیم و تربیت میں ایسی عورتوں کی تعمیر و تشکیل و تربیت کا کوئی تصور تک موجود نہیں ہے۔ قرن اول میں گفتگو کا اندازہ کیا تھا حفظ مراتب کیسے ملحوظ رکھے جاتے تھے اس کا تصور بھی آج محال ہے۔ رسالت مآبﷺ کے چچا حضرت عباسؓ عمر میں آپﷺ سے دو سال بڑے تھے لیکن جب بھی کوئی آپ سے سوال کرتا کہ آپ بڑے ہیں یا رسول اللہﷺ تو وہ جواب میں کہتے کہ:

''ھو اکبر وانا ولدت قبلہ[66] ''

یعنی ''بڑے تو رسول اللہﷺ ہی ہیں ہاں پیدا پہلے میں ہوا تھا''

---

[66] **ذہبی ۔سیر اعلام النبلاء۔ ج:۲: ص:۸۰۔**

حضرت عمرؓ کے زمانے میں قحط پڑ گیا تھا تو حضرت عمرؓ نے حضرت عباسؓ سے بارش کی دعا کرنے کی درخواست کی ، تو انہوں نے درخواست قبول کی اور اللہ نے بارانِ رحمت نازل فرمایا[67]۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ حبر الامت انہی حضرت عباسؓ کے صاحب زادے تھے وصال نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت آپ کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباسؓ کی اولاد اور ان کے لیے دعا فرمائی تھی:

" اللّٰھم اغفر للعباس وولدہ مغفرۃ ظاھرۃ وباطنۃ لاتفادر ذنبہ اللّٰھم احفظہ فی ولدہ[68]"

" اے اللہ! عباسؓ اور ان کی اولاد کے تمام ظاہری و باطنی گناہ معاف فرما دیجیے او ر اے اللہ! ان لوگوں کی ایسی مغفرت فرما دیجیے کہ کوئی گناہ باقی نہ رہنے دے اے اللہ عباسؓ کی حفاظت فرما ان کی اولاد کے بارے میں۔ "

اس دعا کا اثر یہ تھا کہ حضرت ابن عباسؓ علم و حکمت تفقہ فی الدین اور علم تفسیرالقرآن میں ممتاز تر تھے۔ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار آپ کے لیے دعا فرمائی:

" اللّٰھم فقہ فی الدین وعلمہ التاویل۔[69] "

اے اللہ ان کو تفقہ فی الدین عطا فرما اور علم تاویل۔"

جامع ترمذی میں روایت ہے ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اپنے سینۂ مبارک سے چمٹا لیا اور دعا فرمائی:

" اللّٰھم علمھا الحکمۃ[70] "

یا اللہ اسے حکمتہ و علم سے نواز

---

[67] صحیح بخاری: باب :سوال الناس الامام الاستسقاء اذا قحطورا:یہ حدیث کئی اصولِ دین ،عقاید اور استسقا کے ساتھ ساتھ مشروع و ثابت وسیلہ کی مستند دلیل جانی جاتی ہے۔معج

[68] جامع ترمذی: باب مناقب عباسؓ۔

[69] مسلم۔ ج:۲۔صہ:۲۹۸ : باب: فضائل عبد اللہ بن عباسؓ۔ اصابہ۔ ج٤:،ص:۱٤۳۔

[70] جامع ترمذی۔ج۲:،ص:۲۲۳۔ صحیح بخاری: باب ذکر ابن عباسؓ۔

ان کی کم عمری کے باوجود حضرت عباسؓ کے تفقہ فی الدین کو تمام صحابہ کرام اہمیت دیتے تھے۔ حفظ مراتب میں عمر نہیں علم اور عمل مراتب کا تعین کرتے ہیں۔

حضرت عمر فرماتے تھے کہ:

" ذلک فتی الکھول نہ لسان سنول وقلب عقول[71]"

"یہ ایسے نوجوان ہیں جنھیں پختہ عمر لوگوں کا فہم و بصیرت حاصل ہے۔ ان کی زبان علم کی جو یا اور قلب عقل کی محافظ ہے۔"

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ فرماتے ہیں کہ: میں نے ان سے زیادہ حاضر دماغ ، عقل مند ، صاحب علم ، حلیم و بردبار شخص نہیں دیکھا ہے۔ حضرت عمر مشکل مسائل کو حل کرنے کے لیے حضرت ابن عباسؓ کو بلاتے اور کہتے ایک مشکل مسئلہ پیش آ چکا ہے پھر ان کے قول کے مطابق ہی عمل کرتے حالانکہ ان کی مجلس میں بدری صحابہ بھی موجود ہوتے تھے۔"

" فیقول قد جاء ت معضلة ثم لا یجاوز قولہ و ان حولہ لاھل بدر[72]"

لہٰذا حضرت ابن عباسؓ کو کم عمری کے باوجود حضرت عمرؓ اکابر صحابہ ، بدری صحابہ کے ساتھ بٹھاتے تھے یہ مقام ابن عباسؓ کو دین کے لیے محنت سے ملا اور محنت کا طریقہ کیا تھا حضرت ابن عباسؓ کی زبان مبارک سے ان کے الفاظ میں سنیئے کہ:

"میں نے خود اکابر صحابہ کرام کے پاس جا جا کر رسول اللہ کی احادیث اور دین کا علم حاصل کرنا شروع کر دیا کبھی ایسا بھی ہوا کہ مجھے معلوم ہوا کہ رسول اللہ کی ایک حدیث فلاں صحابی کے پاس ہے ان کے گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ قیلولہ کر رہے ہیں۔ یہ سن کر میں نے چادر بچھائی اور ان کے دروازے کی چوکھٹ پر سر رکھ کر لیٹ گیا ، ہواؤں نے میرے سر اور جسم پر گرد و غبار لا کر ڈال دیا ، اتنے میں وہ صحابی نکل آئے اور مجھے اس حال میں دیکھ کر کہا آپ رسول اللہ ﷺ کے بھائی ہیں آپ مجھے بلا لیتے میں حاضر ہو جاتا۔ آپ نے کیوں زحمت فرمائی میں نے کہا کہ

---

[71] **ذہبی۔ سیر اعلام النبلاء ۔ ج:۳۔ ص:۳۴۵۔**
[72] **ذہبی ۔سیر اعلام النبلاء ۔ج۳:،ص:۳۴۷۔**

مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس رسول اللہﷺ کی ایک حدیث ہے میں وہ حدیث آپ سے حاصل کرنے آیا ہوں اور اس کام کے لیے میرا آنا ہی زیادہ مناسب ہے''۔

اس جدوجہد ، دلچسپی، کوشش، خشوع و خضوع اور احترام علم و اکرام حدیث کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکابر صحابہ کی رحلت کے بعد لوگ طلب علم کے لیے حضرت ابن عباسؓ کے پاس آنے لگے[73]۔ آپؓ فرمایا کرتے تھے کہ:

''کنت لاسئال عن الامر الواحد ثلثین من اصحاب النبیﷺ[74] ''

میں ایک حدیث یا ایک مسئلے کو تیس تیس صحابہ کرام سے معلوم کرتا[75]

علم دین عہد رسالت میں کیسے حاصل کیا جاتا تھا اور اس طریقے سے حاصل کرنے والوں کو کن کن شدید آزمائش سے گزرنا پڑتا تھا کن اصولوں کی پاسداری کرنی ہوتی تھی اور پھر ان اہل علم کا مرتبہ امت میں کیا ہوتا تھا ؟س کے لیے حضرت ابو ہریرۃؓ کی زندگی دیکھیے۔ رسالت مآبﷺ نے مسجد نبویﷺ میں ایک چھپڑ ڈلوا کر علم دین سیکھنے والوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ یہ اصحاب صفہ تھے یہی ان کی رہائش گاہ درس گاہ تھی جس کے معلم رسالت مآبﷺ تھے۔ علم الٰہی علم دین اور علم نبویﷺ کے حاملین ان طالبان کی کفالت اہلِ مدینہ کے ذمہ تھی، ان کو کسی سے سوال کرنے کی قطعاً اجازت نہ تھی۔ خواہ کچھ بھی گزر جائے اور کیا کیا زمانے ان پر نہیں گزرے ، بھوک ، نقاہت، غربت،فقر و فاقہ،افلاس، غربت اور فاقے کے باعث یہ اصحاب نماز میں کھڑے ہوتے تو گر جاتے تھے، رسالت مآبﷺ نماز سے فارغ ہو کر فرماتے تھے کہ: تم لوگوں کو اگر معلوم ہو جائے کہ تمہارے لیے ان فاقوں کے بدلے اللہ کے یہاں کیا کیا اجرو ثواب ہے تو تم خواہش کرو کہ ان فاقوں میں مزید اضافہ ہو[76]۔

---

[73] **ہثیمی ۔ مجمع الزوائد ۔ ج۹:،ص:۲۷۷۔ذہبی۔ وتذکرہ الحفاظ ۔۔ ج۱:،ص:۴۳۔**

[74] ذہبی۔ سیر اعلام النبلاء ۔ج:۳۔،ص:۳٤٤۔

یہ اور اسکے مثل کئی موقوف آثار و روایات اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ معترضین حدیث ،روافض ،پرویزیوں وغیرہ کا روایت و کتابت حدیث پر اعتراض بلا دلیل اور ہٹ دھرمی پر استوار ہے ،احادیث صحاح ستہ سے عرصہ قبل دور رسالت مسے ہی روایتِ و حفظ دونوں طور پر عملی طور پر بروئے کار لائی جا رہی تھی،ابو ہریرۃؓ سے اخذ کردہ [75]صحیفہ ہمام بن منبہ ؒ اسکا بین ثبوت ہے۔معج

[76] **جامع ترمذی: باب ما جاء فی معیشۃ اصحاب النبیﷺ۔**

عصر حاضر کے ذہن کے لیے اس زندگی کا تصور بھی ممکن نہیں ہےکیونکہ وہ اپنے زماں و مکاں میں مقید محصور اور مسرور ہے۔ تعقل غالب اس طرز زندگی سے ہم آہنگ ہے لہٰذا یہ قابل قبول نہیں ہے۔ صفہ میں بہت سے طالبان دین تھے۔ حضرت ابو ہریرہؓ بھی انہی میں سے ایک طالب علم تھے اکثر بھوک سے بے ہوش ہو کر گر جاتے صحابہ سمجھتے کہ مرگی کا دورہ پڑا ہے حالانکہ یہ حالت بھوک کی وجہ سے ہوتی تھی۔[77] اس فقر و فاقہ قربانی کا صلہ یہ نکلا کہ آپ نے سب سے زیادہ احادیث روایت کیں ان کی تعداد **٥٣٧٤** ہے[78]۔حضرت ابو ہریرہؓ ۷ ہجری میں اسلام لائے مگر اس کثرت سے آپ کی احادیث کے دو اسباب ہیں۔ وہ خود بیان فرماتے ہیں کہ:

"میں ہمیشہ رسول ﷺ کے ساتھ رہتا تھا نہ اچھا کھانا کھاتا تھا اور نہ اچھا کپڑا پہنتا تھا اور نہ کسی سے خدمت لیتا تھا، بھوک کے باعث کبھی کبھی مجھے اپنے پیٹ کے بل زمین پر لیٹ جانا پڑتا تھا کبھی فرماتے تھے کہ :

کنت رجلا مسکیناً اخدم رسول اللّٰہﷺ علیٰ مل بطنی وکان المھاجرون یتغلھم ایفام علیٰ اموالھم[79]

میں ایک مسکین شخص تھا رسول اللہ ﷺ کی خدمت کرتا تھا اور در دولت ہی سے کچھ کھانے کو مل جاتا تھا حضرات مہاجرین تجارت میں مشغول رہتے اور انصاری صحابہ اپنے باغات میں (اس لیے مجھے آپ کی احادیث و اقوال محفوظ کر لینے کا زیادہ موقع میسر آیا) دوسری وجہ حضرت ابی بن کعبؓ یہ بتلاتے ہیں کہ ابو ہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے ایسے سوالات کر لیا کرتے تھے جن کی ہمت ہم میں سے کوئی نہیں کرسکتا تھا[80]۔ علم دین جو اصل علم "العلم" ہے حضرت ابو ہریرہؓ اس کے اس قدر حریص تھے کہ دنیا کی ساری نعمتیں ان کے نزدیک اس علم کے سامنے ہیچ تھیں۔ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ان کی غربت ،خستہ حالی،مسکینی ، فقر و فاقہ کشی کے پیش نظر بلایا اور فرمایا :

التسالنی عن ھذہ الغنائم

ابو ہریرہؓ غنیمت کے ان مالوں میں سے کچھ مانگو۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اس غربت و افلاس کے عالم میں جواب دیا کہ:

---

[77] ایضاً۔
[78] اصابہ ۔ج۷:،ص:۲۰۱۔
[79] صحیح مسلم: باب فضائل ابوہریرہؓ۔
[80] اصابہ ۔ج:۷۔ص:۲۰۲۔

اسئلک ان تعلمنی مما علمک اللّٰہ اللہ[81]

کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے وہ علم عنایت فرما دیجیے جو اللہ نے آپ کو عنایت فرمایا ہے۔رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کے ذوق و شوق کے پیش نظر آپ کے لیے دعائیں بھی کیں اس لیے آپ کا حافظہ غضب کا تھا۔ محدثین آپ کو: **احفظ اصحاب محمد اور احفظ من روی الحدیث فی عصرہ** کہتے ہیں۔ ایک بار حضرت ابو ہریرہؓ نے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے بھول جانے کی شکایت کی کہ آپ سے بہت سی باتیں سنتا ہوں لیکن یاد نہیں رہتیں۔تو آپ نے فرمایا کہ:

اپنی چادر پھیلاؤ میں نے چادر پھیلا دی اس پر آپ نے کچھ پڑھا پھر آپ کے حکم سے میں نے اسی چادر کو سمیٹ کر اپنے سینے سے لگا لیا اس دن کے بعدسے میں کبھی آپ کی کوئی بات نہیں بھولا[82] حضرت ابو ہریرہؓ کی رائے تھی کہ صحابہ کرام میں سے کوئی شخص بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کثرت سے روایتیں نقل نہیں کرتاجس کثرت سے میں نقل کرتا ہوں البتہ عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ مجھ سے زیادہ روایات نقل کرتے ہیں اس لیے وہ لکھتے ہیں اور میں نہیں لکھتا ہوں **فانہ کان یکتب ولا اکتب**[83]حیرت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حفظ کردہ روایات کی تعداد حضرت عبداللہ بن عمر بن العاصؓ سے بہت زیادہ ہیں۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہؓ سے کسی نے کہا کہ کیا ابو ہریرہؓ نے واقعی آپ لوگوں سے زیادہ احادیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہیں یا یوں ہی روایت نقل کرتے ہیں۔ حضرت طلحہؓ نے جواب دیا انھوں نے واقعی وہ روایات آپ سے سنی ہیں جو ہم لوگوں نے نہیں سنی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ مسکین شخص تھے مال و دولت ان کے پاس نہ تھا۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مہمان تھے۔ آپ ہی کے ساتھ کھاتے پیتے تھے ، اور ہمہ وقت آپ کے ساتھ رہتے تھے اور ہم لوگ اہل و عیال اور مال و متاع والے تھے۔ ہماری حاضری صرف صبح ، شام ہوئی تھی اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جو روایات وہ بیان کرتے ہیں انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی سنی ہیں اور ہم اپنے مشاغل کی وجہ سے ان سے محروم رہ گئے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے بھی ایک موقع پر کہا ابو ہریرہؓ ہم لوگوں کے مقابلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں زیادہ رہتے تھے اور آپ کی احادیث زیادہ محفوظ رکھتے تھے[84] ۔اسلامی تہذیب و تاریخ میں علم دین اگر مال و دولت کی حرص اور دنیا طلبی کی ادنیٰ سی آرزو کے بغیر اس مجاہدانہ

---

[81] **اصابہ۔ج:۷۔ص: ٢٠٤۔**
[82] **صحیح مسلم ۔ جامع ترمذی: ابوا ب المناقب و الفضائل۔**
[83] **صحیح بخاری :باب کتابۃالعلم۔**
[84] **جامع ترمذی :مناقب ابی ہریرہؓ۔**

درویشانہ طریقے سے حاصل ہو تو پوری امت کے لیے خیر و برکت کا ذریعہ بنتا ہے لیکن جب دین کے عالم اور معلم دین کو دنیا کمانے کے لیے استعمال کریں بڑے علماء ان مدارس میں کام کرنا پسند کریں جہاں تنخواہ زیادہ ملتی ہو اور علماء مدارس میں تدریس ترک کر کے اسلامی بینکوں کی ملازمت اختیار کر لیں کہ مدارس میں تنخواہ بہت کم ہوتی ہے اور طلباء ان مدرسوں کا انتخاب کریں جہاں وظیفے زیادہ ہوں رہائش کی سہولتیں عمدہ ہوں اور کھانے پینے کا اعلیٰ معیار ہو اور مدارس طلباء کو راغب کرنے کے لیے اشتہارات شائع کریں اور اپنے اشتہارات میں طلباء کو دعوت دیں کہ ان کے یہاں بھاری وظیفہ ملتا ہے ایئر کنڈیشنڈ درسگاہیں ہیں کھیل کے میدان ، سوئمنگ پول اور باغات ہیں اور علم دین بھی ہے تو ان رویوں کے نتیجے میں جو علم دین حاصل ہو گا وہ روح سے خالی اور دنیا کی لذتوں ، دلچسپیوں سے معمور علم ہو گا۔ یہ علم نہ فرد کی آخرت بدل سکتا ہے نہ امت کی تقدیر۔

ایسے علم سے پناہ مانگنے کی ضرورت ہے جس کا تقاضہ دنیا کے لیے ہو اور جو صرف دنیا سے تمتع کو سہل ترین بنا دیتا ہو صرف علم سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اس کے ساتھ ساتھ خشیت خشوع و خضوع درکار ہے۔ انہی حضرت ابوہریرۃؓ کے بارے میں ابو عثمان الہندیؒ تابعی کہتے ہیں کہ میں ایک بار سات دن تک حضرت ابو ہریرۃؓ کے یہاں مہمان رہا مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے ان کی اہلیہ اور خادم نے رات کے تین حصے کر لیے ہیں باری باری ایک ایک شخص اپنے حصۂ شب میں جاگتا ہے اور یہ ان لوگوں کا مستقل معمول ہے[85]۔ حضرت عمرؓ نے انھیں بحرین کا عامل بنا دیا تھا لیکن جلد ہی آپ نے ان خدمات سے سبکدوشی حاصل کر لی دوبارہ حضرت عمرؓ نے دوبارہ عامل بنانا چاہا تو انکار کر دیا مگردنیا سے اس قدر لاتعلقی کے باوجود وفات سے پہلے آپ رونے لگے کسی نے وجہ پوچھی تو فرمایا :**<u>من قلة الزادر وندة المفازة</u>** سفر سخت ہے اور زاد راہ کم ہے یہ خوف آخرت تھا ور نہ ان کے پاس زاد راہ کم نہ تھا اگر ان کے پاس کم تھا تو پھر کس کے پاس زیادہ ہو گا۔

کیا امت مسلمہ کے پاس ایسے شیخ الحدیث موجود ہیں اگر نہیں ہیں تو یہ امت زوال کے اندھیرے سے کبھی نہیں نکل سکتی۔ آج کے دین دار امراء اور لوگوں کے خدام ایسے ہوں گے کہ وہ رات کو عبادت کے لیے تیار ہوں ؟ ان امراء کا خدام کے ساتھ رویہ کیا ہے کسی کو کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔ اسی لیے امراء کے گھروں میں ڈکیتیاں ، چوریاں ، قتل و خون اغواء کی وارداتیں انہی خدام کے ذریعے ممکن بنائی جاتی ہے جن کے ساتھ غلاموں سے بدتر سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر یہ امراء اخوت اسلامی کو ملحوظ رکھتے تو یہی خدام ان کے جان و مال و آبرو کی حفاظت کرتے لیکن اخوت اسلامی صرف لفظ

---

[85]**اصابہ** ۔ ج :۷۔ ص:۲۰۶۔

کی سطح پر ہے عملی زندگی اخوت کے اس روحانی تصور سے خالی ہے جو ''مواخاتُ'' کے ذریعے تاریخ کے صفحات میں قیامت تک کے لیے محفوظ ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے اس سطح کی مواخات تو ممکن نہیں عصر حاضر میں امراء کی جانب سے ہمدردی ، محبت اور انفاق کی ادنیٰ سے ادنیٰ سطح بھی گھروں کے خدام کے لیے روا نہیں رکھی جاتی ہے ہماری معاشرت سرے سے اسلامی ہی نہیں ہے۔

حضرت زید بن حارثہؓ رسالت مآبﷺ کے خادم اور غلام تھے ان کے والد اور چچا کو ان کا سراغ ملا تو وہ مکہ آئے اور فدیہ کے لیے زر کثیر رسالت مآبﷺ کو پیش کیا۔ آپ نے حضرت زیدؓ کو بلایا اور فرمایا :ان لوگوں کو پہچانتے ہو اپنے والد اور چچا کو انھوں نے پہچان لیا آپ نے ان سے کہا کہ اپنا مال اپنے پاس رکھو یہ زید ہیں اگر یہ تم لوگوں کے ساتھ جانا چاہیں انھیں اختیار ہے۔ رسالت مآبﷺ نے زید کی گردن سے غلامی کا طوق اتار دیا مگر حضرت زیدؓ نے رسالت مآبﷺ کی محبت کا طوق غلامی دوبارہ گلے میں ڈال لیا اور اپنے باپ و چچا کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

حضرت زیدؓ کی اس محبت کے باعث رسالت مآبﷺ نے حرم شریف میں قریش کو گواہ بنا کر انھیں اپنا بیٹا قرار دیا وہ زیدؓ بن محمد کہلانے لگے۔ کیا عہدِ حاضر کے دین داروں کے لیے خدام و غلام سے برتاؤ کے اس واقعے میں کوئی سبق ہے رسالت مآبﷺ نے اس غلام اور خادم کو بیٹا بنانے کے بعد ان کی ایسی تربیت فرمائی کہ غزوۂ موتہ کا جو لشکر جو آٹھ ہجری میں روانہ ہوا اس کے امیر آپ ہی تھے۔ آپ کی شادی اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینبؓ سے فرمائی پھر طلاق کے بعد آپ نے والد کی باندی سے ان کا نکاح فرمایا جن سے حضرت اسامہ بن زیدؓ پیدا ہوئے۔ اس غلام اور خادم سے رسول اللہﷺ کی محبت کا حال یہ تھا کہا ایک بار وہ کہیں باہر سے مدینہ طیبہ آئے حضرت عائشہ روایت کرتی ہیں کہ رسول اللہﷺ میرے گھر میں تشریف رکھتے تھے۔ زید نے دروازہ کھٹکھٹایا آپ اتنی سرعت کے ساتھ ان کے استقبال کے لیے نکلے کہ آپ کی چادر جسم مبارک کے نیچے کھسک گئی اور آپﷺ اسے گھسیٹتے ہوئے ہی باہر نکل گئے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے کبھی بھی آپ کو اس حالت میں باہر نکلتے ہوئے نہیں دیکھا آپ نے ان کو گلے لگایا اور بوسہ دیا۔ ان کی بہادری اور قائدانہ صلاحیت کے باعث جس غزوہ میں حضرت زیدؓ تشریف لے جاتے لشکر کا امیر انہی کو

بنایا جاتا جب رسالت مآبﷺ خود غزوہ میں جاتے تو مدینہ میں اپنا خلیفہ زیدؓ[86] کو بنا کر جاتے تھے[87]۔

کیا عہد حاضر کی کوئی دینی شخصیت اپنے خادم سے یہ تعلق محبت، قرابت، الفت ظاہر کرسکتی ہے؟ ایک غلام حضرت زیدؓ اور ان کی اہلیہ ایک باندی ام ایمنؓ کے بطن سے حضرت اسامہ بن زیدؓ پیدا ہوئے۔ آپ کی پرورش رسالت مآبﷺ نے پوتے کی طرح کی تھی۔ پندرہ سال کی عمر میں غزوۂ خندق میں شرکت کی اجازت ملی، کئی غزوات میں شریک ہوئے اور کئی میں امیر بنا کر بھیجے گئے۔

رسالت مآبﷺ نے وفات سے پہلے آپ کو بیس سال کی عمر میں امیر لشکر مقرر کیا، اس لشکر میں حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ،سعد بن ابی وقاصؓ اور حضرت ابو عبیدہ الجراحؓ جیسے جلیل القدر سپاہی حضرت اسامہ بن زیدؓ کی قیادت میں شریک تھے۔ بعض حضرات کو اس پر اشکال ہوا تو آپﷺ نے فرمایا زیدؓ بھی امارت کے اہل تھے اور واللہ مجھے انتہائی محبوب بھی تھے۔ اسی طرح یہ اسامہؓ بھی واللہ امارت کے اہل ہیں اور مجھے انتہائی محبوب بھی ہیں۔

لقد کان خلیفاً للامارة وایم اللّٰہ ان کان من احب الناس الیٰ وایم اللّٰہ ان ھذا لخلیق لھا وان ھذا لمن احب الناس الی[88]

صحیح مسلم کی ایک روایت میں آتا ہے میں تم لوگوں کو اسامہ کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے کی وصیت کرتا ہوں اس لیے کہ وہ تم لوگوں کے صالحین میں سے ہیں۔

فاوصیکم بہ فانہ من صالحیکم

حضرت اسامہؓ یعنی ایک غلام باپ اور ایک باندی ماں کے صاحب زادے سے رسالت مآبﷺ کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کو اپنی گود میں لیتے ایک بار ان کی ناک صاف کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا آپ رہنے دیجیے میں صاف کیے دیتی ہوں آپؐ نے فرمایا :

---

[86] ممکن ہے کسی ایک آدھ غزوہ میں امیر بنانا ایسا ممکن ہوا ہو اور کچھ روایات سے ثابت ہو مگر مدینہ کے عامل بنائے جانے کی کثیر روایات اسکی موید نہیں ہیں مگر شیخ جو حوالے دئے ہیں اگر وہ متصل السند ہوں اور کسی علت سے پاک ہوں تو انکا موقف قابل توجہ ٹھرے گا۔معج

[87] جامع ترمذی:باب ماجاء فی المعانقہ والقبلة۔ فتح الباری۔ج :۷ ۔ص:۸۷ ۔ بحوالہ: سنن نسائی۔

صحیح مسلم: با ب: فضا ئل زید بن حارثہؓ وابنہ اسامہؓ۔۔ و صحیح بخاری باب :غزونہ زید بن حارثہ و باب بعث النبی ۔۔۔

[88] جامع ترمذی :مناقب: زید بن حارثہؓ۔

عائشہ احبیہ فانی ا حبہ [89]

عائشہ یہ مجھے محبوب ہے تم بھی اس سے محبت کیا کرو

رسالت مآبﷺ کے انتقال کے بعد بعض اصحاب کی رائے تھی کہ لشکر حضرت اسامہؓ کی قیادت میں نہ بھیجا جائے اور کسی سن رسیدہ ، شخص کو امیر بنایا جائے لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس لشکر کے بارے میں کسی تبدیلی کی رائے کو قبول نہیں کیا۔ یہ لشکر صحیح سالم فتح یاب لوٹا کیا عہد حاضر کے مسلمانوں کے لیے یہ طریقہ قابل قبول ہوسکتا ہے ؟ کیا وہ حضرت ابن عباسؓ اور حضرت اسامہؓ بن زید جیسے کم عمروں کی علمیت اور قیادت کو بخوشی قبول کر لیں گے؟ ایک کمسن نوجوان کی قیادت میں جہاد کے لیے ایک سپاہی کے طور پر شریک ہونے میں حضرت ابوبکرؓ،حضرت عمرؓ جیسے کسی بدری صحابی کو کوئی تردد نہ تھا انا ، خود پرستی، خود نمائی، برتری ،عظمت کے تمام تصورات اتباع رسالت نے ختم کر دیئے تھے دین کو یہ عاجزی ، یہ سادگی، یہ رویہ، یہ ایمان، یہ اسلوب مطلوب ہے۔

لیکن یہاں تو معاصرانہ رقابتیں ختم ہونے کا نام نہیں لیتیں ، اگر دعوت نامے میں نام آگے پیچھے کر دیا جائے تقریر میں تقدیم و تاخیر ہو تو تعلقات ختم کر دیئے جاتے ہیں اس کا نام عصر حاضر میں دینی حمیت ہو گیا ہے۔ عقلیت کے مارے ہوئے جدید ذہن اس فکر و نظر سے محروم ہیں جو خیر القرون کا طرۂ امتیاز تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے لیے رسالت مآبﷺ نے ارشاد کیا :

" انعم الرجل عبداللّٰہ لو کان یصلی من اللیل"

عبداللہ بہترین شخص میں کیا ہی اچھا ہو وہ تہجد بھی پڑھنے لگیں اس ارشاد کے بعد حضرت عبداللہ کا حال یہ تھا کہ "**بعد ذالک لاینام من اللیل الا قلیلا** "حضرت عبد اللہؓ رات کو بس برائے نام ہی سوتے تھے[90]۔ رسالت مآبﷺ نے ایک بار حضرت عبد اللہ بن عمر کا کندھا پکڑ کر فرمایا :

---

[89] جامع ترمذی: مناقب اسامہ بن زیدؓ۔
[90] صحیح بخاری .. صحیح مسلم : فی المناقب۔

" کن فی الدنیا کانک غریب اور عابر سیل وعد نفسک من اھل القبور[91] "

یعنی دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ تم پردیسی ہو یا مسافر اور اپنے کو اہل قبور یعنی مردوں میں شمار کرو اس ارشاد کی تعمیل میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے بے زارانہ زندگی گزار دی دنیا سے کوئی تعلق نہ رکھا۔ شہادت عثمان کے بعد بعض صحابہ نے آپ سے بیعت کرنا چاہی لیکن آپ نے منع فرما دیا۔ حضرت علیؓ و حضرت معاویہؓ کے مابین شدید اختلافات ہوئے تب بھی بعض صحابہ نے کہا کہ آپ کے نام پر تقریباً سب متفق ہی ہو جائیں گے لیکن وہ پھر بھی راضی نہ ہوئے کیونکہ حضرت عمرؓ نے بھی وصیت کی تھی کہ خلافت کے لیے مشورے میں میرے بیٹے عبداللہ کو بھی شامل کریں لیکن خلافت کے لیے ان کا انتخاب نہ کریں۔[92] حضرت عثمان نے انھیں قاضی بنانا چاہا تو آپ راضی نہ ہوئے[93] ۔

دنیا سے اس قدر گریز کے باوجود انفاق میں بے مثال تھے راہِ خدا میں کثرت سے مال و دولت خرچ کرتے تھے۔غلام باندی کو آزاد کر دیتے آپ کے غلام نافع کے لیے ایک ہزار دینار کی پیش کش ہوئی لیکن آپ نے لوجہ اللہ آزاد کر دیایہ غلام آپ کے شاگرد خاص تھے۔ فیاضی سخاوت انفاق کا یہ عالم اس وقت تھا جب دنیا سے مکمل گریز بھی تھا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی شہادت ہے کہ :

"ان املک شباب قریش لنفسہ عن الدنیا عبد اللّٰہ بن عمر[94]"

ترجمہ:" قریش کے نوجوانوں میں دنیا کے معاملے میں اپنے نفس پر سب سے زیادہ قابو رکھنے والے عبد اللہ بن عمرؓ ہیں۔ " ان کے مقام کا اندازہ صرف اس بات سے کیجیے کہ خلافت کی پیش کش ہو رہی ہے مگر آپ قبول نہیں فرما رہے۔ عہدۂ قضا کو رد کر رہے ہیں اور ایک عہد حاضر کے دنیا دار اور اہل دین ہیں جو خلافت، حکومت،سلطنت کے لیے ہر وہ کام کر رہے ہیں جس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے اقتدار کی غلام گردشوں میں گردش کرنے کا شوق انھیں کس کس وادی میں لیے پھرتا ہے سب پر عیاں ہے جس کو یہ عہدے نہیں مل رہے وہ اسے طلب کرنے میں مصروف ہے خود اپنے لیے خطابات ایجاد کر لیتا ہے کوئی عہدہ نہ ملے تو اپنے اپنے علاقوں اور جماعتوں میں خلیفہ بن کر قیادت

---

[91]جامع ترمذی :باب ما جاء :فی قصر الامل۔
[92]ابن کثیر: البدایہ والنہایہ۔ج۷:،ص:۱٤٥۔
[93]طبقات ابن سعد۔ج :٤۔ص:۱٤٦۔
[94] عسقلانی : اصابہ ۔ج٤:،ص:۱۰۷۔

فرما رہے ہیں اور اپنی جماعت کے لوگوں سے اسی اطاعت اور نظم و ضبط کا مطالبہ کر رہے ہیں جو صرف ''الجماعت '' کے امیر کے لیے مطلوب ہے۔

ہر شخص کو امت کی قیادت رہنمائی کا شوق ہے نہ اس کے پاس زہد ہے نہ علم نہ خدا کا وہ خوف جو تمام معاملات کو درست کر دیتا ہے۔ ایسی قیادت امت کی تقدیر کیسے بدل سکتی ہے؟ حضرت سلمان فارسیؓ کو حضرت عمرؓ نے مدائن کا حاکم بنایا اور پانچ ہزار درہم وظیفہ مقرر کیا تھا لیکن وہ سب راہ خدا میں خرچ کرتے تھے اور خود اپنے ہاتھ کی کمائی سے کھاتے تھے[95] کیا یہ کردار ہمیں عہد حاضر کی اسلامی ریاستوں کے انقلابی رہنماؤں اور دینی قیادت کے رویوں میں نظر آ رہا ہے۔ ان کے تو اخراجات ہی پورے نہیں ہوتے ضروریات زندگی تعیشات زندگی سے بدل گئی ہیں اس پر فخر بھی ہے ہر تعیش کو یہ ضرورت قرار دیتے ہیں اور اسلام کی عظمت اس سے وابستہ کر دیتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے صاحب زادے سالمؒ کی روایت ہے کہ ان کی دعوت ولیمہ میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ میزبان رسول بھی مدعو تھے۔ جب وہ تشریف لائے تو انھوں نے دیکھا کہ میرے مکان کی دیواروں پر کپڑے کے پردے لٹکے ہوئے ہیں جنھیں دیکھ کر حضرت ابو ایوبؓ نے سخت ناگواری کا اظہار فرمایا اور کہا دیواروں کو کپڑے پہناتے ہو۔ حضرت ابن عمرؓ نے کہا عورتیں غالب آ گئیں حضرت ابو ایوبؓ ناراض ہوئے اور کھانا کھائے بغیر چلے گئے اور کہا:

'' حسن حثیت ان لغلبہ النساء فلم اخش ان یغلینک لا ادخل لکم بینا ولا اکل لکم طعاما[96] ''

خیر القرون کا ہر فرد ایمان ، یقین، عمل میں ایک سے بڑھ کر ایک تھا۔ ایک دوسرے کا محاسب ، نگران، خیر خواہ ناصح اور خلاف سنت عمل پر فوری گرفت کرنے والا اور جس کی گرفت کی جا رہی ہے اس کا تقویٰ دیکھیے کہ وہ اپنے عمل کی کوئی تاویل توجیح پیش نہیں کر رہے اس کو حیلے بہانے سے شرعی ثابت کرنے پر تیار نہیں دیانتداری اور ایمانداری کا عالم یہ ہے کہ حضرت ابن عمرؓ جیسے زاہد عابد شخص کے بارے میں میزبان رسول کا سخت نقد چھپایا نہیں جا رہا بلکہ ابن عمرؓ کے صاحب زادے حضرت سالمؒ اس واقعے کو امت سے چھپانے کے بجائے اس کو روایت کر کے امت کے لیے محفوظ کر رہے ہیں کہ مومنین ایک دوسرے کے اعمال کے کیسے نگراں ہوتے ہیں اور حق کے اظہار پر کسی کو ناگواری نہیں ہوتی سورۂ عصر کی آیت :**و تواصوا بالحق و تواصوا بالصبر**:

---

[95] **کتاب ذکر: اھل اصبھان۔**
[96] **صحیح بخاری: ھل یرجع اذا رای منکر فی الدعوۃ۔**

کی بہترین تفسیر یہی واقعہ ہے۔کیا یہ صورت حال عہد حاضر میں ممکن ہے؟ عہد حاضر میں یہ صورت درپیش ہو تو سب سے پہلے اس واقعے کی روایت ہی نہیں کی جائے گی اور اگر ایسا واقعہ علم میں آگیا تو فوری طور پر کہہ دیا جائے گا کہ طبیعت میں بہت تشدد ہے یہ ٹھیک نہیں ہے سب چلتا ہے۔

حضرت عمار بن یاسرؓ کا کان کسی غزوہ میں کٹ گیا اس کے کٹنے پر عمار نے خوشی بلکہ فخر کا اظہار کیا فرماتے تھے جو کان کٹ گیا وہ زیادہ بہتر تھا اس کان سے جو بچ گیا اس لیے کہ وہ اللہ کے راستے میں کام آگیا۔ عصر حاضر میں یہ مرحلہ درپیش ہو تو سب سے پہلے پلاسٹک سرجن کے مطب آباد ہوں گے۔ اسی ایمان کے باعث رسالت مآبﷺ نے فرمایا تھا :

" دم عمار ولحمہ حرام علی النار ان لغطیمہ[97] "

جہنم کی آگ کے لیے حرام ہے کہ وہ عمار کے خون اور گوشت کو کھائے۔

حضرت سیدنا معاویہؓ ملک شام کے حاکم ہوئے، حضرت عبادہ بن صامتؓ وہیں قیام پذیر تھے۔ ایک دن ایک خطیب نے خطبے میں حضرت معاویہؓ کی موجودگی میں ان کی تعریف شروع کر دی۔ حضرت عبادہؓ نے زمین سے خاک اٹھائی اور خطیب کے منہ پر مار دی حضرت معاویہؓ نے جب اس عمل پر گرفت کی تو فرمایا ہمیں رسول اللہﷺ نے یہی حکم دیا ہے کہ منہ پر تعریف کرنے والوں کے منہ پر خاک ڈال دیں[98] قیام شام میں آپ نے حضرت معاویہؓ کے بعض امور پر نکیر فرمائی اور حضرت معاویہؓ نے اسے تسلیم بھی کیا لیکن کیا عہد حاضر کی علمیت و تعقل کے لیے یہ طریقہ قابل قبول ہے جہاں بڑے بڑے دین دار لوگ اپنے رسائل و جرائد اور اداروں میں اپنے لیے بڑے بڑے القابات درج کرنے پر اپنی شان میں قصیدے پڑھے جانے پر کوئی اعتراض نہیں کرتے ہیں ان قصائد کو پڑھ کر دنیا دنگ ہوتی ہے۔ دینی جماعتیں اور دینی تحریکیں ہر سال کسی خاص تقریب میں یا خاص موقع پر اپنے قصائد خود دنیا کے سامنے پیش کرتی ہیں اور اسے کسی سطح پر بھی بدعت تصور نہیں کیا جاتا ہے۔

---

[97] **عسقلانی : فتح الباری ۔ج:۷۔ ص:۹۱۔**
[98] **ذہبی :سیر اعلام النبلا۔ ج:۳: ص۱۰۔**

حقیقت کیا ہے؟ یہ کون بتائے گا؟ منشائے کلام متکلم بتائے گا یا کوئی اور؟

فلسفیانہ موشگافیوں کی حقیقت و ماہیت بیان کرتی ایک مثال:

زمانہ قدیم کا قصہ ہے کہ ایک دفعہ ایتھنز[99] کے میلے میں ایک مصور کا شاہکار نصب کیا گیا اور لوگوں کی رائے مانگی گئی کہ مصور نے انگوروں کا ایک خوشہ بنایا تھا جسے انسانی ہاتھ نے اپنی گرفت میں لے رکھا تھا وہ انگور اصل[100] سے اس قدر مماثل[101] تھے کہ پرندے نے ان انگوروں پر چونچیں مارنے کے لیے بار بار آرہے تھے یونان میں اس شاہکار کے چرچے ہونے لگے اور ہر ایک مداح اسے سراہ رہا تھا۔

پھر کچھ ایسا ہوا کہ دوسرے دن ایک شخص نے اس شاہکار کو باطل قرار دے دیا اس کا کہنا تھا کہ اس تصویر میں ایک بہت بڑا عیب ہے ،چونکہ ہاتھ نقلی ہے لہذا پرندوں نے نقلی ہاتھ کو پہچان لیا ہے، اگر یہ اصلی ہاتھ ہوتا تو پرندے کبھی انگور پر چونچ مارنے کی جرأت نہ کرتے جو مصور اصلی انگور بنا سکتا تھا وہ اصلی ہاتھ کیوں نہ بنا سکا ؟ یہ اس کے فن کا ایک نقص ہے۔ اس تنقید نے یونان کو ہلا کر رکھ دیا کئی روز تک اس نقد کے چرچے رہے۔ دو ہفتے بعد ایک نقاد نے اس تنقید کا جائزہ پیش کیا اس کا خیال تھا کہ مصور نے تضادات کے ذریعے کمال فن کا مظاہرہ کیاہے۔

نقلی ہاتھ اس مہارت سے بنایا ہے کہ پرندے اس ہاتھ کی حقیقت سے واقف ہوگئے ہیں حالانکہ انسانی آنکھ بھی بہ ظاہر میں اس ہاتھ کو اصل سمجھ رہی ہے اگر پرندوں کے لیے اصلی ہاتھ کے مماثل ہاتھ بنایا جاتا تو لوگ انگوروں پر چونچیں مانے کے حسین منظر سے محروم رہتے اور یہ شاہکار لوگوں کی توجہ کا مرکز ہی نہ بنتا اور نقلی انگور اس کمال سے بنائے کہ پرندوں نے اس پرنقلی ہونے کے باوجود اصل کا گمان کیا حالانکہ یہی پرندے نقلی ہاتھ کو پہچان گئے تھے ۔

جبکہ انسانوں نے ہاتھ بھی اصل کے مماثل جانا مصور نے اس فن پارے کے ذریعے یہ بھی بتایا کہ پرندوں کی حسی صلاحیتیں انسانوں سے نصف بہتر ہوتی ہیں تضادات کے کے باوجود یہ مصوری ایک کمال فن ہے اس تنقید نے یونان میں زلزلہ پیدا کردیا اگلے کئی ماہ اس نقدکا غلغلہ برپا رہا۔ چند ماہ بعد ایک اور ناقد نے اس نقد کے پرخچے اڑادیے اس نے بتایا کہ ہاتھ بھی اصل سے مشابہ ہے اور انگور بھی اصل سے مماثل ہیں اس شاہکار میں کوئی عیب اور نقص نہیں ہے ۔

---

[99] **Athens-**
[100] **Real-**
[101] **Similar-**

لیکن پرندوں نے یونان میں کبھی اتنے خوبصورت رسیلے اعلیٰ ترین انگور نہیں دیکھے لہٰذا وہ انسانی ہاتھ کو اصل جانتے ہوئے بھی اپنی جان پر کھیل کر ان انگوروں کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اس مدح نے تو یونان میں تہلکہ برپا کردیا لوگ اس تشریح و توضیح و تاویل پر عش عش کر اٹھے یہ مدح سرائی کئی سالوں تک ہوتی رہی۔
پھر ایک نئے محقق تشریف لائے انہوں نے تمام سابقہ تشریحات و توضیحات کو رد کردیا اور کہا کہ یہ ظاہر ہاتھ بھی اصلی ہے اور انگور بھی اصلی ہیں لیکن پرندوں نے چند پروازوں کے بعد اندازہ کرلیا کہ مصور نے ہمیں انسانی ہاتھ کے ذریعے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی ہے اور جو پرندے ہمت کرکے جان پر کھیل کر ان جعلی انگوروں تک پہنچ گئے مصور نے ان پرندوں کوبھی دھوکہ دیا کیونکہ انگور نقلی ہیں۔

لہٰذا اب پرندے مسلسل غصے میں انگوروں کے خوشوں پر چونچیں ماررہے تھے یہ پرندوں کا انتقام ہے اس تنقید نے تو یونان کے درو دیوار کو لرزا کر رکھ دیا۔اس نقد پر ایک اور ناقد کا تبصرہ آیا کہ اگر پرندے اس قدر زبردست حسی صلاحیت رکھتے تھے کہ انہوں نے انسان کے دھوکے کو پہچان لیا تو پھر پرندوں کو چاہیے تھا کہ وہ انسانی ہاتھ پر انتقاماً چونچیں مارتے وہ انگوروں پر چونچیں کیوں مار رہے ہیں؟ اس کا رد کرتے ہوئے ایک اور ناقد نے کہا کہ انسانی ہاتھ بالکل مردہ لگتاہے لہٰذا پرندے مردہ ہاتھ پر چونچ نہیں مارتے لیکن انگوروں میں زندگی کے آثار نظر آتے ہیں لہٰذا وہ انگوروں پر چونچیں ماررہے ہیں دھوکہ معلوم ہونے کے بعد بھی پرندے دھوکہ کھارہے ہیں یہی اس فن پارے کا کمال ہے۔ [102]

<u>**متکلم نہیں قران و سنت اور اجماع امت ہی حق پر ہیں:**</u>

لیکن اب سوال یہ ہے کہ منشائے تصویر کون بنائے گا مصور یا نقاد، منشائے کلام کون بتائے گا متکلم یا کوئی اور یا اس کا نامزد فرد۔ ایک ہی حقیقت کی ایک ہزار تشریحات ہوسکتی ہیں اور وہ صورت بھی پیش آسکتی ہے جسے علم منطق میں تاؤیل القول بما لا یرضی عنہ قائلہ یعنی قول کی ایسی تاویل کرنا جس سے متکلم خود راضی نہ ہو چنانچہ کون سی تشریح حقیقت ہے اس کا تعین، فیصلہ کیسے ہوگا؟ کلام اللہ اور کلام رسول اللہﷺکی تشریح و توضیح و توجیہہ و تفسیر اللہ کے نامزد رسولﷺ کے

---

[102] شیخ کی یہ تمثیل تمام فلسفیانہ،حکیمانہ اور خود ساختہ انسانی آراووں کا پول کھولنے کے لئے برہانِ قاطعہ ہے،اس کے ذریعہ انھونے لوگون کو درس دیا ہے کہ جن فلسفیانہ حکیمانہ آراووں کے دم پر تم دین کی بیخ کنی کرنے میں پیش پیش رہتے ہو انکا علمی مقام ایک خود ساختہ موقف اور اس کے مداحوں اور ناقدوں کی علمی تشریحاتی اضافیت کے سوا کچھ نہیں ہے،میں نے کچھ سال قبل اپنی جامعہ کراچی کی تدریس میں اور فیس بک وال دونوں میں میں موقف اختیار کیا تھا کہ فلسفہ علمی بدمعاشی کا نام ہے،اسکی ٹھیٹ تصویر کشی شیخ نے فرمائی ہے ،یہ توارد ہم دونوں سے الگ الگ بغیر ایک دوسرے کا مطالعہ کئے وقع پذیر ہوا،میرے شاگرد نے دو تین سال بعد اسی سال اپنی وال پر میرے قول کے ساتھ فلسفہ کی تعریف کے طور پر لگادی کہ فلسفہ کی تعریف:فلسفہ ایک علمی بدمعاشی کا نام ہے،جس پر وہاں ایک بحث کا آغاز ہوا،میں وہاں اسکی دعوت پر بھث میں کہا کہ یہ ایک ناقدانہ تبصرہ تھا ناکہ تعریف ،مگر میرے شاگرد کو یہ تعریف لگی،یقین کریں جو تبصرہ فلسفہ کے موافق و مخالف آئے وہ شیخ کی تمثیل کا اپ ڈیٹڈ ورژن تھے، بھرحال دماغ سوزی اور زبانی ہٹ دھرمی بھی ثابت قدمی اور مستقل مزاجی مانتی ہے ،شاید کوئی اور مجھ سے زیادہ مستقل مزاج میری بھی دھجیاں بکھیر دیتا مگر نتیجہ میری اور شیخ کی تمثیل کے اتبع میں ہی آتا،لہذا وحی و رسالت جو قلبی سکون اعتقاد و اعتقاد کرتی ہیں ہیں وہ متنوع ،متغیر ،غیر متفقہ اور تضاد سے پر فلسفیانہ آرا عطا نہیں رتی ہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ اسکا بھی ایک اپنا نشہ اور مزا ہے ،لہذا فلسفہ و حکمت موافق و مخالف دونوں پر اپنا جادو ضرور چلالیتے ہیں۔معج

صحبت یافتہ اصحا ب اور دین کی روح سے آشنا صلحائے امت کریں گے یا کوئی بھی ایرا غیرا یہ کام کر ے گا؟ ظاہر ہے فقہائے عابدین اس کی تشریح کریں گے اور تشریح بہر حال انسان کریں گے اور عقل کی مدد سے کریں گے تو خطاء کا امکان ہمیشہ رہے گا لہٰذا اس امکان کا ازالہ اسلامی علمیت ،منہاج تہذیب و تاریخ میں اجماع سے کیا گیا ہے۔

کیونکہ دین کی تعبیر و تشریح میں عقل انسانی استعمال ہوگی۔ افراد کی عقل انفرادی سطح پر غلطی کرسکتی ہے۔ لیکن امت کے فقہائے عابدین کی اکثریت اجتماعی غلطی نہیں کرسکتی ہے ،اس لیے رسالت مآبﷺنے فرمایا کہ:

میری امت کا اجماع کسی غلط بات پر نہیں ہوسکتا ہے۔

<u>خالد صاحب کا معیار شاورا:</u>

عقل جب بھی تنہا استعمال ہوگی تو غلطی کا امکان رہے گا لہٰذا اس غلطی کے امکان کو ختم کرنے کا طریقہ الہٰی حکمت بالغہ نے امت کے اجتماعی تعقل کو بروئے کار لاتے ہوئے اجماع امت کی صورت میں اختیار کیا ہے ۔ظاہر ہے یہ اجماع عوام کا نہیں صرف اور صرف علماء عابدین و ساجدین کا معتبرہے[103]، مسلک جمہور کی اصطلاح سے علامہ اقبال جیسے فلسفی کو یہ شبہ ہوا کہ اس سے مراد عوام ہیں جو عربی میں کالانعام کہلاتے ہیں اس طرح ساجدین عابدین کے اجتماعی تعقل کے فیصلوں کو رسالت مآبﷺ کی حدیث مبارک سے تائید حاصل ہوگئی کہ امت کا اجماع کسی غلط بات پر ممکن نہیں ہے۔

اس قول کی تصحیح اللہ تعالیٰ نے بھی فرمائی ہے، لہٰذا یہ قول اذنِ ربانی کی بھی وضاحت کررہا ہے کہ اللہ کی تائید بھی اس موقف کو حاصل ہے ۔اس لیے رسالت مآبﷺ نے ہر نئے معاملے، نئے مسئلے اور نئی الجھن کو سلجھاتے ہوئے کسی بڑی غلطی کے امکان سے بچنے کے لیے ہدایت فرمائی کہ فقہائے عابدین سے مشورہ کرو۔

روایت ہے کہ حضرت علی نے آنحضرتﷺ سے پوچھا کہ ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آئے جس کے متعلق کوئی صریح حکم یا ممانعت قرآن و سنت میں موجود نہ ہو تو میرے لیے کیا حکم ہے؟ تو آپ علیہ السلام نے ارشاد فرمایا :

شاوروافیہ الفقہاء العابدین ولا تمضوا فیہِ رأَیَ خاصَّۃٍ[104]

اس سلسلے میں عبادت گزار فقہاء سے مشورہ کرو خود اس میں کوئی خاص رائے قائم نہ کرو

اس امت میں جب بھی لوگوں نے رسالت مآبﷺکے اس حکم سے انحراف کیا تو ٹھوکر کھائی جدید اسلامی سائنس ، اسلامی سرمایہ داری ، اسلامی اکنامکس ، اسلامی جمہوری سیاست ، اسلامی سوشل سائنسز اور نکاح المیسار یعنی اسلامی متعہ کے ذریعے اسلامی معاشرت کی تباہی و بربادی کے حیلے

---

[103]طبرانی:معجم کبیر۔ مجمع الزوائد ۔

[104] **ہثیمی :مجمع الزوائد :۱۷۸۱۔**

عہد حاضر میں اس کی زندہ مثالیں ہیں ۔ ان امور میں عجلت کے باعث ہم سے غلطیاں سرزد ہوئیں غلطیاں کرنے والوں نے خود اپنے موقف کو الحق نہیں کہا بلکہ اپنی خطاء کا امکان تسلیم کیا لہٰذا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم ماضی کی اغلاط سے احتراز کریں اور ایک نئی دنیا تعمیر کریں جس کے اپنے ادارے ہوں جو اپنی علمیت پر انحصار کریں نہ کہ مغرب کی اسلام کاری کا فریضہ انجام دیں۔

ہر تہذیب کو اسکی ذاتی اصطلاحات کی روشنی میں دیکھا جائیگا:

جس طرح اسلامی اصطلاحات کے معانی فقہاء و علماء امت بتائیں گے بالکل اسی طرح مغرب سے آنے والی اصطلاحات اور نظریات کا اصل مطلب مغرب کے فلسفی، ان کے دانشور اور ان اصطلاحات کے موجد ومصنف بتائیں گے۔ اس کے بجائے ان مغربی اصطلاحات کا ترجمہ کرکے ان کی اسلام کاری کرلینا ایک غیر علمی رویہ ہے مثلاً مغرب میں ماڈرن ازم فریڈم ، بینکنگ ، فائینانس ، اکنامکس ، مساوات ،کشادہ دلی[105] جمہوریت[106] ، معیار زندگی[107] مالی قلت[108] پروگریس، ڈیویلپمنٹ،غربت[109] سٹیزن ، فریڈم آف ایکسپیریشن، ہیومن رائٹس کا مطلب وہ قطعاً نہیں ہے جو انگریزی سے واقف ہمارے بعض مذہبی مفکرین اردو ترجمہ کرکے بیان کرتے ہیں۔

کسی بھی اصطلاح کاکامل ترجمہ ممکن نہیں لیکن اس کی تشریح ، توضیح ، تفسیر ممکن ہے جو ترجمے سے عموماً نہیں ہوتی ہے۔ لہٰذا مغربی اصطلاحات کا اصل مفہوم سمجھنے کے لیے ہمیں مغرب کے بڑے فلسفیوں کا مطالعہ کرنا ہوگا ورنہ ہم بد ترین علمی خیانت کے مسلسل مرتکب ہوتے رہیں گے۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی ، وحید الدین خان ، طہٰ جابر العلوانی اور ذاکر نائیک صاحب کا اصل مسئلہ یہی ہے کہ یہ حضرات جدید مغربی فلسفے کے ذیلی علوم جدید سائنس اور سوشل سائنس اور کافرانہ علم کے نئے دریچے فلسفۂ سائنس سے قطعاً ناواقف ہیں لہٰذا مغربی اصطلاحات اور نظریات کے نا مکمل ، محرف ، غلط سلط غیر علمی ،غیر مصدقہ ترجمے کرکے ان کو خواہ مخواہ اسلامی سمجھنے لگتے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ ایک زبان اور تہذیب کی اصطلاحات کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں ممکن نہیں ہے، صرف اصطلاح کی تشریح و توضیح ممکن ہے ۔ خصوصاً وہ اصطلاحات جو خاص تاریخ ، تہذیب ، ثقافت اور ما بعد الطبیعیات سے نکلی ہوں جیسے ''عدت'' کا ترجمہ ناممکن ہے اگر ترجمہ کیا جائے تو اس کا مطلب گننا ہوگا مگر کیا گننا؟ کب؟ کیسے؟ کب تک؟ کیوں؟ کس لیے؟ کس کے لیے؟ ترجمہ ان سوالات کا جواب دینے سے قاصر ہے لیکن ایک ان پڑھ مسلمان بھی اس اصطلاح کے تمام مفاہیم ایک لمحے میں جان سکتا ہے کہ اس اصطلاح کے لیے جو علم درکار ہے وہ اس کی عملی زندگی کا تجربہ ہے۔

---

[105] **Tolerance-**
[106] **Democracy-**
[107] **Standard of living-**
[108] **Scarcity capital .**
[109] **Poverty-**

یہ تجربہ وہ اپنی تاریخ و تہذیب میں زندہ تجربے کے طور پر برتتا ہے لہٰذا علم کے بغیر وہ عامل ِکامل ہوتا ہے کیونکہ اس اصطلاح کے مکمل تناظر سے وہ واقف ہے۔ لیکن ایک دوسری تہذیب کا بڑے سے بڑا عالم بھی اس اصطلاح کا مطلب نہیں جان سکتا ہے۔ اگر ان اصطلاحات کے تاریخی تناظر سے واقف نہ ہو۔ بعض اصطلاحات ہر تہذیب ، دین میں یکساں ہوتی ہیں مثلاً عیسائیت یہودیت اسلام میں اللہ ، صلوٰۃ ، صوم مشترکہ اصطلاحات ہیں لیکن ان اصطلاحات کی حقیقت تینوں مذاہب میں بالکل مختلف ہے۔لہٰذا اگر اصطلاحات یکساں ہوں ان کے الفاظ بھی ملتے جلتے ہوں تب بھی ان کا ما بعد الطبیعاتی تناظر بدل جانے سے ایک جیسی اصطلاحات کے معانی بھی بدل جاتے ہیں مثلاً عیسائیوں کے یہاں مسیح ابن اللہ ہیں اسلام میں مسیح صرف رسول اللہ روزہ عیسائی اور یہودی بھی رکھتے ہیں لیکن دونوں کے یہاں روزے کا طریقہ بالکل مختلف ہے۔عیسائی روزے میں ایسی چیزیں کھاسکتے ہیں جو آگ پر پکی ہوئی نہ ہوں ، حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ یہودی، عیسائی عقیدے کے مطابق خدا کے بیٹے تھے اسلام توحید اورصوم کے ایسے تصورات کو تسلیم نہیں کرتا ہے، لہٰذا اصطلاحات کی یکسانیت اور الفاظ کی مماثلت سے دھوکہ کھانے کی ضرورت نہیں ایک جیسی اصطلاح کے معانی مفاہیم ، مطالب ،بھی ایک دوسرے سے یکسر مختلف ہو سکتے ہیں۔مثلاً مغرب کی فلسفیانہ اصطلاح فریڈم یا آزادی کا ترجمہ عربی میں حریت اور اردو میں آزادی درست ترجمہ نہیں ہے ،یہ اس اصطلاح کے صرف ایک پہلو کو بیان کرتاہے آزادی مغرب کی قدر[110] ایمان و عقیدہ[111] ہے یہ اصطلاح ان کے فلسفے ، مذہب ، عقیدے کی اساس ہے دیگر تہذیبوں میں آزادی محض صلاحیت[112] ہے اسی طرح مساوات اور ترقی جیسی اصطلاحات جو آزادی کی طرح مغرب کے تمام ازموں کی مشترکہ اقدار ہیں ان کے حقیقی مفاہیم اور تاریخی تناظر کو نظر انداز کرکے ہم انہیں ترجمہ کرکے سادہ طریقے سے بیان کرتے ہیں تو غیر علمی رویہ اختیار کرتے ہیں جو بہت سے شکوک و شبہات کو جنم دیتا ہے اس کے نتیجے میں مغربیت اسلامی معاشروں میں تیزی سے سرایت کرتی ہے ۔ اصطلاحات کی حقیقت سے آگہی کے بغیر جب ہم ان اصطلاحوں کی اسلام کاری کرتے ہیں تو در اصل کفر کی اسلامی توجیہہ بیان کرتے ہیں جو علمی دیانت کے خلاف ہے دیانت داری کا تقاضہ یہ ہے کہ اصطلاح کو اس کے حقیقی تناظر اور اس کی تاریخ و فلسفہ کی روشنی میں سمجھا جائے امت مسلمہ کو اس معاملے میں شدید حساسیت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

ذاتی ملکیت مغربی فکر میں حقیقی شہ نہیں ہوتی ہے:

ابھی تک جدید مسلم معیشت دانوں کے خیال میں سرمایہ داری میں ذاتی ملکیت ہوتی ہے حالانکہ سرمایہ داری اور اشتراکیت میں جو خود سرمایہ داری کی بد ترین شکل ہے۔ ذاتی ملکیت تو باقی ہی نہیں رہتی ہے ۔ سرمایہ داری خواہ لبرل ہو یا نیشنل اس میں ایک شخص قانونی املاک کی ذمہ داری سنبھال لیتا ہے،ذاتی ملکیت[113] کی جگہ کارپوریٹ ملکیت[114] لے لیتی ہے ۔ حصص یافتگان سرمایہ کار ہوتے ہیں دولت[115] ، سرمایہ[116] میں تبدیل ہو جاتی ہے اور سرمایہ میں مسلسل و مستقل اضافہ ہوتا رہتا ہے اسی لیے لوگ بینک ، اسٹاک مارکیٹ ، میوچل فنڈ سے پیسہ نہیں نکالتے ہیں۔

---

110 **Value۔**
111 **Faith and believe.**
112 **Ability۔**
113 **Private property۔**
114 **Corporate Property۔**
115 **Wealth۔**
116 **Capital۔**

حالانکہ اگر لوگ بینک سے اپنا پیسہ نکال لیں توبینک اسی وقت بند ہو جائے جدید مارکیٹ کے سرمایہ دارانہ نظام میں سرمایہ لوگوں کا غلام نہیں ہوتا ہے، بلکہ یہ تمام سرمایے کے غلام ہوتے ہیں جبکہ اشتراکیت میں سرمایہ ریاست کی ملکیت ہوتا ہے لہٰذا سرمایہ داری اور ا س کی دوسری شکل سوشلزم و کمیونزم کے ساتھ ساتھ لبرل ازم سوشل ویلفیئر ازم میں بھی نجی ملکیت باقی ہی نہیں رہتی ہے۔ کارپوریٹ کلچر، شیئرز اور میوچل فنڈز کے کاروبار وغیرہ کے ذریعے تمام سرمایہ چند مینجرز کے قبضے میں ہوتا ہے ہر شخص ان کا اسیر اور غلام ہوتا ہے۔ بڑی بڑی کمپنیوں کے ادغام[117] اس کا ثبوت ہیں ۔ الغرض جدید مغربی اصطلاحات کو سمجھنے کے لیے فی الحال :

The Development Dictionary: A guide to knowledge as power Edited by New Jersey & WOLFGANG SACHS 1993 Zed Books Ltd. London.

کا مطالعہ کیا جائے اس کتاب میں جدید مغربی اصطلاحات کو تاریخی تناظر میں بیان کیا گیا ہے اور Development، Environment، Equality، Helping، Need، Market، One World، Participation، Planning، Population، Poverty، Production، Resources، Science، Socialism، Standard of Living، State، Technology کی دل فریب ملمع سے پر اصطلاحات کا حقیقی تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے۔

اسی طرح جدید مغربی فلسفے کی تاریخ، مقصد، ہدف منزل اور حقیقت مغربی فلاسفہ کی اصل تحریروں کی روشنی میں سمجھنے کے لیے :

Alex Callinicos. Social Theory: A historical introduction 2003, Polity Press Cambridge UK.

کا مطالعہ ضروری ہے جس میں اصطلاحات و مفکرین جیسے: The Enlightenment، Hegal & Marx، Liberals، Power & Life، The golden Age، Weber، Durkheim، Revolution، Counter Revolution، The illusion of Progress جیسے عنوانات پر مدلل گفتگو کی گئی ہے۔اسی طرح

سائنس و ٹیکنالوجی سے مرعوبیت کے بجائے اس کی حقیقت واضح طور پر سمجھنے کے لیے فلسفۂ سائنس کے مفکر **A.F. Chalmer** کی کتاب :

What is this thing called science 1988 Open University Press

کا مطالعہ ضروری ہے۔ اس کتاب میں استقرائ، استخراج، کی بنیاد پر اخذ نتائج کی حقیقت کھول کر رکھ دی گئی ہے اس کے مطالعے سے جدید سائنس و ٹیکنالوجی کے سلسلے میں مشرق کے مفکرین کی خواہ مخواہ مرعوبیت کے اسباب بھی معلوم ہوتے ہیں۔ کہ یہ بے چارے نہ سائنس کو جانتے ہیں نہ ٹیکنالوجی کو نہ فلسفۂ سائنس کے مباحث سے واقف ہیں یہ سائنس و ٹیکنالوجی پر ایمان بالغیب کے بعد

[117] **Merge۔**

اس کی اسلام کاری کا عمل شروع کرتے ہیں فلسفہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی اصطلاحات کے سلسلے میں Stanford Encyclopedia of Philosophy یا دیگر لغات فلسفہ سے بھی رجوع کیا جاسکتا ہے۔اس کے علاوہ درج ذیل کتب اور رسائل کا مطالعہ مفید رہے گا :

	کتب	ناشر
۱	جریدہ ۲۹ ، جریدہ ۳۵ ، جریدہ ۳۷	شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ ، جامعہ کراچی
۲	محمد احمد: مرتبہ: سرمایہ دارانہ نظام :ایک تنقیدی جائزہ۔	
۳	محمد احمد: مرتبہ: جمہوریت یا اسلام۔	
۴	ماہنامہ ساحل ، کراچی ، ۲۰۰۵ء ، ۲۰۰۶ء ، ۲۰۰۷ء اور ۲۰۰۸ء کے تمام شمارے۔	
۵	مریم جمیلہ : کتاب اسلام اینڈ ماڈرن ازم۔	
۶	قاضی عبدالقادر: کشاف اصطلاحات فلسفہ	شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ ، جامعہ کراچی۔
۷	ڈاکٹر جاوید انصاری: Business ethics in Pakistan انصاری کی اس کتاب کے آخر میں فلسفیانہ اصطلاحات کی تشریح کی گئی ہے۔	
۸	اصطلاحات فلسفہ کی لغت :انگریزی۔	آکسفورڈ یونیورسٹی پریس کراچی۔

مغربی اصطلاحات اور اداروں کی حمایت سے پہلے ان تحریروں کا مطالعہ کر لیا جائے۔عالم کی شان یہ ہے کہ ان یکون بصیراً بزمانہ اپنے زمانے سے واقف ہوتا ہے رسالت مآبؐ کی دعا ہے اللّٰھم ارنی حقیقۃ الاشیاء کماہی۔ کہ اے اللہ ہمیں اشیاء کی حقیقت ویسی ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں۔ حضرت عمر کا ارشاد ہے کہ وہ شخص دین کی کڑیاں بکھیر دے گا جو جاہلیت کی حقیقت سے نا واقف ہو۔ اس لیے جدید دنیا میں جدید مغربی فلسفے اور جدید سائنس اور سوشل سائنس اور جدید اداروں سے واقفیت کے بغیر ان کافرانہ علوم کی اسلام کاری کی تحریک زور و شور سے چل رہی ہے اس تحریک کے چلانے والے مغرب کے علوم، فنون، فلسفے سے سرسری طور پر بھی آگاہ نہیں۔ مغرب کے فہم سے محروم یہ مفکرین تاریخ بلوچستان کے اہم کردار عیدو کی طرح عالم اسلام میں مغربیت، جدیدیت، کے نفوذ، نفاذ کے لیے بھرپور کردار ادا کر رہے ہیں یہ عید و کون تھا آئیں اس کا مطالعہ کریں۔

عیدو بلوچ اور جنرل ڈایر کی چالاکیاں اور مکاریاں:

جب ان سرحدی بلوچوں کی حریت پسندی خطرناک حد تک تمام علاقے میں پھیل گئی تو فروری ۱۹۱۶ء میں انگریزوں نے جنرل ڈائرکو بھیجا تاکہ سرحدی بلوچوں کو کچل دے ۔ یہ جنرل ڈائر وہی ظالم ہے جس نے بعد ازاں جلیانوالہ باغ میں ہندوؤں ، مسلمانوں اور سکھوں کا قتل عام کرایا۔ ڈائر نے ''کچو'' کے مقام پر پہنچ کر بلوچ سرداروں سے ہتھیار ڈالنے کا مطالبہ کیا لیکن انھوں نے اس مطالبے کو حقارت سے ٹھکرادیا۔ ڈائر ایک تجربہ کار اور مکار انگریز جنرل کی حیثیت سے بخوبی اندازہ لگا چکا تھا کہ اس کوہستان جس کی چپہ چپہ زمین سے دشمن واقف ہے ،براہ راست مقابلے کی دعوت دینا انگریز سپاہ کی تباہی و بربادی کا سبب بن سکتا ہے۔چنانچہ اس نے بلوچوں کی مجموعی طاقت سے ٹکرانے کی بجائے ان میں خوف و ہراس، بد نظمی اور انتشار پھیلانے کی تجویزیں سوچ لیں۔ ڈائر نے مشّاق اور ہوشیار جاسوسوں کے پروپیگنڈے سے بلوچوں کو انگریزوں کی پانچ ہزار مسلح فوج اور بہت بڑے توپ خانے اور جنرل ڈائر کی ''موٹر'' کی ہیبت ناک داستانیں سنا کر ڈرانا چاہا۔ یہاں کسی نے موٹر کار نہیں دیکھی تھی۔ اس لیے جاہل خانہ بدوش اور جنگلی بلوچ قبائل موٹر دیکھ کر اس قدر حواس باختہ اور حیران ہوتے کہ ان کی چیخیں نکل جاتیں اور بے تحاشا بھاگ اٹھتے، ان میں جو زیادہ سمجھدار تھے وہ موٹر کو خطر ناک جنگی مشین خیال کرتے تھے اور اس کے مقابلے میں آنے سے گھبراتے تھے۔ جنرل ڈائر نے اپنے دو انگریز افسروں اور عید و نامی بلوچ رہبر کے ساتھ کوہستان میں کاروانوں کے راستے پر موٹر دوڑائی، راستے میں جہاں کہیں خانہ بدوش نظر آتے موٹر ٹھہرائی جاتی عیدو ان کے پاس جاتا اور موٹر کی شکل و صورت ، برق رفتاری اور ہولناکی کے ایسے ایسے من گھڑت قصے بیان کرتاکہ بلوچوں پر سکتے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی۔

موٹر کے ریڈی ایٹر کے ساتھ سوراخ دکھا کر عید و بلوچوں سے کہتا کہ ہر سوراخ بندوق کی نالی ہے اور ایک بٹن دباتے ہی ان میں سے ہزاروں سنسناتی ہوئی گولیاں نکل کر مینہ کی طرح دشمن پر برسنے لگتی ہیں۔ عیدو انہیں موٹر کی بتیاں دکھا کر کہتا کہ یہ اس کی دور بین کی آنکھیں ہیں دشمن کہیں بھی اور کتنی ہی ہوشیاری سے چھپا ہوا ہو یہ آنکھیں اسے ڈھونڈ نکالتی ہیں اور پھر اس پر گولیاں برساکر اسے ختم کردیتی ہے۔ عید و نہایت ذہین اور طرار بلوچ تھا اسی قسم کی بیسیوں داستانیں گھڑ کر ان کے ہوش اُڑاتا ۔ عید و کا پروپیگنڈہ کوہستانوں اور وادیوں میں آگ کی طرح پھیلتا گیا، جنگ جو اور بہادر بلوچ پتھروں پر اپنی رائفلیں رکھ کر حیران پریشان ایک دوسرے کا منہ تکتے رہ جاتے۔

ایک مقام پر عزت نامی ایک بلوچ نے اپنے آدمیوں کے ساتھ جنرل ڈائر کا رستہ روکا۔ انہیں دیکھ کر ڈرائیور نے زور سے موٹر کا ہارن بجایا اور تیزی سے ان کی طرف موٹر دوڑائی نتیجہ یہ نکلا کہ عزّت اور اس کے آدمی حملے سے باز رہے[118]۔ اگر بلوچ اس موٹر کی حقیقت سے آگاہ ہوتے تو اس پر پتھراؤ کردیتے، اس کے سامنے آگ کی خندق بچھادیتے اس کے ٹائر پنکچر کردیتے لیکن رعب، خوف و دبدبہ ۔ قرآن میں بار بار اس سے پناہ اسی لیے مانگی گئی ہے۔موٹر کار سے خوف زدہ سادہ دل بلوچ ہیبت کا شکار ہوگئے۔ وہ توڑے دار بندوق سے موٹر کے اگلے حصے کو نشانہ بناتے تو موٹر چلنے

---

[118] **تاریخ بلوچستان بہ حوالہ: اثیر عبدالقادر شاہوانی: جنگ : مڈ ویک میگزین ۱ :اکتوبر ۲۰۰۹۔**

کے قابل نہ رہتی اس میں آگ لگ جاتی وہ موٹر پر چٹانیں گرا کر اسے تہس نہس کر دیتے مگر خوف، دہشت، ہیبت جب طاری ہو تو کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ دلوں پر کسی شے کا رعب قائم ہوجائے تو اسے دور کرنا محال ہوجاتا ہے۔ ایمان کے نتیجے میں کفر، شرک اور اس کی قوتوں کا رعب دل سے نکل جاتا ہے اور صرف اللہ کا رعب دلوں پر طاری ہوتا ہے اسی لیے مومن خدا کے سوا کسی سے نہیں ڈرتا حتیٰ کہ موت سے بھی نہیں جس دل میں یہ خوف اور یہ رعب راسخ ہو اس کا رعب اللہ تعالیٰ دشمنوں پر بھی طاری کر دیتا ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ اس نے اہل ایمان کا رعب کفار کے دلوں پر طاری کر دیا تھا۔ سورہ حشر میں یہ مضمون عجیب طریقے سے بیان ہوا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا اس کی تفصیل یہ ہے۔

۱۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَخْرَجَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ڼ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ يَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَيْثُ لَمْ يَحْتَسِبُوْا ۤ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ يُخْرِبُوْنَ بُيُوْتَهُمْ بِاَيْدِيْهِمْ وَاَيْدِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۤ فَاعْتَبِرُوْا يٰٓاُولِي الْاَبْصَارِ [119] ۔

وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے کافروں کو ان کے گھروں سے پہلے حشر کے وقت نکالا تمہارا گمان (بھی) نہ تھا کہ وہ نکلیں گے اور وہ خود بھی سمجھ رہے تھے کہ ان کے (سنگین) قعلے انہیں اللہ (عذاب) سے بچا لیں گے . پس ان پر اللہ کا عذاب ایسی جگہ سے آپڑا کہ انہیں گمان بھی نہ تھا اور ان کے دلوں میں اللہ نے رعب ڈال دیا اور وہ اپنے گھروں کو اپنے ہی ہاتھوں اجاڑ رہے تھے اور مسلمان کے ہاتھوں (برباد کروا رہے تھے) پس اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔

قرآن بتاتا ہے کہ اہل ایمان کفار کے خلاف جہاد کے راستے میں ثابت قدم رہیں تو اللہ ان کا رعب کفار کے دلوں میں ڈال دیتا ہے:

۲۔ اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰۗىِٕكَةِ اَنِّىْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭسَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ [120] ۔

ہم منکرین حق کے دلوں میں مومنین کا رعب بٹھادیں گے:

۳۔ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىھُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ [121] ۔

کفار کے رعب ، لاؤ لشکر شان و شوکت، دبدبے کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں پر اطمینان اور بے خوفی کی کیفیت طاری کردیتا ہے:

---

[119] **القران:۲:۵۹**
[120] القران: ۸:۱۲
[121] القران: ۳:۱۵۱

۴۔ اِذْ يُغَشِّيْكُمُ النُّعَاسَ اَمَنَةً مِّنْهُ[122]۔

اسی نفس مطمئنہ کے باعث مومن نہ دل شکستہ ہوتا ہے نہ غم کرتا ہے :

۵۔وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ[123] ۔

مومن مصیبتیں پڑنے پر دل شکستہ نہیں ہوتا:

۶۔ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ [124]۔

کفار مکہ کو بھی خانہ کعبہ کی برکت سے رزق کثیر ، امن اور خوف سے نجات عطا کیا گیا تھا:

۷۔ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ڏ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ[125] ۔

خذ ما صفا و دع ماکدر کے فلسفہ کا محاکمہ:

عہد حاضر کے جدید مسلم مفکرین ، مغرب سے مرعوب بعض راسخ العقیدہ علماء ، مغرب کی معیشت ، سیاست ، ثقافت ، تہذیب ، اقدار ، روایات ، ما بعد الطبیعیات ، ایمانیات ، اعتقادات ، مقاصد ، اہداف ، معاشرت سائنس ، ٹیکنالوجی ، سوشل سائنسز کا تنقیدی جائزہ لیے بغیر اسے غیر اقداری[126] تصور کر کے اس کی مدح و ثناء میں مصروف بعض مشائخ اور ذرائع ابلاغیات خصوصاً برقیاتی ذرائع ابلاغ :الیکٹرانک میڈیا، عیدو بلوچ کا کردار ادا کررہے ہیں میڈیا کے اینکر پرسن ، کالم نگار ، صحافی عیدو بلوچ کی طرح عالم اسلام کے لوگوں کو مغرب کی سائنس ، ٹکنالوجی ، ترقی سے اسی طرح ڈرا کر مرعوب و مغلوب کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے مغرب سے واقفیت از حد ضروری ہے۔صحف ابراہیم میں عجیب قول ہے :

وعلی العاقل ان یکون بصیراً

ہر زمانہ کے دانا شخص پر لازم ہے کہ وہ اپنے زمانے کو جاننے والا ہو۔ اور حضرت عمر کا ارشاد کہ وہ شخص دین کی کڑیاں بکھیر دے گا جو جاہلیت کی حقیقت سے واقف نہیں ہے۔ فتویٰ دینے سے متعلق جو شرائط امہات کتب میں بیان کی گئی ہیں ان میں اہم ترین شرط یہ ہے کہ مفتی اپنے زمانے سے واقف ہو ورنہ وہ جاہل ہے فھو جاھل ؟

---

[122] **القران: ۸:۱۱**

[123] **القران: ۳:۱۳۹**

[124] القران: **۳:۱**

[125] **القران:۴:۱۰۶**

[126] **Value Neutral-**

اپنے زمانے سے واقف ہونے اور جاہلیت کی حقیقت سے آگاہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حق کی شناخت، حق کی تلاش، حق کا حصول صرف اور صرف جاہلیت کے فہم پر منحصر ہے۔ لہٰذا جب تک مغرب کا فلسفہ اس کی سائنس گہرائی سے نہ پڑھی جائے اس کا ادراک، فہم اور مقابلہ ممکن نہیں بلکہ جاہلیت سے آگہی ان کے لیے ضروری ہے جو مغرب اس کے فلسفے اور اس کی سائنس کو پڑھے، جانچے، آزمائے اور جانے بغیر قبول کرلیتے ہیں اور خذ ما صفاء و دع ماکدر کے فلسفے کے تحت مغرب سے آنے والی دل پسند اشیاء کے استعمال کی بھرپور وکالت شروع کر دیتے ہیں ایسے لوگ پہلے عصر حاضر پر اس کے تعقل غالب پر روح عصر پر مغرب کے اداروں ارادوں اور اس کی مصنوعات ایجادات ترقی پر ایمان لے آتے ہیں اس کے بعد اس ایمان ویقین کی اسلامی توضیحات تصریحات تشریحات بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے مغرب کے فلسفے، مذہب اور ما بعد الطبیعیات کا مطالعہ ضروری ہے ۔ کسی شے میں کیا شے اچھی ہے کیا بری ہے، کتنے فی صد بہتر ہے ،کتنے فی صد ناقابل قبول ہے، اس کا اندازہ اس وقت تک ممکن نہیں جب تک شے کی ماہیت ، حقیقت ، اصلیت ، علمیت ، ما بعد الطبیعیات ، مقاصد سے واقفیت نہ ہو۔

اس لیے رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ:

اے اللہ مجھے چیزوں کی حقیقت ویسی ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں۔

اللّٰھم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابہ اے اللہ ہمیں حق کو حق دکھا اور اس کی اتباع کرنے کی توفیق عطا فرما اور باطل کو باطل دکھا اور اس سے اجتناب کرنے کی توفیق عطا فرما ۔

لہٰذا جو شخص مخالف تہذیب، مذہب علم کی ہر شے کو رد کرتا ہے اس کے لیے کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوتا۔ مسئلہ اس وقت شروع ہوتا ہے جب آپ اپنے مدمقابل تہذیب مذہب کی اشیاء افکار ، علوم ، نظریات ، حاصلات ، سائنس ، ٹیکنالوجی نظریۂ افادیت کے تحت قبول اور استعمال کرنے لگتے ہیں ، کیونکہ اسلامی ، علمیت میں افادہ پرستی[127]، مادہ پرستی[128] اور نتائجیت پرستی[129] کی بنیاد پر فیصلے نہیں کیے جاتے بلکہ فیصلوں کی بنیاد شریعت ہوتی ہے جس میں دیکھا جاتا ہے کہ مالک حقیقی کی رضا کیا ہے؟۔

جدیدیت اور لبرل ازم کا اصول یہ ہے کہ کیا ممکن ہے! اور اکثریت کو کس شے سے فائدہ ہوسکتا ہے خواہ یہ فائدہ شریعت کو مطلوب نہ ہو لیکن نفس کا خدا چاہتا ہو، اسلامی علمیت میں افادہ پرستی نفس پرستی اور حرص و ہواکے ایسے کسی نظریے کی کوئی گنجائش نہیں ہے،یہ خالص مغربی فسادات قلب ہیں ۔اسلامی علمیت میں ہر شے کو اصول پر جانچا پرکھا جائے گا کہ وہ مقاصد شریعہ کے حصول میں معاون ہے یا مزاحم ہے۔ ایک شے خلق کے لیے بے حد فائدہ مند ہے لیکن دل ،روح ، مقاصد شریعہ اور ایمان کے خاتمے کا اعلامیہ ہے تو اسے کسی صورت میں قبول نہیں کیا جائے گا

[127] **Utilitarianism-**
[128] **Materialism-**
[129] **Pragmatism-**

چنانچہ واضح ہوا کہ خذ ما صفا و دع ماکدر یعنی جو اچھا ہے وہ لے لو اور جو برا ہے اسے ترک کردو کے فلسفہ پر عمل پیرا مکاتب فکر پر لازم ہوگا کہ اس جاہلیت جدیدہ کی علمیت ، مابعد الطبیعیات اور جدید اشیاء میں مستور خیر قلیل و کثیر اور شر کثیر و قلیل کا میزانیہ مغربی فلاسفہ و مفکرین کی تصریحات اور نصوص اسلامی کی روشنی میں قائم کریں۔
بصورتِ دیگر یہ مکاتب فکر تاریخ کے میزانیے میں ''مصیب[130]''قرار نہیں دیے جاسکتے ہیں۔ ٹرائے[131] کے گھوڑے کو استعمال کرنے والے کو اس کی باطنی، اندرونی حقیقت بھی معلوم ہونا چاہیے ورنہ یہ گھوڑا ایک تہذیب و تاریخ کوشکست دینے کے لیے کافی ہوتا ہے۔ رسالت مآبؐ اور حضرت عمرؓ کے ارشادات کا مقصد یہی ہے کہ امت مسلمہ اپنے عہد کے عیدو بلوچ سے خبردار رہے اور کسی تہذیب سائنس، ٹکنالوجی اورکسی قوم سے مرعوب نہ ہو۔یہ اسی وقت ممکن ہے کہ ہم ہر عہد کے عیدو بلوچ سے واقف ہو نجو ہر شعبہ زندگی میں داخل ہو کر مغرب کی سائنس اسلحہ، مغرب کی ترقی،اس کے اداروں اس کے مقاصد ، اس کی چکا چوند ، اس کے طریقوں اس کی ترقی اس کی طاقت ، برتری ، بلندی ، عظمت ، عروج و اقبال کے قصیدے سنا کر اس جھوٹ ، فریب ، ملمع اور دجل سے عالم اسلام کو خوف زدہ کرنے میں مصروف ہیں لہٰذا مغربی سائنس اور فلسفہ پڑھنا ضروری ہے تاکہ کفر کی حقیقت سے آگہی ہو۔اس آگہی کے بغیر عہد حاضر کے پیدا کردہ سوالات کا جواب دیتے ہوئے نہایت توجہ، احتیاط اور توقف کی ضرورت ہے تاکہ دین کی ایسی تعبیر و تشریح سامنے آسکے جو مقاصد شریعہ کو ممکن بناسکے عجلت میں دی جانے والی رائے اسلامی روایت کو کم زور کرنے کا باعث بن سکتی ہے ہماری علمی تاریخ احتیاط، توازن اور توقف کی تاریخ ہے عجلت کی تاریخ نہیں عجلت علم کی دنیا کے لیے نا قابل قبول رویہ ہے ۔اسی لیے حضرت عبداللہ بن عمرؓ فتویٰ دینے میں احتیاط برتتے اور بلاتکلف لا ادری فرما دیتے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے کہ میں نہیں جانتا کہنا نصف علم ہے۔ امام مالکؒ سے چالیس مسئلے پوچھے گئے، آپ نے صرف آٹھ کا جواب دیا اور بقیہ بتیس مسائل کے بارے میں فرمایا : لا ادری سائل نے کہا میں چھ سو میل سفر طے کر کے آیا ہوں اگر آپ نہیں جانتے تو پھر کون جانے گا۔ فرمایا ملائکہ کہتے ہیں:

لاعلم لنا الا ما علمتنا

یہ رویہ ، مزاج ، اسلوب ، دیانت عہد حاضر میں کیوں مفقود ہوگئی ہے۔ ہم ہرسوال کا جواب دینا کیوں ضروری سمجھتے ہیں جس کے بارے میں ہم آگہی نہیں رکھتے۔ کیا ہمارارویہ اسلامی علمیت، دیانت اور ایمان سے ہم آہنگ رویہ ہے[132]۔

---

[130] **صحیح رائے تک پہنچنے والا۔**

[131] **Troy-**

[132] **یہ مضمون جریدہ "الواقۃ" کراچی کے شمارہ، شعبان معظم 1433ھ/ جون، جولائی 2012- سے ماخوذ ہے۔**

ٹیکنو سائنس

ٹیکنالوجی اور ٹیکنو سائنس

جدید سائنس اور سرمایہ داری کا باہمی تعلق

جناب پروفیسر شاہد رشید صاحب نے ''البرہان'' جولائی ، اگست ۲۰۱۱ء کے شماروں میں راقم الحروف اور جناب ڈاکٹر وہاب سوری صاحب کی گفتگو پر اپنے شبہات کا اظہار ستمبر ۲۰۱۱ء کے'' البرہان'' میں کیا ہے ـــ اس سے پہلے کہ محترم شاہد صاحب کے سوالات، شبہات اور اعتراضات کا (جن میں سے بیشتر غلط فہمی کی بنیاد پر قائم کئے گئے ہیں) جواب دیا جائے چند بنیادی مباحث واضح کیے جارہے ہیں تاکہ یہ مکالمہ ایک طے شدہ منہاج میں کیا جائے اور اپنے منطقی انجام تک پہنچے نہ کہ محض غلط فہمیوں اور الزام درالزام قسم کی کوئی چیز بن جائے۔

ا۔مغربی سائنس کی حقیقت

جب ہم سائنس کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد یونانی سائنس ، قدیم سائنس [Classical Science]، سکالسٹک سائنس [Scholastic Science] ارسطو کی سائنس [Aristotal Science]، اسلامی سائنس [Islamic Science] نہیں ہوتی بلکہ اس سے مراد جدید سائنس [Modren Science] ہوتی ہے جس کا ایک خاص تعلق اس مابعد الطبیعیاتی انقلاب سے ہے جسے ہم فلسفے اور سائنس کی زبان میں کوپرنیکی انقلاب [Copernecian Revolution] کے نام سے جانتے ہیں جس نے علمیت (تصور و فلسفۂ علم یعنی Epistemology) کے پیمانے تبدیل کردیے۔ اس انقلاب کی فلسفیانہ تشریح کانٹ کے فلسفیانہ کام کے ذریعے منظر عام پر آئی۔ کانٹ کے فلسفے نے ۱۷ ویں صدی سے پہلے کے تمام فلسفوں اور مابعد الطبیعیاتی اساسات کو منہدم کرکے نئی مابعد الطبیعیات کی بنیاد رکھی جسے ہم ہائیڈیگر کے الفاظ میں 'حاضر و موجود کی مابعد الطبیعیات' [Metaphysics of Presence] کہتے ہیں۔ کانٹ نے کہا کہ ماورائے طبیعیات کا علم ہم میسر ذرائع علم [عقل، وجدان، حواس، تجربات] کے ذریعے حاصل نہیں کر سکتے۔ حقیقت مطلق کیا ہے؟ اس کا ادراک میسر و موجود ذرائعِ علم سے ممکن نہیں۔ گویا ہم حقیقت کی حقیقت نہیں جان سکتے کیونکہ علم مظاہر [Phenomenon] تک محدود ہے، مشاہدے اور حسی تجربے سے ہی ممکن ہے اور مستور و مخفی

اشیاء کا علم [Nomenon] انسان کے لیے ممکن نہیں۔ ہم حقیقت کی کنہہ نہیں جان سکتے لیکن ہم حقیقت تخلیق کر سکتے ہیں اور اس تخلیق شدہ حقیقت کو کائنات پر مسلط بھی کر سکتے ہیں۔ یہی آزادی [Freedom] کے فلسفے کا حاصل ہے لہذا تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ انسان نے تلاش و جستجوئے حقیقت کے بجائے تخلیق حقیقت [Creation of Reality] کا فلسفہ ایجاد کیا جس کے نتیجے میں حقیقت مطلق اور مابعد الطبیعیاتی سوالات غیر عقلی قرار پائے۔ انسان کے لیے حقیقت الحقائق اور ماورائے طبیعیات کا علم ناممکن الحصول قرار پایا اور یہ طبعی، مادی، تجربی، حسی دنیا اور اس کے حصول کے جملہ مادی طبیعی تجربی علوم ہی اصل علوم قرار پائے۔

اس فلسفے کے نتیجے میں طبعی علوم اور سائنسی ترقی کی غیر معمولی رفتار نے دنیا کو حیران کر دیا۔ جب علم کا مطلب محض مادی رہ گیا اور علم کا مقصد صرف مادی ترقی ہی قرار پایا تو جدید انسان نے اپنی توانائیاں، حکومتوں نے اپنا تمام سرمایہ اور قوتیں اسی شعبے میں صرف کیں لہٰذا زبردست مادی ترقی نے روحانیت کو بے معنی کر دیا اور مابعد الطبیعیاتی مباحث، معاملات اور سوالات علم کے دائرے سے خارج ہو گئے۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے تمام تہذیبوں میں خصوصاً مادیت اور روحانیت ایک کلیت کا حصہ تھے۔ نقلی، عقلی اور مادی علوم ایک کُل سے وابستہ تھے اور اسی کلیت میں ان کو دیکھا اور جانچا پرکھا جاتا اور اسی کلیت میں ان کی تخلیق اور نشو و نما کا عمل ہوتا تھا مغرب کی طرح ذہن اور جسم کی دوئی [Dualism] کا کوئی تصور موجود نہیں تھا۔ اس وقت مابعد الطبیعیات پہلے ہوتی تھی اور اس مابعد الطبیعیات کے مطابق علمیت وجود پذیر ہوتی تھی یعنی علمیت کا ماخذ مابعد الطبعیات تھی۔ خود علمیت علمیت کا منبع اور سرچشمہ نہیں تھی۔ ڈیکارٹ، جو جدید فلسفے کا بانی ہے، اس نے 'I think therefore I am' کا فلسفہ پیش کر کے اُس ترتیب کو بدل دیا۔۔۔ڈیکارٹ کے فلسفے کے نتیجے میں علمیت پہلے آ گئی اور اس علمیت سے مابعد الطبیعیات اخذ کی گئی ۔۔۔ ڈیکارٹ نے یہ بتایا کہ ہم علمیت کے ذریعے کیا جان سکتے ہیں اور کیا نہیں جان سکتے لہٰذا مابعد الطبیعیات غیر اہم ہو گئی۔ جدید سائنس کا بنیادی المیہ یہی ہے کہ یہاں علمیت سے مابعد الطبیعیات اخذ ہوتی ہے لہٰذا جدید سائنس اور ٹیکنالوجی کے دائرے میں صرف مادیت ہی باقی رہ گئی اس کا تعلق صرف مادہ پرستی کی اقدار سے وابستہ ہو گیا اور دیگر تمام اقدار سے منقطع ہو گیا لہٰذا جدید سائنس میں روحانیت، اسلامیت اور مذہبیت داخل کرنے کی کوشش اس سائنس کی حقیقت، حیثیت، کیفیت اور تاریخ سے ہماری عدم واقفیت ہے۔

۲۔ ٹیکنالوجی سے کیا مراد ہے؟

جب ہم ٹیکنالوجی کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد سترہویں صدی سے پہلے کے معاشروں اور تہذیبوں میں موجود ٹیکنالوجی نہیں ہے بلکہ وہ ٹیکنالوجی جو جدید سائنس کے نظریات کے تابع تخلیق کے مراحل سے گزری اور اس جدید سائنس میں موجود جدید انسان جو ہر خارجی ذریعۂ علم کا انکار کر کے تخلیق حقیقت کے دعوے کے ساتھ نئی مابعد الطبیعیات کو مادی سانچوں میں سرمایہ [Capital] کے ذریعے ڈھال کر ٹیکنالوجی ایجاد کر رہا تھا جسے فلسفہ سائنس اور فلسفے کی زبان میں اب عموماً ٹیکنالوجی نہیں بلکہ Techno Science کہا جاتا ہے جس کی توام اصطلاح Scientism بھی ہے لہٰذا جدید مابعد الطبیعیاتی مسلمات، جدید سائنس اور سرمایہ داری کی تثلیث کے ذریعے جو ٹیکنو سائنس جود میں آئی اسے ہم مثلث کے ذریعے یوں ظاہر کر سکتے ہیں۔

Capital

New Metaphysics/ Mega Narratives/ Copenican Revolution/ New world view/ Metaphysics of Modernism

Modern Science

Techno Science

ان معنوں میں ہم یہ کہتے ہیں کہ جب جدید مابعد الطبیعیات جو اس دنیا کو ارسطو کی زبان میں ابدی [Eternal] سمجھ کر اس دنیا کو جنت میں تبدیل کرنے کے لیے آزادی کے آدرش کے دوش بہ دوش جدید سائنس اور سرمایے کے ذریعے ٹیکنالوجی کا قالب اختیار کرتی ہے تو وہ اقداری Value laden ہوتی ہے۔ اس کی یہ اقدار جدید فلسفے میں موجود تصور انسان، تصور کائنات، تصور آخرت اور تصور حقیقت سے اخذ ہوتی ہیں جہاں انسان ایک مطلق آزاد فرد ہے کسی کو جواب دہ نہیں۔ اس کی زندگی کا مقصد محض آزادی میں اضافہ ہے، وہ خود علم کا ماخذ، منبع و سرچشمہ ہے اور وہ خود پیمانۂ علم بھی ہے۔ آزادی میں اضافے کی بے شمار شکلیں ہیں لیکن موثر ترین شکلیں سرمایہ، مارکیٹ اور ترقی ہے۔ عہد حاضر میں آزادی دو سطح پر اپنا اظہار کرتی ہے۔ آزادی کا تجریدی اظہار یا شکل [Abstract form] ووٹ ہے اور آزادی کا حقیقی مادی پیکر [Concrete form] سرمایہ [Capital] ہے۔

عصرِ حاضر کی ٹیکنو سائنس کی ترقی سرمایہ سے شروع ہوتی ہے، سرمایہ میں ارتکاز کے لیے ہوتی ہے اور اس ارتکاز سرمایہ کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔ جو شے سرمایہ سے پیدا ہوئی اور سرمایے کے ذریعے وجود میں آئی اس کا مقصد سرمایہ اور صرف سرمایہ میں اضافہ کے سوا کیا ہوسکتا ہے؟ ارتکاز سرمایہ کا یہ عمل اورخواہش لامتناہی (∞) ہے لہٰذا ٹیکنو سائنس کی ترقی کی رفتار بھی لامتناہی ہے۔ اس کا کوئی آخری کنارہ نہیں اس کی وسعتیں سمندروں اور آسمانوں سے بھی زیادہ ہیں۔

۳۔ نظام سرمایہ داری کیا ہے؟

یہاں اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ دولت [Wealth] اور سرمایہ [Capital] میں بنیادی فرق ہے۔ یہ دونوں مترادف یا ہم معنی اصطلاحات نہیں ہیں۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے دنیا میں کہیں سرمایہ نہیں تھا۔ دولت پہلے بھی تھی اور دولت آج بھی ہے لیکن سرمایہ پہلے کبھی نہیں تھا مگر آج سرمایہ کا دور ہے۔ اسی طرح بازار اور مارکیٹ توام اصطلاحات نہیں ہیں۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے دنیا کی ہر تہذیب میں بازار ہوتا تھا مارکیٹ نہیں ہوتی تھی۔ بازار روایتی، غیر سرمایہ دارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ معاشروں میں آج بھی موجود ہیں مگر یہ رفتہ رفتہ ختم ہورہے ہیں ان کی جگہ مارکیٹ لے رہی ہے۔ مارکیٹ خاص جدید مغربی فلسفے اور جدید مغربی آدرشوں کے آمیختے سے نکلنے والا پھل ہے۔ مارکیٹ اور سرمایہ [Market & Capital] کی اصطلاحات سمجھے بغیر آپ ''ٹیکنو سائنس'' کی اصطلاح کی حقیقت سمجھ نہیں پائیں گے اور خلط مبحث کا شکار رہیں گے لہٰذا مکالمے کے پہلے مرحلے میں ہم ان دونوں اصطلاحات کی حقیقت بھی واضح کرنے کی کوشش کریں گے تاکہ ٹیکنالوجی کی تخلیق کے ضمن میں سائنس اور سرمایہ کے تعلق کو فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ سمجھ لیا جائے اور سرمایہ کو عام کرنے اور اسے ایک نظام زندگی کے طور پر مسلط کرنے کے ضمن میں مارکیٹ کے کردار کو بھی طشت از بام کردیا جائے۔

۴۔ جدید ٹیکنالوجی کا تعلق سرمایہ داری سے

جب ہم جدید ٹیکنالوجی کی بات کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ اس کا واحد مقصد سرمائے میں اضافہ اور ارتکاز ہوتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ارتکاز سرمایہ کا عمل خراج معاشرے [consumer society]، مسلسل صَرف کی حکمت عملی [Constant consumption]، لذت پرستی [Hedonism] اور افادہ پرستی [Utilitarianism] کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ لوگ لذت طلبی، افادہ

پرستی اور خراج معیشت کو جیسے جیسے قدر کے طور پر اختیار کرتے چلے جائیں گے ٹیکنالوجی کی ترقی تنوع اور رفتار میں لا محدود اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔جس قدر [Value] ،آزادی [Freedom]اور سرمایے [Capital] نے اس ٹیکنو سائنس کو جنم دیا ہے اس کے استعمال کے نتیجے میں اس تہذیب اور معاشرت میں آزادی اور سرمایہ سے متعلق اقدار و روایات ہی عام ہوں گی وہاں اسلامی اخلاق واقدار عام نہیں ہوسکتیں۔گزشتہ ایک سو برس کی تاریخ ہماری دلیل کی توثیق، تائید اور تصدیق کرتی ہے۔ دنیا کے تمام روایتی اور مذہبی معاشروں میں بھی ان کی اقدار ختم ہوگئیں اور آزادی وسرمایہ کی اقدار نے ان کی جگہ لے لی۔اصل سوال یہی ہے کہ اگر ٹیکنو سائنس غیر اقداری ہے تو یہ ہر مذہب، تہذیب اور معاشرت کی اقدار کیوں بدل دیتی ہے؟ اس لیے کہ جدید ٹیکنالوجی کا مقصد محض سرمایہ دارانہ نظام اور سرمایہ کی ترسیل اور ارتکاز میں مسلسل، مستقل اور لا متناہی اضافہ ہی ہے۔تو یہ بیان واضح کرتا ہے کہ جس شے کا آغاز سرمایہ کے بغیر ممکن نہیں ہے اس کا اختتام سرمایہ کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا لہٰذا ٹیکنو سائنس جب نظام سرمایہ داری کے بطن سے ظہور کرتی ہے تو صرف سرمایہ کی قدر ہی اس کے باطن میں پیوست ہوتی ہے۔اسے سرمایہ داری کے مقاصد سے مختلف یا اس سے متصادم مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ یہ متعین قدر [Guided Value] کے ساتھ اپنے سفر اور مرحلہ تخلیق کا آغاز کرتی ہے لہٰذا یہ ترقی کے سفر کے کسی لمحے میں بھی سرمایہ داری اور اس کی متعین اقدار سے الگ نہیں ہوسکتی۔

۵۔ جدید ٹیکنو سائنس کی اقدار

لہٰذا یہ مفروضہ کہ ہم صرف جدید مغربی ٹیکنالوجی یا ٹیکنو سائنس کے ہی مخالف نہیں ہیں بلکہ سترہویں صدی سے پہلے روایتی الہامی تہذیبوں میں موجود ٹیکنالوجی کے بھی خلاف ہیں ایک غلط خیال ہے اور ہم اس کی مکمل تردید کرتے ہیں۔ ہماری گفتگو کا ہدف صرف جدید ٹیکنالوجی یا ٹیکنو سائنس ہے جو اپنے آغاز سے ہی سرمایہ دارانہ علمیت ، سرمایہ دارانہ شخصیت ،سرمایہ دارانہ ما بعد الطبیعیات، سرمایہ دارانہ مقاصد ،اہداف، ارادوں اور سرمایہ دارانہ اداروں کے ذریعے صرف اور صرف حرص، ہوس، حسد، لذت پرستی، افادہ پرستی اور معیار زندگی میں مسلسل اضافے کے ذریعے آزادی کی بے کراں وسعتوں کو فروغ دینے اور دنیا بھر کو معیار زندگی کے مذہب ''آزادی'' [Religion of Freedom] کے تسلط کے لیے ایجاد کی گئی ہے۔ چونکہ جدید ٹیکنو سائنس غیر اقداری [Value

[Guided neutral] نہیں ہے بلکہ Value Lidden ہے لہذا خاص متعین مقاصد [Values] کے لیے ایجاد کردہ اس ٹیکنو سائنس کو کسی دوسری قدر [Value]، کسی دوسرے نظریہ حیات یا کسی اور مابعد الطبعیات کے ذریعے تبدیل کر کے سرمایہ دارانہ مابعد الطبیعیات کے سوا کسی دوسرے ما بعد الطبیعیاتی مقاصد کے لیے استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ اسلام الہامی نظریۂ حیات ہے اور اس کی ما بعد الطبیعیاتی اساسات جدید مغربی فلسفے اور جدید سائنس و ٹیکنالوجی کی مابعد الطبیعیاتی اساسات سے یکسر مختلف ہیں لہٰذا اسلامی الہیات و عقائد کی روشنی میں اسلامی تہذیب کے اندر ٹیکنالوجیکل ترقی کی وہ رفتار ممکن ہی نہیں جو سرمایہ داری کی اساس اور قدر پر قائم ٹیکنو سائنس کے منہاج میں ہر لمحہ ممکن نظر آتی ہے۔ اٹھارہویں صدی سے پہلے کی تہذیبوں میں ٹیکنالوجی انسانی ضروریات پوری کرنے کے لیے ایجاد ہوتی تھی لیکن ٹیکنو سائنس کا مقصد ضروریات کو پورا کرنا نہیں ضروریات کو تخلیق کرنا بلکہ لا محدود پیمانے پر تخلیق کرتے چلے جانا ہے تاکہ خراج معاشرہ [Consumer Society] بڑھتا اور پھیلتا رہے۔ اس طرح سرمایے کے چکر [Capital Circle] کے چلتے رہنے اور سہولتوں اور ٹیکنالوجی میں مسلسل ترقی کے نام پر لوگوں کو اربوں کھربوں ٹن کوڑا پیدا ہو گیا ہے اور جو کوڑا پیدا ہو رہا ہے اس کو ٹھکانے لگانے کے مسائل سنگین رخ اختیار کر چکے ہیں۔ ضرورت کے لیے کسی ایجاد کا ظہور پذیر ہونا اور ضروریات کی تخلیق کرنا دو مختلف کام ہیں مثلاً قلعے کی فصیلوں کو توڑنے کی ضرورت پیش آئی تو منجنیق ایجاد کر لی گئی مگر فصیل توڑنے کے فوراً بعد فصیلوں کو آناً فاناً تعمیر کرنے کی مشین ایجاد کرنے کا خیال لوگوں کو نہیں آیا۔ اہرام مصر تعمیر ہوئے مگر اہرام کی ٹیکنالوجی فروخت کر کے اس سے نفع کمانے اور اسے برآمد کرنے [Export] کا خیال کسی قلب میں نہیں پیدا ہوا۔ اس کا سبب ان تہذیبوں کا ما بعد الطبیعیاتی تناظر تھا جہاں مادی زندگی کل زندگی کا ایک حصہ تھی صرف مادی زندگی کو مکمل زندگی نہیں تصور کیا جاتا تھا۔

۶۔ جدید ٹیکنالوجی مغربی علمیت کا منطقی نتیجہ ہے

پروفیسر شاہد رشید صاحب کی اس رائے سے راقم کو اختلاف ہے نہ ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب کو کہ کسی معاشرے اور تہذیب میں پیدا ہونے والی ٹیکنالوجی اس تہذیب کی تہہ میں کارفرما فلسفۂ علم اور اس کے مخصوص تصور کائنات یعنی ما بعد الطبیعیاتی تصورات کی حامل ہوتی ہے اور یہی تصورات نہ صرف اس معاشرے کی بلکہ اس معاشرے کی تخلیقی سرگرمیوں کی صورت گری بھی کرتے

ہیں کیونکہ ٹیکنو سائنس اٹھارہویں صدی میں مغرب کے جدید فلسفے اور جدید تعقل کے غلبے کے زیر اثر وجود پذیر ہوتی ہے لہٰذا اس ٹیکنو سائنس میں مغرب کی مسلمہ اقدار آزادی اور ترقی کے سوا کوئی اور قدر داخل ہی نہیں کی جاسکتی اور اگر آزادی اور ترقی کے سوا کسی الہامی تہذیب کی کوئی قدر اس ٹیکنو سائنس میں داخل کرنے کی کوشش کی جائے گی تو ٹیکنالوجی کے غبارے سے ہوا ایک لمحے میں نکل جائے گی کیونکہ یہ ترقی صرف سرمایہ کے ساتھ ممکن ہے۔ سرمایہ اور سائنس کو الگ کرتے ہی جدید ٹیکنالوجی کا پھولتا ہوا غبارہ پھٹ کر سمٹ جائے گا لہذا اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ اسلامی تہذیب میں پیدا ہونے والی سائنس وٹیکنالوجی اور اس ٹیکنالوجی کا طریقہ اور اس کے مقاصد و اہداف مغربی فلسفے کے تحت پیدا ہونے والی سائنس وٹیکنالوجی سے یکسر مختلف ہوں گے۔ اسلامی تہذیب کی ٹیکنالوجی اسلامی مابعد الطبیعیات کے اصل مقصد [فکر آخرت اور معرفت رب] سے لازماً ہم آہنگ ہوگی اور جدید مغربی ٹیکنالوجی مغربی فلسفے کے مقاصد [آزادی اور ترقی کے اصولوں] سے ہم آہنگ ہوگی۔ یہ الگ بات ہے کہ کوئی مسلم مفکر یہ دعویٰ کر دے کہ انبیاء کی آمد کا مقصد بھی مادی ترقی اور آزادی میں مسلسل اضافہ تھا اور وہ معیار زندگی بلند کرانے کے لئے تشریف لائے تھے۔ لہٰذا اگر ٹیکنو سائنس میں الہامی ما بعد الطبیعیات داخل کر دی جائے تو اس کی ترقی ٹھٹھر کر رہ جائے گی اور ممکن ہے کہ ترقی کا عمل ہی منجمد ہو جائے۔ مثلاً جدید تباہ کن عسکری ہتھیار، نیوکلیئر ٹیکنالوجی، فلم، جمالیات، فیشن اور فوڈ کی صنعتیں، تفریح اور لذت پرستی کی صنعت [Entertainment Industry]، اشتہاری صنعت، [Advertisment]، سیاحت کی صنعت [Tourism Industry]، پلاسٹک سرجری، اسقاط حمل کی ادویات کی صنعت، نفسیاتی امراض اور امراض قلب سے متعلق مختلف صنعتیں اسلامی نظریہ حیات کے موثر اطلاق کے ساتھ ہی لمحوں میں ختم ہو جائیں گی۔

۷۔ مغربی ٹیکنالوجیکل ترقی کسی دوسری علمیت میں ممکن ہی نہیں

اگر مغرب میں آج سرمایہ کی لامتناہی بڑھوتری پر حدود نافذ کر دی جائیں تو یقیناً یہ پابندی ٹیکنو سائنس کی ترقی کی رفتار میں زبردست رکاوٹ پیدا کرے گی اور ایسی پابندی مغرب کے فلسفہ آزادی [Philosophy of Freedom] کے منافی ہوگی کیونکہ آزادی کے اظہار کے لامحدود طریقے ہیں لہٰذا آزادی کو کسی خاص طریقے سے اظہار کا پابند کرنا آزادی کے اصول اور قدر کے منافی رویہ ہے۔ اس فلسفے کی تشریح سمجھنے کے لیے اس صدی کے ایک بڑے سیاسی فلسفی John Rawls کی کتاب

Theory of Justice کا مطالعہ مفید رہے گا۔

روس میں ریاستی مداخلت کے بغیر آزادانہ مسابقت [Free Market] کے لبرل فلسفے کے بجائے جب سرکاری منصوبہ بندی [Planning] کے ذریعے ٹیکنالوجیکل ترقی کی بھرپور کوشش کی گئی تو کئی جہتوں میں یہ کوشش کامیاب ہونے کے باوجود فری مارکیٹ کے ذریعے وباء کی طرح پھیلنے والی ٹیکنالوجی کا مقابلہ کرنے میں مکمل ناکام رہی حالانکہ مغرب اور روس دونوں سرمایہ کے ذریعے آزادی، مساوات، ترقی اور معیار زندگی میں ٹیکنالوجی کے ذریعے مسلسل اضافے کی اقدار پر یکساں یقین رکھتے تھے لیکن لبرل سرمایہ دارانہ نظام ہر شخص کو اس کی صلاحیت یعنی قوت خرید کے مطابق مساوی طور پر [Each according to his effeciency] ٹیکنالوجی مہیا کرنے پر یقین رکھتا تھا جبکہ روس ہر شخص کو اس کی ضرورت کے مطابق [Each according to his needs] ٹیکنالوجی مہیا کرنے کے فلسفے پر عامل تھا لہٰذا لبرل سرمایہ داری میں جس تنوع، برق رفتاری، کمال فن اور جمالیاتی کشش کے ساتھ ٹیکنالوجیکل ترقی ممکن ہوئی غیر لبرل روس میں وہ ترقی نہ ہوسکی کیونکہ وہاں ٹیکنالوجی کی ترقی پر حکومتی تحدیدات عائد تھیں وہ مساوات کے اصول کے تحت ہر ایک کو ٹیکنالوجی مہیا کرتے تھے جس کے لیے لوگوں کو انتظار کرنا پڑتا تھا اور قطار میں کھڑا ہونا ضروری تھا جس سے ان کی آزادی متاثر ہورہی تھی۔ آزادی پر مساوات اور ضرورت کا اصول حد بندیاں عائد کررہا تھا۔ لبرل سرمایہ دارانہ نظام یعنی امریکہ و یوروپ میں جس کے پاس سرمایہ ہے وہ انتظار کے بغیر ٹیکنالوجی جب چاہے خرید سکتا تھا اور ریاست کا محتاج نہ تھا کیونکہ مارکیٹ آزادانہ عمل کے ذریعے ریاست سے بہتر انداز میں اسے ٹیکنالوجی مہیا کررہی تھی۔

۸۔ مغربی ٹیکنالوجیکل ترقی کا انحصار نظام سرمایہ داری پر ہے

لبرل سرمایہ دارانہ نظریۂ حیات کے سوا ٹیکنو سائنس کو کسی اور نظریۂ حیات [Ideology] اور مابعد الطبیعیات کی بنیاد پر مسلسل فروغ نہیں دیا جاسکتا حتیٰ کہ سرمایہ داری ہی کی شکل سوشلزم اور کمیونزم میں بھی غیر لبرل سرمایہ داری کے ذریعے ٹیکنالوجی کی محیر العقول ترقی کا خواب ناکام ہوگیا اور چین و روس کو آخر کار لبرل سرمایہ دارانہ نظام و نظم معیشت کے دامن میں پناہ لینا پڑی۔ دنیا کی کسی الہامی، روایتی اور دینی تہذیب میں مادی ترقی اور مسلسل ترقی کو کبھی ہدف، مقصد اور اصول کے طور پر اختیار نہیں کیا گیا۔ ان تہذیبوں میں یہ دنیاوی زندگی فانی تھی، مختصر تھی اور آخرت کی زندگی طویل اور ابدی ـــــ لہٰذا

جس زندگی کا سفر طویل تھا اس سفر کی تیاری بھی زیادہ تھی اور جس مادی زندگی کا سفر مختصر تھا اس زندگی کا سروسامان بھی بہت مختصر تھا اور اس سامان کی تیاری کے سلسلے میں کوششیں بھی نہایت مختصر اور ضرورت کے مطابق رہیں۔ لہٰذا دنیا پرستی، عیش پرستی اور افادہ پرستی کی ٹیکنالوجی کا فروغ مسلسل ان تہذیبوں کے نظریۂ حیات کے باعث ممکن ہی نہیں تھا۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ نظریۂ حیات کے سوا کسی اور نظریے کے ذریعے ٹیکنو سائنس کو فروغ دینا ممکن نہیں۔ چونکہ اسلام ایک الہامی دین ہے جس میں آخرت کی زندگی کو دنیا کی زندگی پر ہر حال میں ترجیح دی گئی ہے اور معرفت رب عبادت رب کے ذریعے ہی ممکن ہے اور اللہ نے انسانوں اور جنوں کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے لہٰذا اس تہذیبی، مذہبی، دینی، الہامی اور علمی تناظر کے ساتھ ٹیکنو سائنس کی شیطانی ترقی اسلام کے ساتھ کبھی ہم آہنگ نہیں ہوسکتی کیونکہ اسلامی علمیت آزادی، ترقی، سرمایہ داری اور معیار زندگی میں مسلسل اضافے کے مغربی مقاصد و اہداف پر مشتمل علمیت کا رد ہے لہٰذا اسلام کے تصور سائنس و ٹیکنالوجی کے تناظر میں عہد حاضر کی اندھا دھند فنی ترقی [Technological Development] کا امکان معدوم ہو جاتا ہے۔

۹۔ ترقی کا مفہوم کیا ہے؟

یہاں اس نکتے پر غور کی ضرورت ہے کہ Development & Progress کی اصطلاحات کیا اٹھارہویں صدی سے پہلے دنیا کی مختلف تہذیبوں کی علمیت اور لغت میں اصطلاحات کے طور پر مستعمل تھیں یا نہیں؟ Development Dictionary اس سلسلے میں حیرت انگیز معلومات مہیا کرتی ہے یعنی یہ لغت دلائل کے ساتھ جواب نفی میں دے گی۔ان دونوں اصطلاحات کی تاریخی حقیقت کا مطالعہ کیا جائے تو حیرت کے کئی دریچے کھلتے نظر آتے ہیں۔

''ترقی'' ایک حساس موضوع ہے جس کا مطلب صرف ''مادی ترقی'' ہے اور اس پر ایمان کے باعث ''ٹیکنالوجیکل ترقی'' کا سوال ہر مخلص مسلم ذہن میں لازماً پیدا ہوتا ہے لیکن صرف چند مباحث ترقی کی ماہیت، حقیقت، حیثیت اور اصلیت کا تعین کر دیتے ہیں مثلاً حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ کی پیدائش کسی ہسپتال میں نہیں ہوئی حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کسی میٹرنٹی ہوم میں نہیں بلکہ صحراء میں ہوئی۔ رسالت مآب ﷺ کی پیدائش بھی گھر میں ہی ہوئی۔ آپ ﷺ کے تمام بچے بھی گھر میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہویں صدی کے آخر تک اس امت کے اکابرین گھروں میں ہی پیدا ہوتے رہے

تو حضرت ابراہیمؑ سے رسالت مآب ﷺ تک تین انبیاء کی امتوں کے عہد میں ترقی کیوں نہ ہوسکی میٹرنٹی ہوم کیوں نہ بن سکے؟ یہ ترقی مغرب میں کیسے ممکن ہوگئی جب کہ وہاں عورت نہ گھر میں رہنے پر تیار ہے نہ شادی کرنے پر ـــ نہ شادی کے بعد بچے پیدا کرنے پر۔ تو اس تہذیب کو میٹرنٹی ہوم کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ انبیاء کی تہذیبوں میں آغا خان یونیورسٹی جیسا ہسپتال کیوں نہ بن سکا؟ حضرت موسیٰؑ کے عہد میں فرعون کی تہذیب میں بھی بچے کو دودھ عورت پلاتی تھی۔ اسلام آیا تو رضاعت کی ذمہ داری عورت کے سپرد کی گئی اور اٹھارہویں صدی سے پہلے ملت اسلامیہ بلکہ کل عالم ڈبے کے جعلی دودھ سے بے خبر تھا۔ انبیاء کی امتیں بچوں کے لیے مصنوعی دودھ کیوں تیار نہ کرسکیں؟ انبیاء کی تہذیبوں میں ایٹم بم اور تباہ کن ہتھیار کیوں تیار نہ ہوسکے؟ روایتی تہذیبیں بھی مہلک ہتھیاروں سے خالی رہیں اس لیے کہ ان کی مابعد الطبیعیات عہد جدید کے مغرب سے مختلف تھی۔ انبیاء کے مد مقابل تہذیبوں کی عظیم الشان عمارات اور شاہکار تعمیرات کے آثار و باقیات آج بھی محفوظ ہیں لیکن ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کے مادی آثار میں سے صرف دو عمارتیں محفوظ ہیں

ایک خانہ کعبہ کی چوکور پتھریلی عمارت اور دوسری حجرۂ نبوی جہاں تاریخ کے تین عظیم انسان ابدی نیند سو رہے ہیں لیکن ان انبیاء کا ذکر مشرق و مغرب میں صبح و شام جاری ہے۔ وہ قومیں جو انبیاء کے مد مقابل تھیں ان کے عظیم الشان مادی آثار اور سائنس و ٹیکنالوجی کے شاہکار آج بھی محفوظ ہیں مگر ان منکرین حق کا نام لیوا اس دنیا میں کوئی نہیں۔ اگر 'ترقی' انبیاء کے مقاصد و اہداف میں ادنی درجے کا بھی ہدف ہوتا تو یقیناً عاد، ثمود، سباء اور فرعون کی قوموں کے مد مقابل انبیاء ان قوموں جیسی سائنس و ٹیکنالوجی اختیار کرتے یا اس میں اضافہ کرتے مگر اضافہ تو کجا ان انبیاء نے تباہ شدہ قوموں کی سائنس و ٹیکنالوجی کو سرے سے اختیار ہی نہیں کیا۔ اگر وہ ایسا کرتے اور ترقی کے پہیے کو آگے بڑھاتے تو حضرت موسیٰؑ کی قوم بنی اسرائیل کے اہرام بھی روئے زمین پر محفوظ ہوتے۔ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ انبیاء تاریخ کے پہیے کو ہمیشہ پیچھے کی طرف موڑ دیتے ہیں۔ اسی لیے امت مسلمہ آج بھی آگے دیکھنے کے بجائے ہمیشہ پندرہ سو سال پیچھے کے عہد 'خیر القرون' کی طرف دیکھتی ہے اور جمعہ کے خطبے میں اسی عہد کو بہترین زمانہ کہتی ہے یہ بات یقینی ہے کہ مسافر اگر بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتا رہے تو اس کی رفتار سفر بہت کم ہو جاتی ہے اسی لیے انبیاء کی امتیں مادی فتوحات میں ہمیشہ اپنے مد مقابل کفار و مشرکین سے کمتر رہیں مگر ایمان کے معاملے میں نہایت برتر اور زرخیز۔

۱۰۔ مغربی ٹیکنالوجی اقدار کش ہے

ٹیکنو سائنس میں آزادی، ترقی اور مسلسل ترقی اور سرمایہ دارانہ اقدار کے سوا دوسری اقدار کو داخل کرنا ممکن نہیں ہے۔ٹیکنو سائنس آفاقی اور عالمگیر علم نہیں۔ یہ خاص تاریخ، تہذیب اور خاص زماں و مکاں میں محصور علم ہے جو اپنے مقاصد، اہداف اور تحدیدات سے ماوراء نہیں ہوسکتا۔ یہ معروضی نہیں موضوعی ٹیکنالوجی ہے۔ عالمی فلسفہ کانگریس کے صدر ہزرل نے ۱۹۲۴ء میں اس سائنس کو یورپی سائنس قرار دے کر اس پر نقد کیا تھا۔اس کی کتاب "Crises of European sciences" کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کے شاگرد ہائیڈیگر نے ۱۹۲۶ء میں اپنی کتاب "An Essay Concerning Technology" میں اس ٹیکنالوجی کے ہاتھوں دنیا کی مسخ ہونے والی تصویر کی نشان دہی کردی تھی۔آج بھی مغرب میں بے شمار فلسفی مفکرین ٹیکنو سائنس کو غیر اقداری تصور نہیں کرتے اس ضمن میں درج ذیل مصادر کا مطالعہ مفید رہے گا:

۔*Looking back towards Progress,* Perwaiz Manzoor.

۔*The Limits of Technology,* Charles Tilly.

۔*Ten Astonishing facts about Technology.*

۔*Technology and its Problems,* Illule.

۔*The Constitution of liberty*, Hiac

۔*Philosophy - An Introduction,* Berry Vincint

۔*Post Modern Conditions,* Leyotard

۔*One Dimensional Man,* Marcuze

۔*Insane Society,* Mozzalis

۔*Risk Society,* Arec Fromm

۔*Habits of the Heart,* Danial Bell

۔*The Logic of Social Sciences,* Hebermass

۔*The Order of things: The Archeology of Knowledge,* Focualt

۔*Cotegency Irony and Solidrity,* Rorty

۔*False Dawn,* John Gray

۱۱۔ ٹیکنو سائنس اور سرمایہ داری کا مطالعہ

ٹیکنو سائنس اور سرمایہ داریت کے تعلق خصوصی کے سلسلے میں درج ذیل کتب کا مطالعہ فائدہ مند رہے گا:

۔ *Cultural Contradictions of Capitalism,* Richard Bela

۔ *The Confessions of an Economic Hit man,*

۔ *The Corporation*

۔ *The Beauty Myth*

۔ *History of Economic Thought,* Shoumpter

۔ *The Revival of Market Society,* Hershman

۔ *Capitalism - A Schezofranic Life Style,* Deluze

۔ *Thousands plautos* Vol. I

۔ *Anti Edipus* Vol. II

۔ *The Rise of Islamic Capitalism,* Dr. Wali Raza Nasar

۱۲۔ عالم اسلام اور مغربی ٹیکنالوجی

عالم اسلام میں ایک مغالطہ بہت عام ہے کہ 'اگر ہمارے پاس مغرب کی ایجاد کردہ ٹیکنالوجی نہیں ہوگی تو ہم مغرب کا عسکری مقابلہ کیسے کریں گے؟' گویا عالم اسلام کا ہر فرد حالت جہاد میں ہے، ہر حکومت جہاد کے لیے بے تاب ہے، لوگ جہاد کے لیے مچل رہے ہیں اور لشکر راستے میں بزن کے منتظر ہیں مگر اس جہاد میں اصل رکاوٹ ٹیکنالوجی سے محرومی ہے لہٰذا ٹیکنالوجی سے عشق اسلام کے دفاع کے لیے شروع ہوتا ہے اور ہم دفاعی اور اقدامی عسکری ٹیکنالوجی کی بجائے صرف بڑھتی ہوئی ضروریات زندگی اور تعیّشات زندگی میں اضافے کی ٹیکنالوجی کا دفاع اس اصول کی بنیاد پر کرنے لگتے ہیں کہ اس میں کیا ہرج ہے؟ حرام تو نہیں ہے؟ منع تو نہیں کیا گیا ہے؟ خوش حال پُر تکلف اور آرام دہ زندگی بسر کرنے میں کیا ہرج ہے؟ سوال یہ ہے کہ یہ ٹیکنالوجی کس قیمت پر حاصل ہوتی ہے؟ اس کی قیمت Algor کی کتاب *An Inconvenient Truth* میں پڑھی جاسکتی ہے۔ اس کی مزید تفصیل Penguin کی کتاب *The Waste* میں پڑھی جاسکتی ہے ماحولیات پر کوپن ہیگن کانفرنس ۲۰۱۰ء کی روداد انٹرنیٹ پر ملاحظہ کی جاسکتی ہے جو حیرت کے کئی جہانوں کے دریچے کھول دے گی۔

مشہور امریکی مورخ Jared Diamond کی کتاب *How Socities Chose to Fail or Survive?* کا باب بارہ جوچین کی بظاہر عظیم الشان ترقی سے متعلق ہے اوراس ترقی کی جو بھیانک قیمت چین نے ادا کی ہے اورصرف چین نہیں بلکہ چین کے ساتھ تقریباً پوری دنیا اور ایشیا خصوصی طور پراس کی قیمت ادا کر رہا ہے، اس کا مطالعہ کافی ہے۔

عالم اسلام کی وہ حکومتیں جو بنیادی حقوق کے منشور پر دستخط کر چکی ہیں، ان ریاستوں کا غالب قانون اصولاً اور عملاً اب اسلام نہیں آزادی اور نظام سرمایہ داری ہے اور سرمایہ دارانہ ریاست سرمایے میں اضافہ کے لیے تو جہاد کرسکتی ہے اللہ کے لیے جہاد اس ریاست میں ممکن ہی نہیں ہے۔ حقوق انسانی کے منشور پر دستخط کرنے والی دنیا میں کوئی ایسی مسلم ریاست نہیں جو مغرب یا امریکہ سے اقدامی جنگ کرنا چاہتی ہو لیکن ٹیکنالوجی کے باعث جنگ نہ کرنے پر مجبور ہوگئی ہو۔ زیادہ سے زیادہ ایک آدھ مسلم ملک مغرب کی جانب سے حملے کے پیش نظر اپنے دفاع کے لئے فکرمند ہوسکتا ہے لہٰذا اسے دفاعی ٹیکنالوجی کی ضرورت رہے گی لیکن مغرب نے جو عسکری ٹیکنالوجی ایجاد کی ہے وہ دفاعی سے زیادہ اقدامی ہے۔ وہ فتح کے لئے ایجاد نہیں کی گئی تباہی و بربادی (Mass Destruction) کے لئے ایجاد ہوئی ہے۔ عسکری صنعتوں کی پیداوار [Armed Industries Production] اقدامی جنگ کے لئے تخلیق ہو رہی ہے اور عالم اسلام کسی اقدامی جنگ کا تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اسلامی ممالک کی فوجیں عموماً اپنے ہی شہریوں کے خلاف اقدام کرتی ہیں۔ ان کی تمام عظیم انسانی فتو حات کا دائرہ اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف اور اپنی سرحدوں پر محیط ہے۔ تو مسئلہ ہے دفاع کا اور دلیل دی جارہی ہے اقدامی جنگ کے ہتھیاروں کے حصول کی۔ گزشتہ سوسال کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جن ممالک نے ٹیکنالوجی پر زیادہ انحصار کیا وہ کسی بڑی جنگ لڑنے کے قابل نہیں رہے لیکن نہایت پست اور کمتر ٹیکنالوجی کے حامل ممالک نے اپنے سے بہتر اور برتر ٹیکنالوجی والے ممالک کو شکست دی ہے۔ لاطینی امریکہ، کمبوڈیا، صومالیہ، عراق، ویت نام، افغانستان، فلسطین میں کمتر ٹیکنالوجی والوں کو عالمی طاقتیں شکست نہیں دے سکیں۔ ماضی میں بھی یونان کی ایک چھوٹی ریاست کے سپہ سالار مقدونیہ کے سکندر نے اکیس سال کی عمر میں ایران جیسی عظیم الشان سلطنت پر حملہ کیا اور اسے عبرتناک شکست دی، بادشاہ کو قتل کر دیا اور ایرانی فوج کو تہس نہس کر دیا لیکن ایران کو شکست دینے والے سپہ سالار کو جہلم کی چھوٹی سی ریاست کے راجہ پورس کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ سکندر کی فوج

نے دریائے جہلم پار کرنے سے انکار کردیا وہ سندھ اور عراق کے راستے بابل پہنچا اور وہاں پہنچتے ہی مرگیا۔ عباسی سلطنت 'بیت الحکمت' اور تمدنی ترقیات کے باعث تاتاریوں کے مقابلے میں نہایت متمدن ترقی یافتہ ریاست تھی لیکن ٹیکنالوجیکل برتری کے باوجود تاتاریوں جیسی جاہل قوم نے انھیں شکست دے دی۔ اندلس میں سائنسی ترقی کے باوجود سائنس مسلمانوں کے زوال کو نہیں روک سکی اور عیسائیوں نے ہسپانیہ کے حصے بخرے کردیے، مسلمانوں کا قتل عام کیا اور انھیں بے دخل کردیا۔ سرزمین اندلس آج اذان کی آواز سے بھی محروم ہے۔ روس کے پاس مغرب سے بہتر ٹیکنالوجی تھی۔ اس نے سائنس کے مختلف میدانوں میں مغرب سے پہلے اقدامات کیے۔ خلائی ٹیکنالوجی میں وہ امریکہ سے آگے تھا لیکن اس کی ٹیکنالوجیکل ترقی اسے زوال سے نہیں بچا سکی۔ اسے امریکہ نے میدان جنگ میں شکست نہیں دی بلکہ اسے اپنی تہذیب، ثقافت، معیار زندگی، فری مارکیٹ اور اپنے لبرل نظریے کی قوت سے اسے شکست دی۔ روس کے لوگ امریکی ڈبل روٹی اور چپس کے انتظار میں رہنے لگے تھے۔ مشرقی یورپ کو مغرب نے تلوار، یلغار اور خون خرابے سے نہیں نظریاتی محاذ پر شکست دی اور دیوار برلن گرادی۔

امتوں، تہذیبوں اور قوموں کا اصل مقابلہ عسکری میدان میں نہیں نظریاتی میدان میں ہوتا ہے۔ نظریہ اگر زندہ ہے طاقت ور ہے تو دو چار عسکری شکستوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جس طرح عباسی سلطنت تاتاریوں اور باطنیوں سے شکست کھانے کے باوجود دوبارہ زندہ ہوگئی کیونکہ تاتاری اور مصر کے فاطمی ایمان، عقلیت اور علمیت کی سطح پر عباسیوں کی دینی علمیت کو شکست نہیں دے سکے لہٰذا عباسیوں کی دونوں شکستیں آخر کار فتح میں تبدیل ہوگئیں۔ خوارزم شاہ اور عباسی سلطنتیں تہذیبی، تمدنی، عسکری سائنسی اور ٹیکنالوجی کی سطح پر تاتاریوں سے بہتر تھیں مگر ان کی ٹیکنالوجی انھیں بچا نہیں سکی۔ تاتاریوں نے گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر اپنی تلواروں سے اسلامی سلطنت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ تاتاری سادہ اور جنگ جو تھے جبکہ مسلمان عیاش تھے اور تاتاری سیل رواں کے سامنے تنکوں کی طرح بہہ گئے۔ برعظیم پاک و ہند میں انگریز، فرانسیسی اور ولندیزی وارد ہوئے تو ہندوستان کے مسلمان انھیں بے دخل نہیں کرسکے کیونکہ وہ عیش و عشرت کی زندگی میں مبتلا تھے اور لڑنے کی صلاحیت ہی کھو چکے تھے۔ ٹیکنالوجیکل سطح پر انگریزی فوج ان سے بہتر اور برتر نہیں تھی۔ وہ سات سمندر پار سے گرم علاقوں میں آئے تھے۔ ان کے لیے کمک کا موثر انتظام بھی نہیں تھا اور وہ تعداد میں بھی بہت کم تھے۔

اجنبی ملک، نا قابل برداشت موسم اوراجنبی زبان کے باوجود وہ یہاں آئے۔ انہوں نے ٹیکنالوجی کی بنیاد پر مسلمانوں کو شکست نہیں دی۔ سراج الدولہ کے لشکر میں ایک لاکھ سپاہی تھے مگر لشکر نے انگریز فوج سے جنگ ہی نہیں کی۔ صرف سراج الدولہ کے ایک وفادار ہندو سپہ سالار کے مختصر لشکر نے انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ ترکی کی مثال سامنے ہے۔ برطانیہ ترکی کے مقابلے میں عالمی طاقت تھا، ایک ایسی سلطنت جس کی حدود میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا، ترکی پر اسے ٹیکنالوجیکل برتری بھی حاصل تھی لیکن مصطفےٰ کمال اتاترک کی قیادت میں ترک قوم نے برطانوی فوج کو عبرت ناک شکست دی اور سمندر انگریزی فوج کے خون سے رنگین کردیا۔ حالیہ سالوں میں بوسنیا کی جنگ اس کا تازہ ثبوت ہے۔ سربوں کو یورپی ممالک کی جانب سے مکمل مالی، عسکری اور ٹیکنالوجیکل امداد مل رہی تھی۔ بوسنیا والے مسلسل شکست کھا رہے تھے اور امریکہ، NATO اور UNO بوسنیا کی مدد پر آمادہ نہیں تھے۔ اس موقع پر پوری دنیا سے مسلم مجاہدین بوسنیا میں جمع ہوئے اور تھرڈ بریگیڈ کی صورت میں انھوں نے جدید ٹیکنالوجی کی حامل سرب فوج کا صفایا شروع کیا۔ وہ اقدام کرتے ہوئے سربوں کو شکست سے دوچار کرنے والے تھے لہٰذا سربوں کو شکست سے بچانے کے لیے نیٹو نے اپنی فوجیں اتاردیں اور امریکہ نے فضائی حملے شروع کردیے۔ لہٰذا یہ خیال کہ ٹیکنالوجی کی کمی یا کم زور ٹیکنالوجی ہمیں دفاع یا اقدام کے قابل نہیں رہنے دیتی غلط خیال ہے۔ گوریلا جنگ کے ماہرین اور اس موضوع پر تحریر کی گئی کتابوں سے سے معلوم ہوتا ہے کہ دس ہزار گوریلا سپاہی سو سال تک جنگ لڑ سکتے ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ عالم اسلام کسی جہاد کے لیے تیار بھی ہے؟ افغانستان میں جنگ کا آغاز کرتے ہوئے بش نے کہا تھا ہم ایک تاریک غار میں بھی جمہوریت کی شمع روشن کریں گے، طالبان دہشت گرد ہیں، ان سے آخری آدمی، آخری گولی آخری قطرہ خون تک جنگ ہوگی لیکن ۲۰۱۱ء میں امریکی صحافی کی معرکہ آراء کتاب *Obama Wars* کے ذریعے دنیا کو بتایا جارہا ہے کہ ہمیں طالبان اور القاعدہ میں فرق کرنا چاہیے۔ طالبان سے مذاکرات کی میز پر معاملات طے کیے جائیں۔ طالبان سے سیاسی مفاہمت کے لیے امریکہ مسلسل خاموش سفارت کاری کے محاذ پر مستقل کام کررہا ہے۔ طالبان کو امریکہ عسکری میدان میں زبردست ترقی کے باوجود شکست نہیں دے سکا لہٰذا ٹیکنالوجی سے محرومی کے خوف میں مبتلا ہونے کا کوئی فائدہ نہیں۔ نہ ہی اس خوف کی تاریخی وجوہات تلاش کی جاسکتی ہیں۔ یہ خود ساختہ اور خود مسلط کردہ خوف ہے جو مغلوبیت کے باعث پیدا ہورہا ہے۔

۱۳۔ ٹیکنالوجی پر تنقید کا مقصد

جب ہم سائنس اور ٹیکنالوجی پر تنقید کرتے ہیں تو لوگوں کو پتھر کا زمانہ یاد آنے لگتا ہے۔ کسی کو اونٹ کی پیٹھ نظر آتی ہے کہ یہ لوگ ہمیں دور ظلمات میں واپس لے جانا چاہتے ہیں حالانکہ سائنس اور ٹیکنو سائنس پر تنقید کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ لوگ تنقید پڑھتے ہی تمام اشیاء کا استعمال ترک کردیں اور ایک نئی زندگی کا آغاز کریں بلکہ سائنس پر تنقید کا مقصد یہ ہے کہ لوگ سائنس کو ایک مقدس گائے نہ سمجھیں، سائنسی علم کو محترم، عظیم الشان، ناقابل تنقید اور معصوم علم وفن کا درجہ نہ دیا جائے، اس کی وہ عزت، تکریم، تحریم اور اکرام واحترام نہ کیا جائے جیسے یہ کوئی صحیفہ آسمانی ہے۔ اسے علم کے بجائے فن Art & Craft کے درجے میں رکھا جائے یہ کام چلانے کا علم ہے اسے صرف کام چلانے کے قابل ہی سمجھا جائے۔ اسے دوسرے علوم خصوصاً علوم نقلیہ کو پرکھنے کا پیمانہ نہ بنایا جائے۔ سائنس کے آگے سجدہ کرنے سے انکار کردیا جائے۔ اس کا اس شدت وحدت سے ناقدانہ جائزہ لیا جائے جس طرح کفار ومشرکین انبیاء کرام کے پیغام اور دعووں کا جائزہ لیتے تھے اور بہت کچھ سمجھ میں آجانے کے باوجود انبیاء کو قبول کرنے سے انکار کردیتے تھے۔ ان کا ایمان ہم سے بہتر تھا کہ وہ اپنے پرانے غلط سلط ایمان کی خاطر انبیاء کے منکر تھے۔ ہمارا حال یہ ہے کہ علوم نقلیہ اور علوم عقلیہ میں سے کسی ایک کے انتخاب کی آزادی ہو تو ہم علوم نقلیہ کو حقیر سمجھ کر رد کردیتے ہیں اور علوم عقلیہ کو بخوشی اختیار کرتے ہیں کہ یہ ہماری مادی بہتری کے لیے کارآمد ہے سائنس پر نقد اس ذہنیت کا قلع قمع کرنے کے لیے اہم ہے (جاری ہے)۔

ٹیکنالوجی اور ٹیکنو سائنس (۲)

جدید سائنس اور سرمایہ داری کا باہمی تعلق

۱۴۔ الٰہی مابعد الطبیعیات اور مادی مابعد الطبیعیات

اٹھارہویں صدی میں مغرب نے علیت کو مابعد الطبیعیات پر فوقیت دے کر علیت کے ذریعے مابعد الطبیعیات اخذ کرنے کی روایت قائم کی جس کے نتیجے میں ایک نئی مابعد الطبیعیات وجود میں آئی جس میں انسان ہی مرکز کائنات قرار پایا۔ وہی علم کا ماخذ، منبع اور سرچشمہ ٹھہرا۔ وہ کسی خارجی ذریعہ علم کا محتاج نہیں رہا۔ علم کا مرکز اس کائنات کے باہر عالم اکبر نہیں اس کائنات کے اندر اور خود عالم اصغر انسان کے اندر منتقل ہوگیا اور حصول علم کے لیے انسان کا رشتہ تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ آسمان سے، خارج سے، باہر سے منقطع ہو کر عالمِ ارذل و اسفل سے جوڑ دیا گیا۔ اس جعلی مابعد الطبیعیات [Pseudo metaphysics] کے نتیجے میں کائنات کا محور حقیقت مطلق، حقیقت الحقائق، حقیقت اولیٰ، اور اللہ کے بجائے اب صرف اور صرف انسان قرار پایا لہٰذا آزادی کے نام پر انسان پرستی کے فلسفے نے جگہ لی جس کی مختلف شکلیں انفرادیت پرستی، مادہ پرستی، نتائجیت پرستی، لذت پرستی، سرمایہ پرستی وغیرہ وجود میں آئیں۔

۱۵۔ ٹیکنو سائنس اسلامی مقصدِ حیات کو ہرگز پورا نہیں کرسکتا

خلافت عثمانیہ کے زوال کے بعد عالمِ اسلام کا اصل مسئلہ نفوس کا تزکیہ، تطہیر قلب، طہارت نفس، معرفت رب اور فکر آخرت کے بجائے صرف اور صرف فکر دنیا ہے یعنی اس زندگی کو کیسے بسر کیا جائے اس میں سہولتیں، لذتیں اور آرام کی کہکشاں کیسے سجائی جائے۔ اکیسویں صدی کی مسلم امت ٹیکنالوجی کی بے دریغ حمایت کے ذریعے اپنے اُس ارادے کا اظہار کرتی ہے کہ وہ دنیا فرعون کی طرح بسر کرے لیکن اس کا آخرت میں انجام حضرت موسیٰؑ کی طرح ہو۔ جو لوگ پیغمبروں کے ساتھ اپنا انجام چاہتے ہیں انھیں پیغمبروں کا طرزِ زندگی اختیار کرنا پڑے گا یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ دنیا فرعون کی اتباع میں بسر کریں اور ان کا انجام پیغمبروں کے ساتھ ہو۔ اس خواہش کا دوسرا نام مغرب و مشرق میں پُل کی تعمیر،

مشرق و مغرب میں مکالمہ، مشرق و مغرب میں مفاہمت، ہم آہنگی، مشترکہ عناصر کی تلاش ہے۔ عالمِ اسلام یہ چاہتا ہے کہ مغرب نے دنیاوی لذتوں اور سہولتوں کے لئے جو ٹیکنو سائنس ایجاد کی ہے اس کی تمام مصنوعات وہ حاصل کرلے لیکن اس کے اندر اسلام کی روحانیت داخل کردے۔ لیکن انھیں نہیں معلوم کہ ٹرائے کی جنگ کے ٹروجن ہارس [Trogen Horse] کے پیٹ میں اس تہذیب کی مابعد الطبیعیات، تاریخ اور فلسفے کا لشکر چھپا ہوا ہوتا ہے جس تہذیب نے وہ گھوڑا تخلیق کیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ گھوڑا کوئی بھی تخلیق کرلے ہم اس پر بسم اللہ پڑھ کر سوار ہوتے ہوئے اسے اپنی اقدار کے مطابق ڈھال لیں گے۔ ٹیکنو سائنس کی ایجادات غیر اقداری نہیں ہوتیں، یہ خالص اقداری ہوتی ہیں۔ یہ تلوار، چھری یا خنجر یا نشتر نہیں ٹیکنو سائنس ہے اس میں سرمایہ داری کے سوا کوئی اور قدر داخل نہیں کی جاسکتی۔

۱۶۔ ٹیکنالوجی کی وجودی اقدار کو بدلا نہیں جاسکتا

کسی بھی ٹیکنالوجی میں قدر اس کے خیالی تصورِ تعمیر، تشکیل، تخلیق [Creation Process] کے وقت تو داخل کی جاسکتی ہے لیکن جب وہ ایجاد تیار ہوکر بازار میں فروخت [Cosumption Purpose] کے لئے آجائے تو اس موقع پر اس بنی بنائی ڈھلی ڈھلائی ٹیکنالوجی کو اسلام کی روحانیت میں ڈھالنے کا عمل یا خواہش، آرزو، جستجو اور گفتگو مشق رائیگاں ہے۔ مثلاً موبائل فون بن گیا۔ یہ کیوں بنا، کیسے بنا، کس لئے بنا، کس نے بنایا، کتنے کھرب روپے خرچ کرکے بنایا، اس کے لئے امریکی محکمہ دفاع (پینٹاگون) نے کتنے کھرب کی سرمایہ کاری کی؟ یہ تمام مباحث فون استعمال کرنے والے فرد، قوم، تہذیب کے لوگوں کے لئے عموماً اجنبی اور غیر مانوس ہی رہتے ہیں لیکن وہ اس میں اذان، نعت، تلاوت کی آوازیں ڈال کر یہ سمجھتے ہیں کہ انھوں نے اس آلے کی مادیت کو روحانیت سے بدل دیا۔ وہ اس بات پر غور نہیں کرتے کہ موبائل فون میں ان چیزوں کے داخل اور شامل ہونے سے اس کی مابعد الطبیعیاتی ساخت، رخ، نہج پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہ تو محض اضافی کام ہے جو وہ اس ایجاد کے ساتھ کررہے ہیں اس اضافی کام [Addition] سے فون کی قدر میں کوئی اضافہ [Value Addition] نہیں ہورہا نہ فون کی اقدار بدل رہی ہیں کیونکہ قدر تو ایجاد کے تخیل کے ساتھ ہی اس میں باطنی طور پر سمو دی گئی اسے خارجی ذریعے سے سمونا محال ہے۔ اس فون کی قدر [Value] آزادی اور سرمایہ کا ارتکاز ہے لہٰذا فون میں اذان، نعت، تلاوت کی آوازیں شامل کرنے والا ان اسلامی لاحقوں سابقوں کے ساتھ آزادی اور ارتکاز سرمایہ کے مابعد الطبیعیاتی عمل میں بھی

شریک ہے۔ وہ اس نظام کا حصہ ہے اس کی شخصیت، اسلامیت، روایت اس نظام میں آج نہیں تو کل تحلیل ہوجائے گی یہ اقداری ایجاد [Value Loaded Invention] اسے اس کے خاندان اوراس کی نسلوں کو اس طرح بدل [Transform] کر رکھ دے گی کہ کسی کو اندازہ ہی نہیں ہو سکے گا مثلاً موبائل فون استعمال کرنے والا جہاں مدعو ہوتا ہے، جس دعوت میں مہمان کے طور پر شریک ہوتا ہے اسلامی آداب کے تحت مہمان و میزبان کی مجلس اور ان کے تخلیے میں کسی کو میزبان کی اجازت کے بغیر داخل ہونے کی اجازت نہیں کیوں کہ یہ اس کے وقت اور خرچ کا زیاں ہے لیکن آپ مہمان کسی اور کے ہوتے ہیں میزبان تخلیے میں آپ سے ہم کلام ہوتا ہے اور آپ اس کی اجازت کے بغیر اس کی موجودگی میں موبائل فون پر اپنے کئی مہمانوں کی میزبانی کا فریضہ اپنے میزبان کے قیمتی اوقات میں انجام دیتے ہیں۔ گفتگو اور خیالات کا تسلسل اس مداخلت کے باعث بار بار ٹوٹتا ہے۔ میزبان نے خود کو آپ کے لیے فارغ کیا لیکن آپ خود کو کسی اور کے لیے وقف فرما رہے ہیں۔ پلاسٹک کے ایک کھلونے نے صدیوں کی روایت، اسلامی اخلاقیات اور اصول وآداب لمحوں میں تبدیل کر دیے مگر بدل جانے والے کو احساس تک نہیں ہوا۔ مسجد میں لوگ نماز پڑھنے جاتے ہیں حتیٰ کہ حدود حرم اور روضۂ نبویؐ کے اندر بھی وہ اس فون کی آواز بند کرنا بھول جاتے ہیں۔ اکثر یہ آوازیں موسیقی کی ہوتی ہیں۔ فون ان کو دنیا سے اس طرح جوڑتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہوتے ہوئے دنیا سے دوری گوارا نہیں کرتے۔ خانۂ کعبہ میں حاضری کے باوجود وہ حضوری کی لذت سے نہ صرف محروم رہتے ہیں بلکہ دوسروں کی لذت حضوری میں بھی اپنی حرکات سے خلل پیدا کرتے ہیں۔ اکثر مذہبی لوگوں کو دیکھا گیا کہ وہ نماز ختم ہونے کے فوراً بعد دعا سے پہلے فون نکال کر پیغامات پڑھتے ہیں یا نماز پڑھتے ہی، دعا مانگے بغیر، فوراً باہر نکل کر بات شروع کر دیتے ہیں۔ نماز کے دوران فون کی آواز بند کرتے ہیں مگر پیغامات وصول کرنے کا نظام کھلا رکھتے ہیں۔ جب بھی پیغام وصول ہوتا ہے ایک خفیف سی آواز مسجد کے مقدس ماحول کو مکدر کر دیتی ہے۔ دوسرے معنوں میں ہم جب اذان کی آواز سن کر مسجد کی طرف چلتے ہیں تو ہم اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنے والے چند لمحات میں بھی دنیا سے تعلق منقطع نہیں کرنا چاہتے لہٰذا عموماً نمازی موبائل فون مسجد میں بھی کھلے رکھتے ہیں خواہ ان کی آواز بند [Silent] ہو۔ دنیا سے تعلق کی یہ نوعیت کہ آدمی اپنے رب سے راز و نیاز کے وقت بھی دنیا سے بے نیاز نہ ہو سکے اس بات کا ثبوت ہے کہ ٹیکنو سائنس آخرت پر دنیا کے غلبے کو ممکن بناتی ہے۔ انسان دنیا کو اس کے ذریعے اپنی عبادت گاہ میں اور خلوت و تنہائی میں بھی لے آتا ہے کیا یہ عمل مادیت پرستی

کی تعریف میں نہیں آتا؟ اکثر لوگ مسجد کے اندر ہی دعا کے بعد اپنے ہاتھ موبائل فون تک پہنچا دیتے ہیں۔ کئی مرتبہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ نماز کے لیے مسجد میں آرہے ہیں جماعت کھڑی ہورہی ہے مگر فون پر آخری ہدایات دی جارہی ہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سنّتوں کے وقفے میں کوئی پیغام موصول ہوا تو فوراً مسجد سے باہر نکل کر گفتگو شروع ہوجاتی ہے۔ بہت سے نیک نفوس باہر جا کر بات چیت کے بجائے وہیں بیٹھے بیٹھے جوابی پیغام روانہ کردیتے ہیں۔ یہ اعمال اب عام مساجد سے لے کر بیت اللہ اور مسجدِ نبویؐ تک وبائے عام کا درجہ اختیار کر چکے ہیں، تو کیا ٹیکنالوجی نے ہماری اقدار، روایات، رویوں، صدیوں کے معمولات پر کوئی اثر نہیں ڈالا؟ اس اثر کو روکنے کی کوئی ٹیکنالوجی ہمارے لوگوں نے ایجاد کی ہوتو وہ پیش کی جائے مغرب نے بینکوں میں ڈکیتیوں کو روکنے کے لئے ایک نظام وضع کیا ہے جس کے تحت بینک میں داخل ہوتے ہوئے اگر آپ موبائل فون بند کرنا بھول جائیں تو اس کا حافظہ [Memory] سلب کرلیا جاتا ہے اور اس کے اعمال[Functions] بینک کی عمارت کے اندر معطل کردیے جاتے ہیں۔ SMS کے ذریعے آپ کی آزادی اور تخلیے میں بلا وجہ ہر شخص، ادارہ اور کمپنی دخل اندازی کرتے رہتے ہیں۔ آپ کو وہ خبریں اور وہ لوازمہ بھی پڑھنے پر مجبور کردیا جاتا ہے جن کا ذکر سننا آپ کو گوارا نہیں ـــــ اس جبر کا نام آزادی ہے اور یہ آزادی سب کو پسند ہے۔ موبائل فون استعمال کرنے کے اسلامی آداب پر کتابچے شائع کیے جارہے ہیں۔ قرون وسطیٰ میں طبعی علوم (Sciences) ایک قلیل گروہ کی دلچسپیوں کا مرکز تھے۔ تین سال کی عمر کے بچے سے لے کر اسّی سال کے بوڑھے کو ان علوم کی جبری تعلیم نہیں دی جاتی تھی۔ جو ان علوم میں دلچسپی لیتا اسے روکا بھی نہیں جاتا تھا لیکن ریاست ، حکومت، معاشرت اور معاشرے کی تمام قوتیں ، جہتیں اور توانائیاں صرف طبعی علوم[Physical Sciences] کے لیے وقف نہ تھیں لوگ اساسی نقلی علوم [Real Knowledge] کو اہم ترین سمجھتے تھے اور آخرت کو بہتر بنانے والے علوم پر ان کی توجہ مرکوز تھی لہٰذا طبعی علوم میں اگر محیر العقول ترقی کے مظاہر و مناظر ہمیں روایتی تہذیبوں میں نظر نہیں آتے تو اس کا سبب اس عہد کے مابعد الطبیعیاتی تناظر کا جدید مغرب کے جعلی مابعد الطبیعیاتی تناظر [Pseudo Metaphysical Perspective] سے یکسر مختلف ہونا ہے۔

۱۷۔ ٹیکنو سائنس آخرت کی نفی کرتی ہے

قدیم تہذیبوں میں دنیاوی، مادی، عقلی اور حسی علوم کی تقلیل کا رویہ تھا جبکہ جدید مغرب کی ذہنی کیفیت اس کے برعکس مذہب کی تقلیل بلکہ مذہب سے انحراف اور مذہب کے مکمل اخراج سے عبارت

ہے۔ ٹیکنو سائنس کے ذریعے ہر ممکنہ حد تک مذہب کا دائرہ محدود اور تنگ کر کے اسے باقی زندگی سے اس طرح علیحدہ کر دیا گیا ہے کہ اس کا کوئی اثر زندگی پر باقی نہیں رہا۔ٹیکنو سائنس پر مبنی طرزِ زندگی جدید انسان کو حق کی سطح تک بلند کرنے کے بجائے حق کو اپنی سطح تک کھینچ لانے کا جذبہ پیدا کر دیتا ہے۔الحق عہد حاضر پر اثر انداز ہونے کے بجائے اس کے سامنے سپر انداز ہو جاتا ہے۔ ہر شخص اور اصول کا ٹیکنو سائنس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا اور خود کو اس کے سپرد کر دینا اور سپردگی، بندگی اور فریب خوردگی عقل کا تقاضا اور ایمان کا معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ہم خود کو جدید سہولیات پر مبنی معاشروں کے باعث نہایت خوش قسمت تصور کرتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ہم ایک ایسی تنگ و تاریک، بے جہت، بے سمت، یک رخی اور اندھی دنیا میں زندہ ہیں جہاں اندھے ہی اندھوں کی رہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔اور اگر ان رہنماؤں کو اس موقع پر نہ روکا گیا تو وہ دنیا کو پاتال میں پہنچا دیں گے ۔ عالمِ اسلام میں جدیدیت ،مغربیت،ٹیکنو سائنس کے حامی اکثر لوگوں کی حالت فی الحقیقت اس سے مختلف نہیں ہے۔ ٹیکنالوجی کے بارے میں ہماری حد سے بڑھی ہوئی حساسیت کا ایک اہم سبب ویلفیئر ازم اور لبرل ازم ہے جس نے زندگی کا مقصد محض فلاح و بہبود کو قرار دیا لیکن نجات اخروی سے اس کا کوئی سروکار نہیں۔ عہدِ حاضر کا انسان کسی تہذیب میں ہو اس کے لیے دنیا اہم بنادی گئی ہے اور آخرت انتہائی غیر اہم۔ دین کا مقصد فلاح و بہبود نہیں بلکہ نجات اخروی ہے۔صرف ترقی، فلاح، مادی کامیابی اور مستقبل پر ایمان کا ایمان باللہ سے کوئی تعلق نہیں ـــــ دینی تہذیب میں حصول نجات سب سے اہم کام ہے ـــــ انسان اس کے لیے اپنی دنیا اور معیارات زندگی کو ترک کر دیتا ہے۔ جب آخرت اہم ہوتی ہے تو دنیا غیر اہم ہو جاتی ہے۔ روایتی تہذیبوں میں اسی لئے ٹیکنو سائنس پیدا نہیں ہو سکی کیوں کہ ان تہذیبوں کا نقطۂ ماسکہ اور مقصد زندگی اس دنیا میں آزادی اور لذتوں کا حصول نہیں تھا۔ٹیکنو سائنس جہاں جاتی ہے وہاں آخرت کی فکر کو ناممکن اور محال بنا دیتی ہے اور زندگی کے بارے میں غور و فکر اور معیارات زندگی میں شب و روز اضافہ کی فکر کو ہر کہہ و مہہ کے لئے ممکن بنا دیتی ہے۔ دنیاوی فلاح ترقی تعیّشات یا نجات ـــــ جب یہ سوال مذہب کی بارگاہ میں پیش ہوتا ہے تو نجات کو اولیت دی جاتی ہے لیکن جب عقل کی عدالت، سرمایے کے ذریعے اور ٹیکنو سائنس کے طریقوں سے اس سوال کا جواب دیتی ہے تو نجات کا سلسلہ اس کے دائرۂ علم سے خارج ہو جاتا ہے۔ہمیں صرف ان اشیاء و آلات و ایجادات کی فکر ہے جن کی کمی سے شاید ہماری مادی زندگی میں کچھ خلل پیدا ہو لیکن ہمیں ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں ہے جو ہماری روح کو مسخ کر کے اسے تباہ کرنے پر تلی ہوئی ہیں۔ ایسی اشیاء کی فہرست میں ٹیکنو سائنس کا نام

سب سے پہلے آتا ہے۔

۱۸۔ سائنس اور تجربیت کے فروغ میں ہیوم اور کانٹ کا کردار

جدید سائنس کے فروغ میں ایڈورڈ ہیوم کا بنیادی کردار ہے جو تجربیت [Empiricism] کا بہت بڑا حامی تھا اور جس نے Analytical proposition اور synthetic proposition کا تجزیہ پیش کر کے عقلیت سے حاصل ہونے والے علم کو رد کیا اور بتایا کہ عقلیت پسندی [Rationalism] صرف اور صرف [Analytical Proposition] پر قائم ہے جس سے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا اور عقلیت پسند [Rationalists] عام لوگوں کو محض بے بنیاد دلائل کے ذریعے مسخر کرنے کا فن جانتے ہیں۔ کانٹ پر ہیوم کا بہت اثر ہے کیوں کہ کانٹ نے جب ہیوم کے مباحث پڑھے تو وہ بے اختیار کہہ اٹھا ''ہیوم نے مجھے سوتے سے اٹھا دیا ہے''۔ ہیوم کے فلسفیانہ دلائل نے کانٹ کو مسخر کیا اور اس نے ''تنقید عقل محض'' میں عقلیت پرستی کے فلسفے کی دھجیاں بکھیر دیں اور بتایا کہ انسان نے تین تاریخی غلطیاں کی ہیں کہ اس نے الٰہیات، کونیات اور نفس انسانی کو عقلیت کے دائرے میں جانچنے، پرکھنے اور ثابت کرنے کی کوشش کی جب کہ ان دائروں میں عقل کار آمد نہیں ہے۔ انسان نے ان دائروں میں عقل کا اطلاق کر کے در حقیقت ایک فاش غلطی (Categorical mistake) کی ہے کیونکہ یہ دائرے عقل انسانی کے ادراک سے ماورا ہیں۔ انسانوں نے تاریخ کے ہر دور میں عقل کا اطلاق ایسے دائرہ ہائے علم پر کیا جو عقل کے ادراک اور تصور سے باہر تھے لہٰذا انسان نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ کانٹ کی کتاب ''تنقید عقل محض'' اسی مدعا کا علمی اظہار ہے۔

الف۔ Analytical proposition کے زمرے کے جملوں کی چار خصوصیات ہیں۔ ا۔ یہ جملے بغیر تجربے کے [A prarie] ہوں گے۔ ان جملوں کا موضوع (subject) اور اثبات وصف (Predicate) یکساں ہوں گے جیسے پیلا رنگ پیلا ہے، دائرہ گول ہے [Circle is round]، ۲۔ یہ جملے بذاتہ سچ (Self Evident) ہوں گے، ان کی سچائی کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ ۳۔ ان جملوں کا انکار تضاد کو جنم دے گا۔ ۴۔ ان جملوں سے ہمارے علم میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔

ب۔ synthetic proposition کے جملوں کی بھی چار خصوصیات ہیں: ا۔ یہ جملے تجربے کے نتیجے میں ادا ہوتے ہیں لہٰذا فلسفے کی زبان میں [a posterie] ہوتے ہیں۔ ان کا موضوع (subject) اور اثبات وصف (predicate) یکساں نہیں ہوتے، مثلاً سیب سرخ ہے لیکن ضروری

نہیں کہ ہر سیب سرخ ہو،۲۔ یہ جملے بذاتہٖ سچ نہیں ہوتے ممکنہ سچ (probable truth) ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ تجربات پر مشتمل ہوتے ہیں اور ہر نیا تجربہ سابقہ نتیجے کا ممکنہ رد کرسکتا ہے لہٰذا ان جملوں میں تردید کا امکان موجود رہتا ہے۔۳۔ ان سے انکار تضاد کو جنم نہیں دیتا لہٰذا ان کا انکار برخود غلط (self contradictory) نہیں ہوتا۔۴۔ان جملوں سے ہمارے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

ان دلائل کے نتیجے میں عقلیت پرستی [ریشنل ازم] کی کم تری ثابت ہوئی اور تجربیت کی برتری ـــــ تجربے سے حاصل ہونے والا علم بہتر اور برتر ہے کیونکہ اس میں ہمہ وقت اضافہ، تغیر اور ارتقاء کا امکان ہے۔ کانٹ نے کہا تھا Analytical proposition کی خوبی یہ ہے کہ سچ کا حصول بغیر تجربے کے ہوتا ہے۔مگر یہ کمزور علم ہے اس سے علم میں اضافہ نہیں ہوتا، مگر synthetic proposition علم میں مسلسل اضافہ کا سبب بنتے ہیں لہٰذا کانٹ نے ان دونوں علوم کو ملا کر ایک نئی اصلاح وضع کی جس میں ان دونوں اصطلاحوں کے مفہوم سمو دیئے گئے ۔ اس نے اسے analytic synthetic judgement کا نام دیا۔اسے وہ ایک مثال سے بیان کرتا ہے 2+5=7 یہ لازماً سچ ہے اس سے علم میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔ کانٹ نے کہا تھا کہ ہر وہ بیان جو انسان کی زبان سے ادا ہوتا ہے وہ proposition نہیں ہوتا، وہ فیصلہ Judgement ہوتا ہے اگر ہم proposition کو شامل رکھیں وہ موضوع subject کو نکال دیتا ہے۔ ایسا علم ماوراء انسان ہو جاتا ہے۔ یہ علم انسان کی نفی کر کے ممکن ہوتا ہے لیکن کانٹ judgement کی بات کرتے ہوئے کہتا ہے کہ فیصلے کے لیے subject کا وجود ضروری ہے۔انسان کی نفی کر کے جو علم حاصل کیا جائے وہ علم نہیں ہے۔علم کا کوئی ایسا دائرہ علم نہیں کہلا سکتا جس میں انسان موجود نہ ہو۔ کانٹ کے اس فلسفے سے انسانیت پرستی (Humanism) کی عقلی بنیادیں بھی فراہم ہوئیں ۔عقلیت پرستی کے فلسفے کا انہدام ہیوم کے تجربیت کے فلسفے کے ذریعے ممکن ہوا۔کانٹ کی اس فکر نے جدید سائنسی علوم کو حقیقی، واقعی اور اصلی علم قرار دینے میں مرکزی کردار ادا کیا۔ کانٹ کے فلسفیانہ استدلال نے یہ موقع فراہم کیا کہ علوم کے دائرے سے وہ تمام علوم خارج کر دئے جائیں جو تجربے، حواس اور تحلیل کے معیار پر پورے نہیں اترتے لہٰذا مابعد الطبیعیات کا علم بے وقعت، لا یعنی ٹھہرا اور حقیقی علم صرف سائنسی، تجربی، حسی علم ہی قرار پایا یہ وہ بنیادی تبدیلی ہے جس نے اٹھارھویں صدی کے بعد رفتہ رفتہ دینیات، الٰہیات اور مذہبیات کو علم کے دائرے سے مکمل طور پر خارج کر دیا۔ہیوم اور کانٹ کی عقلی دلیلوں نے عقلیت کے فلسفے کی صدیوں سے مستحکم عقلی دلیلوں کا رد کیا اور اس کے نتیجے میں سائنسی علم کا فروغ ممکن ہوا۔ (جاری ہے)

تہذیبی تصادم

سید خالد جامعی ☆
ڈاکٹر عبدالوہاب سوری ☆☆

مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج

کراچی یونیورسٹی سے سید خالد جامعی صاحب اور ڈاکٹر عبدالوہاب سوری صاحب جون میں لاہور تشریف لائے تو ہم نے صفاء انسٹی ٹیوٹ میں ان کے ساتھ ایک فکری نشست کا اہتمام کیا۔ چنانچہ ان دونوں حضرات نے 'مسلم معاشرہ اور مغربی تہذیب کا چیلنج' کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے سوال وجواب کا موقع نہ مل سکا۔ البرہان کی تنگ دامنی کی وجہ سے سوری صاحب کی مکمل تقریر نہیں دی جاسکی۔ ایف سی کالج یونیورسٹی کے پروفیسر شاہد رشید صاحب ڈاکٹر سوری صاحب کے مؤقف پر کچھ کہنا بھی چاہتے ہیں۔ اگلے شمارے میں یہ بحث ان شاء اللہ مکمل ہوجائے گی۔ امین

سید خالد جامعی

مسلم معاشرے کے لیے مغربی تہذیب کا جو چیلنج ہے اور اس نے جو سوالات پیدا کیے ہیں ان کی ایک ترجمانی 'خطبات اقبال' کے ذریعے ہوئی۔ اور خطبات اقبال کے بارے میں سلیم احمد کا قول ہے جو سہیل عمر صاحب کی کتاب 'خطبات اقبال - نئے تناظر میں' میں بھی درج ہے کہ اگر ہم مغرب سے پیپسی اور کوٹ پتلون کے علاوہ کچھ اور بھی سیکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے 'خطبات اقبال' ہماری رہنمائی کرتا ہے اور 'خطبات اقبال' عہد حاضر کی انجیل ہے۔ 'خطبات اقبال' میں مغربی تہذیب سے درپیش چیلنج کا جو جواب دیا گیا تھا میرے خیال میں کم وبیش سو سال کے عرصے میں عالم اسلام کے مفکرین کی جانب سے وہی حل پیش ہوتا رہا ہے خواہ وہ مفتی محمد عبدہ ہوں، جمال الدین افغانی ہوں، سر سید احمد خاں ہوں، چراغ علی ہوں، خواہ وہ آپ کے وحید الدین خاں ہوں، خواہ وہ جاوید احمد غامدی ہوں، خواہ وہ یوسف قرضاوی ہوں، بلکہ جو راسخ العقیدہ علما ہیں اور راسخ العقیدہ مکاتب فکر ہیں ان کی جانب سے بھی ایک ہی جواب دیا گیا ہے کہ مغرب کا سب سے بڑا چیلنج سائنس اور ٹیکنالوجی ہے اور عالم اسلام اس وقت تک مغرب کا مقابلہ کرنے سے قاصر رہے گا جب تک کہ وہ سائنس اور ٹیکنالوجی حاصل نہیں کرتا۔

یہ وہ حل ہے جو مشترکہ طور پر راسخ العقیدہ اور لبرل اسلامک ماڈرنسٹ لوگوں کے اندر ایک عموم کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اس کا جو حل بیان کیا گیا گزشتہ سو سال کے عرصے میں وہ ایک ہی حل تھا

☆ ناظم شعبۂ تصنیف وتالیف وترجمہ، جامعہ کراچی
☆☆ شعبۂ فلسفہ، جامعہ کراچی

اور اس کا جو تناظر تھا وہ بھی ایک ہی تناظر تھا اور وہ تناظر یہ تھا کہ چونکہ عالم اسلام سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مغرب سے پیچھے رہ گیا ہے لہٰذا مغرب نے اپنی عسکری یلغار سے عالم اسلام کو مغلوب کر لیا ہے لہٰذا اگر عالم اسلام کو غالب آنا ہے تو اسے وہ ہتھیار، وہ سائنس اور وہ ٹیکنالوجی حاصل کرنا ہوگی جس کے ذریعے مغرب کو ہم پر غلبہ حاصل ہوا ہے۔ یہ وہ مشترکہ حل ہے جو ہر شخص کی طرف سے الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ، استدلال کے حسن اور لطافت و نزاکت کے ساتھ، اپنے اپنے استعارات اور محاوروں میں پیش کیا گیا ہے لیکن حل یہی ہے۔ حتیٰ کہ مولانا مودودیؒ جب یہ کہتے ہیں کہ اسلام کا عروج ہوگا تو وہ کہتے ہیں کہ جہاد اور اجتہاد کے ذریعے ہوگا۔ تو اجتہاد سے ان کی مراد ہوتی ہے سائنس اور ٹیکنالوجی جبکہ اسلامی تہذیب اور اسلامی روایت میں اجتہاد کا مطلب سائنس اور ٹیکنالوجی کبھی ہمارے ہاں نہیں لیا گیا۔ بنیادی استدلال یہ ہے کہ سترھویں صدی میں مغرب دنیا بھر میں اپنے جو نوآبادیات قائم کرتا چلا گیا تو اس کے پاس وہ ہتھیار اور وہ ٹیکنالوجی تھی جو عالم اسلام کے پاس نہیں تھی اس لیے عالم اسلام کو شکست ہوگئی۔ یہ عمومی مقدمہ ہے جو تمام اکابر کے ہاں ہمیں ملتا ہے۔

عبدالوہاب سوری صاحب اپنے پوسٹ ڈاکٹریٹ تھیسز کے لیے اس موضوع پر کام کر رہے ہیں اس لیے میں خاص طور پر انہیں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں اور انہوں نے اس پر کام بھی کیا ہے لہٰذا یہ اس پر تفصیل سے کلام کریں گے۔ ویسے تقریباً تین سال سے ہم اس موضوع پر تحقیق کر رہے ہیں اور ہم نے تقریباً تین ہزار صفحات اس پر مرتب کیے ہیں جو آپ کی خدمت میں ان شاء اللہ اگلے چند ماہ میں پیش کر دیئے جائیں گے۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ جب مغرب نے ہندوستان پر یلغار کی یا وہ عرب پر حملہ آور ہوا یا ترکی پر حملہ آور ہوا تو کیا عالم اسلام کی حکومتوں کے پاس یا خلافت عثمانیہ کے پاس یا مغلیہ سلطنت کے پاس ہتھیار اور اسلحہ ان سے کم تر تھا؟ یہ ہے بنیادی مقدمہ۔ اگر یہ مقدمہ ثابت ہو جائے تو ان مفکرین کا جو حل ہے وہ آدھے سچ کے طور پر قبول کیا جا سکتا ہے پورے تھیسز کے طور پر پھر بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ تو اس کا جواب عبدالوہاب سوری صاحب دیں گے۔ کچھ سوال میں اور بھی پیش کرتا ہوں جن کا جواب سوری صاحب دیں گے اور ان جوابات میں بھی انشاء اللہ ایک ادراک، ایک فہم، تاریخ، تہذیب اور ایک حقیقت اپنا چہرہ کھولتی نظر آئے گی۔

مثال کے طور پر اگر اس مقدمے کو ٹھیک تسلیم کر لیا جائے تو ہمارا سوال یہ ہے کہ جب تاتاریوں

نے عباسی حکومت پر یلغار کی جو اس وقت تین براعظموں پر پھیلی ہوئی تھی اور اس کے پاس بیت الحکمت بھی تھا جس میں اٹھائیس زبانوں میں ترجمے کی صلاحیت تھی اور عباسی خلفا کے دربار میں مناظرے بھی ہوتے تھے علم پر، منطق پر، اور فلسفے پر تو عباسیوں کے پاس بھی گھوڑے اور تلواریں تھیں اور تاتاریوں کے پاس بھی گھوڑے اور تلواریں تھیں تو پھر تاتاریوں نے عباسیوں کو شکست کیوں کر دے دی؟ پھر اس کے بعد یہ ہوا کہ عباسیوں نے یا عالم اسلام نے تاتاریوں کی فتح کو شکست میں بدل دیا۔ سوال یہ ہے کہ کیا ایسا انہوں نے ہتھیاروں کے بل پر کیا تھا؟ کیا انہوں نے ایٹم بم ایجاد کر لیا تھا جو انہوں نے تاتاریوں پر پھینک کر غلبہ حاصل کر لیا؟ نہیں! بلکہ ایسا عالم اسلام نے اپنی علمیت، اپنی علمی قوت اور اپنے دین کے آفاقی پیغام کے ذریعے کیا۔ اور وہ آفاقی پیغام بلا شک وشبہ آج بھی اتنی ہی قوت رکھتا ہے جتنی قوت وہ تاتاریوں کی یلغار کے زمانے میں رکھتا تھا۔ تو عباسیوں نے جو دوبارہ فتح حاصل کی وہ تلوار کے ذریعے، ایٹم بم کے ذریعے اور سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے حاصل نہیں کی بلکہ انہوں نے تاتاریوں کو مسلمان کر لیا اور یوں ان کو شکست دے دی۔ عسکری میدان میں شکست کھانے کے باوجود ان کو علم کے میدان میں شکست دے دی۔

تہذیبوں اور قوموں کا مقابلہ اکثر علم کے میدان میں ہوتا ہے۔ اگر آپ کی تہذیب کی علمی برتری قائم ہے، اگر آپ کا علم آفاقی ہے، اگر اس علم کے اندر کوئی قوت، کوئی تاثیر اور کوئی خوبی موجود ہے تو وہ آج بھی مغرب کو شکست دینے کے لیے کافی ہے اور اگر عسکری میدان میں ایک دوبار کی شکست ہو بھی جائے تو اس سے تہذیب کی قوت پر اور اس کی علمیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس کے لیے دو مثالیں اور میں آپ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں۔

ایک مثال فاطمیوں کی حکومت کی ہے۔ فاطمیوں نے آ کر عباسی خلافت پر قبضہ کر لیا۔ عباسیوں نے تین مرتبہ اپنی خلافت چھیننے کی کوشش کی لیکن فاطمیوں کو شکست نہیں دے سکے اور 274 سال مصر پر فاطمیوں کا قبضہ رہا۔ یوں مصر پر عباسی سلطنت کو جو غلبہ حاصل ہوا وہ تلوار کے ذریعے نہیں ہوا، وہ کسی ایٹم بم، سائنس اور ٹیکنالوجی کے ذریعے نہیں ہوا وہ صلاح الدین ایوبی کے ذریعے ہوا۔ صلاح الدین ایوبی نے فاطیمین مصر کو جو ایک لڑکھڑاتی اور سسکتی ہوئی تہذیب کے نمائندے بن گئے تھے، ان کو اپنی فطری موت مرنے دیا اور جیسے ہی آخری فاطمی خلیفہ مرا، سلطان صلاح الدین ایوبی نے عباسیوں کا خطبہ جاری کر دیا، بغیر خون خرابے کے خلافت اسلامیہ ایک بار پھر اوج پر آ گئی۔

دوسری مثال میں آپ کے سامنے اندلس کی پیش کرتا ہوں جسے آج کل ہم اسلامی دنیا میں ایک رول ماڈل کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اب تو اسلام آباد میں قرطبہ کے نام سے ایک شہر بھی بن رہا ہے۔ غالباً نیا قرطبہ بنانے والوں کو پرانا قرطبہ بنانے والوں کا انجام یاد نہیں رہا۔ اسلامی تہذیب میں یہ کوئی آئیڈیل نہیں ہے یہ زوال کی آخری علامت ہے جس کو آپ عروج کے طور پر اسلام آباد کے اندر پیش کر رہے ہیں۔ علمی وفکری افلاس اِس وقت عالم اسلام کا عمومی مسئلہ ہے۔ مسلمانوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی میں سب سے زیادہ ترقی کی ہے اندلس کے اندر، اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی بات نہیں ہے۔ برٹرنڈ رسل نے اپنے ایک مضمون میں کہا ہے کہ جس وقت اندلس کی سڑکوں پر چراغ جلتے تھے اس وقت پیرس کی گلیوں میں کیچڑ اور اندھیرا ہوتا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس وقت اندلس میں کتابوں کی 326 دکانیں تھیں جبکہ اس وقت پورے یورپ میں کتابوں کی صرف 13 دکانیں تھیں اور اندلس میں علم کی ارزانی کا یہ عالم تھا کہ ایک عالم کتابوں کی دکان پر کتاب خریدنے کے لیے پہنچا اور اس نے کتاب کے دام لگائے تو اس کے برابر کھڑے ہوئے ایک شخص نے اس سے بھی زیادہ دام لگائے، اُس نے اِس سے زیادہ دام لگائے تو اُس شخص نے اِس سے زیادہ دام لگا دیے حتیٰ کہ وہ کتاب اُس آدمی نے خرید لی۔ عالم اس سے بڑا متاثر ہوا کہ شاید یہ مجھ سے بھی بڑا عالم ہے جسے اس کتاب کی ضرورت ہے۔ اس نے پوچھا: حضرت! آپ کا شوق کیا ہے، مشاغل کیا ہیں؟ اس نے کہا: میں قصائی ہوں، عالم نے کہا: آپ یہ پڑھتے ہیں کیا؟ قصائی نے کہا: مجھے کتابیں جمع کرنے کا شوق ہے۔ جب قومیں کتابیں جمع کرتی ہیں تو تاریخ کے دفتر کے اندر خود بھی جمع ہو جاتی ہیں۔ اس پر مزید گفتگو کے لیے میں عبدالوہاب سوری صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس مقدمے کو آگے بڑھائیں۔

ڈاکٹر عبدالوہاب سوری

سائنس اور ٹیکنالوجی کے حوالے سے جب عمومی بحث ہوتی ہے تو اس میں جو دو تین بنیادی تصورات اور مفروضے (fundamental presumptions) زیر بحث آتے ہیں پہلے ہم ان کو identify کر لیتے ہیں اور یہی وہ تصورات ہیں جو ہمارے بڑے بھی ہمیں دیتے آئے ہیں اور ہم ان سے سنتے بھی رہے ہیں۔ پہلا تصور ٹیکنالوجی کے بارے میں یہ کہ سائنس وٹیکنالوجی دونوں کو باہم مترادف سمجھا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی دو الگ الگ چیزیں

ہیں۔سائنس کی application اس طرح سے آپ کی عملی زندگی میں ہو کہ اس کے ذریعے آپ کے سرمائے میں اضافہ ہوتو اسے ٹیکنالوجی کہتے ہیں:

Technology is derived from the application of scientific laws for the maximisation of capital accumulatioin otherwise technology will never transfer to the common people

کوئی بھی سائنٹفک لاء جب اس قابل ہوتا ہے کہ اس کو زندگی کے کسی دائرے پر اپلائی کر کے ایک ایسی چیز بنائی جا سکے جس پر جتنا پیسہ خرچ کیا جا رہا ہو اس سے زیادہ پیسہ وصول ہو سکے تب وہ ٹیکنالوجی کی شکل میں ہم تک پہنچتی ہے ورنہ اگر اس کی لاگت (cost) زیادہ ہو چاہے وہ جتنی بھی اہم ہو وہ آپ کے گھر تک نہیں پہنچے گی کیونکہ اس کی cost بڑھ جائے گی۔اس سے صاف ظاہر ہے کہ ٹیکنالوجی کا کیپٹل ازم سے ایک خاص نوع کا تعلق ہے۔جس پر ہم آئندہ بات کریں گے۔اس وقت ہم یہ کہہ رہے تھے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں لوگ فرق نہیں کرتے حالانکہ ہر سائنس ٹیکنالوجی میں ٹرانسفر نہیں ہو سکتی۔سائنس کا ایک معمولی طالب علم بھی یہ جانتا ہے کہ ہر سائنٹفک تھیوری ٹیکنالوجی میں تبدیل نہیں ہو سکتی جیسے مثلاً راکٹ سازی سائنس کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری presumption یہ ہے کہ ٹیکنالوجی بذاتِ خود ویلیو نیوٹرل ہوتی ہے یعنی ٹیکنالوجی کی اپنی کوئی ویلیو نہیں ہوتی بلکہ آپ اس میں جو ویلیو داخل کرنا چاہیں کر سکتے ہیں مثلاً موبائل فون ٹیکنالوجی ہے اور اس کی اپنی کوئی قدر نہیں ہے۔اسے میں اپنے بزرگوں سے بات کرنے کے لیے استعمال کروں یا اسے میں جوائنٹ سٹاک مارکیٹ میں پیسہ لگانے کے لیے استعمال کروں۔کس مقصد کے لیے استعمال کروں اس کا تعین مَیں خود کروں گا یہ چیز نہیں کر سکتی۔جیسا کہ بچپن سے ہم سکول سے سنتے آئے ہیں کہ تلوار ایک ہتھیار، ایک ٹیکنالوجی ہے جس سے آپ اپنی گردن بھی کاٹ سکتے ہیں اور دوسروں کی بھی۔اب یہ تلوار چلانے والے پر منحصر ہے کہ وہ اسے اپنی گردن پر چلاتا ہے یا کسی دوسرے کی گردن پر۔ٹیکنالوجی کے بارے میں یہ دوسری presumption ہے کہ یہ اپنی کوئی ویلیو نہیں رکھتی، ویلیو نیوٹرل ہے۔اس کے اندر ہر معاشرہ اور ہر تہذیب اور ٹیکنالوجی کا استعمال کرنے والا اپنی ویلیو داخل کر سکتا ہے۔یورپین معاشرہ اگر یہ ٹیکنالوجی استعمال کر رہا ہے تو وہ اس میں اپنی ویلیوز داخل کر سکتا ہے اور اگر کوئی مسلمان وہ ٹیکنالوجی استعمال کرے گا تو وہ اس میں اپنی ویلیو نہ داخل کر سکے گا۔

ہم کہتے ہیں کہ یہ دونوں presumptions غلط ہیں۔ اور یہ میں آپ کو کوئی اطلاع نہیں دے رہا اور نہ یہ محض میری ذاتی رائے ہے بلکہ یہ ان لوگوں کی رائے ہے جو ٹیکنالوجی کے فیلڈ میں اتھارٹی ہیں اور دنیا کے مشہور آدمی ہیں۔ ان میں سے ایک ہے ایلول جس نے ٹیکنالوجی پر بہت لکھا ہے۔ ان میں سے ایک ہوزے ماریس ایکرڈ ہے جو ٹیکنالوجی کے حوالے سے ایک بڑا نام ہے۔ ان میں سے ایس پرویز منظور بھی ہے Islamisation of knowledge کا آدمی ہے لیکن یہ مشہور مصنف ہے جس کی ٹیکنالوجی موضوع پر کئی اہم کتابیں ہیں۔ اس کے علاوہ ایک اور مشہور آدمی ہے جس کا نام چارس ٹلی ہے جس کا ٹیکنالوجی پر زبردست کام ہے۔

ان سب کا اس بات پر اجماع ہے حالانکہ یہ مختلف مکاتب فکر کے آدمی ہیں، ان میں کوئی leftist ہے، کوئی قدامت پسند مسلمان ہے، کوئی لبرل ٹائپ کا انسان ہے، چارس ٹلی سوشل ڈیموکریٹ ہے۔ ان سب کا اس بات پر اجماع ہے کہ ٹیکنالوجی اپنے ساتھ اپنی ویلیوز لے کر آتی ہے۔ ہر ٹیکنالوجی کی اپنی ویلیوز اس کے اندر in built ہوتی ہیں۔ گویا کہ Technology is inchangably value ridden۔ دوسری بات یہ کہ سائنس اور ٹیکنالوجی بالکل دو الگ چیزیں ہیں۔ ان دونوں باتوں کو ہم اپنے لیکچر میں واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس سے پہلے کہ ہم ان کو refute کریں ہم ایک دو معروضات پیشگی عرض کرنا چاہتے ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ نئی ٹیکنالوجیز متعارف ہونے کی رفتار بہت تیز ہوگئی ہے مثلاً انیسویں صدی میں پچاس سال کا آدمی اپنی پوری زندگی میں دو یا تین نئی ٹیکنالوجیز سے متمع ہوتا تھا، دو یا تین ٹیکنالوجیز کو سیکھنے میں ہی اس کی عمر گزر جاتی تھی اور وہ انتقال کر جاتا تھا جبکہ عصر حاضر میں پچاس سال کا آدمی تیس ٹیکنالوجیز اپنی زندگی میں متعارف ہوتے ہوئے دیکھتا ہے۔اور چارلس ٹلی کا خیال ہے کہ ابھی اس کی رفتار میں اور زیادہ تیزی آئے گی۔ خصوصاً یہ نوٹ کیجیے کہ جدید انفارمیشن ٹیکنالوجی آنے کے بعد تبدیلی کتنی زیادہ اور کتنی تیزی سے رونما ہو رہی ہے۔

اٹھارویں صدی تک یہ سمجھا جاتا تھا کہ پوری انسانیت مل کر جو علم تخلیق کرتی ہے وہ اگلے تین سو سال میں دوگنا ہو جاتا ہے۔ مثلاً فرض کیجیے کہ اگر سترھویں صدی میں پوری انسانیت نے مل کر جو علم تخلیق کیا وہ 10 یونٹ تھا تو اس کو دوگنا ہونے کے لیے مزید 3 سو سال درکار تھے۔ انفارمیشن ٹیکنالوجی آنے کے بعد یہ 3 سو سال چار گھنٹوں کے برابر ہوگئے ہیں۔ اب علم اتنی تیزی سے تخلیق

کیا جا رہا ہے کہ وہ ہر چار گھنٹے بعد دوگنا ہو جاتا ہے ہم دوپہر کا کھانا کھا کر چلے تھے اور یہاں پہنچے ہیں تو اس وقت تک علم کی مقدار دوگنا ہو چکی ہے کیونکہ چار گھنٹے گزر چکے ہیں۔

اب سوال یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کی تخلیق کی رفتار اتنی تیز کیوں ہوگئی ہے؟ اس کا ایک جواب عام طور پر لوگ یہ دیتے ہیں کہ لوگ پڑھ لکھ گئے ہیں۔ لوگ ذہین ہو گئے ہیں۔ تو کیا اچانک ذہین ہو گئے ہیں؟ لوگوں کی ذہانت تو ہر دور میں رہی ہے ابن سینا کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ وہ ایک لائبریری کا انچارج تھا۔ لائبریری میں آگ لگ گئی اور کتابیں جل گئیں۔ خلیفہ وہاں آتا تھا کتابیں پڑھنے لوگ ڈر گئے کہ خلیفہ آیا اور کتابیں نہ ہوئیں تو وہ ناراض ہوگا۔ ابن سینا نے کہا: کوئی بات نہیں کاغذ قلم لاؤ اور اس نے وہ 5 سو کتابیں دوبارہ مرتب کر دیں تو یہ عالم تھا ابن سینا کی ذہانت کا۔

آج کے دور کا انسان اتنا ذہین ہو گیا ہے کہ وہ ہر لمحے ایک نئی ٹیکنالوجی تخلیق کر رہا ہے تو ہمیں دیکھنا ہوگا کہ ہمارا طرزِ عمل کیا ہو؟ اس وقت ہم اسلام وغیرہ کی باتیں بالکل نظری سطح پر کرتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ ٹیکنالوجی میں ترقی کے کون کون سے ماڈل دنیا میں روبہ عمل ہیں اور امت مسلمہ اگر امریکہ اور یورپ کو شکست دینا چاہتی ہے تو وہ کون سے ماڈل کو اپنائے؟

بیسویں صدی میں ٹیکنالوجی کی ترقی کے دو ماڈل ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایک ماڈل ہے leftists شوشل ماڈل جو کمیونسٹ دنیا نے استعمال کیا اور دوسرا ماڈل وہ ہے جو مغرب کے سرمایہ دارانہ لبرل نظام کے اندر استعمال کیا گیا۔ دونوں کی اپنی اپنی انفرادیت اور حاصلات ہیں۔ پہلے ہم لیتے لیفٹ کے ماڈل کو۔ لیفٹسٹوں کی سائنس کے ساتھ کمٹمنٹ اتنی زیادہ تھی کہ مارکس اپنے آپ کو فلسفی نہیں کہتا تھا بلکہ کہتا تھا کہ ہم سائنس دان ہیں۔ تو جتنے بھی لیفٹسٹ ہوئے ہیں مارکس کے بعد لینن، سٹالن یا ویت نامی اور کیوبا والے تو ان میں سے زیادہ تر لوگوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کو مذہب کے متبادل کے طور پر پیش کیا ہے۔ وہ مذہب کو افیون کہتے تھے اور سائنس وٹیکنالوجی کو ترقی کی واحد اساس سمجھتے تھے۔

سائنس وٹیکنالوجی کے ساتھ کمیونسٹوں کی کمٹمنٹ تھی اور اس کمٹمنٹ کی یہ حالت تھی کہ سٹالن نے ایک ہی دن میں اٹھارہ پادریوں کے گلے پر چھری پھیری تھی حالانکہ وہ انقلابی بننے سے پہلے خود پادری تھا۔ تو سٹالن کہتا ہے کہ مذہب تو مسائل کی جڑ ہے ہمیں سائنس اور ٹیکنالوجی کو استعمال کرنا چاہیے تاکہ لوگوں کی بنیادی ضروریات پوری ہو سکیں اور ان کا معیارِ زندگی بلند ہو سکے (جاری ہے)۔

تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ: تاریخی تجزیہ

ایڈورڈ سعید مغرب و اسلام کی مغایرت سے ناواقف

سید خالد جامعی / عمر حمید ہاشمی ☆

جریدہ کے شمارہ ۲۹ میں "عالم اسلام میں جدیدیت اور روایت کی کشمکش" پر شائع ہونے والے تحقیقی مضمون میں صفحہ ۱۲۸ اور ۱۲۹ پر سہواً درست اور تفصیلی متن کے بجائے غلط اور نامکمل متن شائع ہوگیا یہ متن آٹھ صفحات پر مشتمل تھا لیکن صرف دو صفحات لے لیے گئے جو نامکمل کتابت کے باعث غیر مربوط عبارت پر مشتمل تھے۔ صفحات کی ترتیب کے دوران اس مضمون سے متعلق کتابیات پر مبنی صفحات ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کے عالمانہ مضمون کے بعد شامل کیے گئے جس کے باعث قارئین کو زحمت ہوئی۔ صفحہ ۲۳۷ سے ۲۵۸ تک درج فہرست کتب اسی مضمون کا تسلسل ہے۔ اس فہرست کا ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کے مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ صفحہ ۱۲۸ اور ۱۲۹ کا اصل متن درج ذیل ہے۔ اس کے مطابق آپ اپنے نسخے میں مطالعے کا تسلسل قائم کرسکتے ہیں۔

[فلسفے کو قابلِ تسخیر سمجھتے تھے جب کہ جدیدیت پسند مغربی تہذیب، اقدار اور فلسفے کو نا قابلِ تسخیر اور ناگزیر سمجھتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مغربی تہذیب و فلسفے کی اقدار و روایات عالمگیر ہیں، زمان و مکان سے ماوراء ہیں۔ ناقابلِ تقسیم و ناقابلِ تغیر ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کی ۱۵ سو سالہ قدیم تعلیمات، روایات، اقدار، خصوصیات، ثقافت، تہذیب، قرآن کی آیات، سنتِ رسولؐ، احادیث سب کچھ قابلِ تغیر و ترمیم ہیں، لہٰذا مغربی فلسفے کے تناظر میں اسلام کو تبدیل کر کے مغرب کے سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ انہی معنوں میں فرانسس فوکویاما کا موقف ہے کہ تاریخ کا سفر ختم ہو چکا ہے تہذیبوں کے تصادم کی ترکیب اس یقین کا اظہار ہے کہ اب کوئی تہذیب، کوئی فلسفہ، کوئی تاریخ، کوئی روایت، کوئی مذہب، مغرب کی قائم کردہ عالمگیر اقدار بنیادی حقوق اور انسانی

☆ ناظم و نائب ناظم، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، جامعہ کراچی۔

حقوق کے مقابلے پر کوئی نیا نظام یا اقدار و روایات پیش نہیں کر سکتا نہ ان مغربی روایات سے بہتر عالمگیر روایات کے پیش کیے جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا تاریخ کا سفر ختم ہوگیا۔ اختتام تاریخ کے فلسفہ پر مبنی فوکو کا مضمون National Interest نامی رسالے میں شائع ہوا جو بعد میں ایک کتاب کا موضوع بن گیا۔ اسی فلسفے کی ایک دوسری شکل برنارڈ لوئس نے اٹلانٹک منتھلی کے ستمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں اپنے مضمون "مسلم غیض و غضب کا اظہار" میں پیش کی اور پہلی مرتبہ تہذیبوں کے تصادم کی خود ساختہ ترکیب استعمال کی۔ لوئس مسلم دنیا کے حاضر مسئلے پر اظہار خیال کرتا ہے "اب تک یہ بات بالکل صاف ہو جانی چاہیے کہ ہمیں ایک ایسے رویے اور ایک ایسی صورت حال کا سامنا ہے جو مسائل اور پالیسیوں کی سطح سے اور ان حکومتوں سے، جو ان کی خبر رکھتی ہیں، کہیں بلند تر ہے۔ یہ تہذیبوں کے تصادم سے کم تر کوئی چیز نہیں۔ یہ شاید ایک قدیم حریف کا ہمارے یہودی۔ عیسائی ورثے، ہمارے سیکولر حال اور دونوں کے عالمی پھیلاؤ کے خلاف ایک نامعقول مگر بہر حال یقینی طور پر تاریخی ردعمل ہے۔ اب یہ حد درجہ ضروری ہے کہ اپنی طرف سے ہمیں اپنے حریف کے خلاف اسی سطح کے تاریخی اور اتنے ہی نامعقول اشتعالی ردعمل کا شکار نہیں ہونا چاہیے"۔ ہنٹنگٹن نے یہ اصطلاح برنارڈ لیوس سے مستعار لی اور اسی بنیاد پر تہذیبوں کے تصادم کے فلسفے کو مستقبل کی مغربی حکمت عملی کے طور پر پیش کیا۔ ہنٹنگٹن برنارڈ لوئس فواد عجمی فوکو یا مافرید زکریا ایک ہی فلسفہ فکر کے قلم کار نظر آتے ہیں اس کے برعکس دوسرے مکتبہ فکر کی نمائندگی رورٹی، گرے، ٹیلر میکلماٹر کرتے ہیں۔ یہ بھی مغربی تہذیب کے وفادار امریکا کے زبردست حامی ہیں لیکن اس درجہ پر جوش مبلغ نہیں جیسا کہ ہنٹنگٹن اور ان کا مکتبہ فکر ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کے فلسفے کی مختصر تاریخ ایڈورڈ سعید کے مضمون "تعریفوں کا تصادم" میں بیان کی گئی ہے جو ان کی کتاب Reflection on Exile میں شامل ہے۔] تاریخ کے سفر کے اختتام کے یہ دعوے نئے نہیں انیسویں صدی میں کانٹ نے Kingdoms of End کا تصور پیش کیا۔ ساٹھ کی دہائی میں فرانس کے پروفیسر Alexander Koggere نے اعلان کیا کہ تاریخ ختم ہو گئی ہے۔ تاریخ کے اختتام کے یہ نظریات ہیگل کے فلسفہ End of History کی توسیع تھے۔ جب ہیگل نے کہا تھا کہ تاریخ اس ذات مطلق کی خود تخلیقیت (Self Creation) اور خود تشکیلیت (Self Constitution) کا سفر ہے جب خود تخلیقیت کے اس عمل کے ذریعے ذات مطلق اپنے آپ کو مکمل کرے گی تو تاریخ ختم ہو جائے گی۔ [مذہبی زبان میں اس نظریے کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہیگل کے نزدیک خدا تاریخ کے ذریعے اپنے آپ کو تخلیق کر رہا ہے مکمل کر رہا ہے]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف تہذیبوں، نسلوں اور ثقافتوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت اعلیٰ وارفع مقصد حیات رکھتے ہیں لہٰذا اس ارفع مقصد کو دنیا بھر میں رائج ہونا چاہیے۔ اسلام اسی نقطہ نظر کا وکیل

ہے، وہ دعوت کے ذریعے اپنے پیغام کے آفاق وسیع کرتا ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے۔ وہ تمام فوائد اور مناصب اور جنت کا حق دار ہوتا ہے جو معاہدہ کر کے مطیع ہو جائے اس کے ساتھ شرائط معاہدہ کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے جو جنگ مسلط کرنا چاہے اس سے طاقت کے ذریعے نمٹا جاتا ہے۔ اسلام اقدامی جہاد کا مدعی ہے، جہاں بھی فتنہ و فساد برپا ہوگا جارحیت ہوگی، اسلام اس کی مزاحمت کے لیے بھرپور اقدام کرے گا تا آنکہ جنگ ہتھیار نہ رکھ دے اور دشمن کی قوت کو اچھی طرح کچل نہ دیا جائے۔ اس عمل کے دوران زمین پر فتنہ و فساد پھیلانے والے کو نہ صرف قتل کیا جاتا ہے بلکہ غلام بھی بنایا جاتا ہے جو اللہ کی غلامی گوارا نہیں کرتے۔ وہ اللہ کے بندوں کی غلامی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہنٹنگٹن کی تحریر کے بین السطور میں تہذیبوں کے درمیان ایک آخری معرکہ عظیم کا امکان ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور وہ آخری معرکہ ہندو، جاپانی، کنفیوشوسم، سلاوی راسخ العقیدہ، لاطینی امریکی اور افریقی تہذیبوں کے درمیان برپا ہوگا لیکن اصلاً وہ معرکہ اسلام اور مغرب کے درمیان ہے کیونکہ اسلام کا نظریہ ریاست، ثقافت اور تہذیب تینوں دائرہ کار میں اثر و نفوذ رکھتا ہے جب کہ دیگر نظریات محض ثقافتیں ہیں جو ریاست سے تعلق خاطر نہیں رکھتے۔ ریاست سے اسلام کا خصوصی تعلق اسے طاقت کے مرکز میں بدل دیتا ہے اور مذہب صرف تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہونے کے بجائے ریاست میں داخل ہو کر معاشرے میں انقلابی تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے جو مغرب کو قبول نہیں لہٰذا ہنٹنگٹن "تصادم کو طول دینے، اسے بدتر بنانے اور اسے گہرا بنانے کی حکمت عملی تجویز کرتا ہے اور دنیا کو برسر جنگ دیکھنا چاہتا ہے۔ ہنٹنگٹن کے اس تصور تصادم کا مستقبل میں خطرناک امکانی تصور ایچ جی ویلز کی تمثیل "دنیاؤں کی جنگ [The War of the Worlds] میں ملتا ہے۔

ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب Reflection on Exile میں تہذیبوں کے تصادم کے فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے وہ تمام حوالے جمع کر دیے ہیں جو اس موضوع سے متعلق ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ دنیاؤں کے مابین آویزش اور تصادم پر مبنی تصورات و نظریات کے مباحث گستاولی بان کی کتاب "The World in Revolt" ایف ایس مارون کی کتاب [1922] Western Races and the World، جارج ہنری لین فوکس پٹ ریورز کی کتاب The Clash of Culture and the Contact of Races [1927] میں بخوبی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ یہ حوالے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہیگل سے لے کر گستاولی بان اور ہنٹنگٹن تک آخری معرکہ عظیم کا تصور مغربی فکر و فلسفے کی تاریخ میں کارفرما رہا ہے اور یہ آخری معرکہ صرف اسلام سے ہوگا۔ مغربی مفکرین اس معرکے میں امریکا کو کلیدی مقام دیتے ہیں کیونکہ وہ نظام سرمایہ داری کا سب سے موثر و متحرک محافظ ہے۔ امریکا خود کیا ہے اس سلسلے میں ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

امریکہ میں یہ بحث، کہ کس شے کو امریکی کہا جاسکتا ہے، متعدد بڑی تبدیلیوں اور بعض صورتوں میں ڈرامائی تبدیلیوں سے دوچار رہے۔ جب میں جوانی کے حدود میں قدم زن تھا تو اس زمانے میں ویسٹرن فلم امریکہ کے اصلی باشندوں کو لعین ابلیسوں کی شکل میں دکھاتی تھی جنھیں یا تو تہِ تیغ کرنا یا مطیع بنا لینا لازم تھا۔ انھیں ریڈ انڈینز کہا جاتا تھا اور چونکہ ثقافت میں ان کا کوئی ایسا رول نہیں تھا سو یہ فلموں کے بارے میں بھی اتنا ہی درست تھا جتنا علمی تاریخ لکھنے کے باب میں۔ مختصر یہ کہ یہ طرزِ عمل سفید تہذیب کی پیش قدمی میں مضمر خوبیوں کو روشن تر کرنے کا ذریعہ تھا۔ آج صورت حال بالکل بدل چکی ہے۔ اب مقامی امریکیوں کو بدمعاشوں کے روپ کے بجائے مظلوموں کی شکل میں دکھایا جاتا ہے۔ کولمبس کے مرتبے میں بھی تبدیلی آ چکی ہے۔ امریکی حبشیوں اور عورتوں کے بیان میں اور زیادہ ڈرامائی تبدیلیاں دیکھی جاسکتی ہیں۔ ٹونی موریسن نے لکھا ہے کہ کلاسیکی امریکی ادب میں سفید رنگ سے مریضانہ حد تک وابستگی پائی جاتی ہے جیسا کہ میلول کی "موبی ڈک" اور پو کی "آرتھر گورڈن پِم" سے بطریق احسن تصدیق ہوتی ہے۔ تاہم وہ کہتی ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے بڑے لکھنے والے مرد اور سفید رنگ مصنفین نے وہ لوگ جنھوں نے اس ادب کے اصولی قوانین و اسالیب طے کیے جسے ہم امریکی ادب کا نام دیتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں گورے پن (Whiteness) کو ہمارے معاشرے میں افریقی موجودگی سے بچتے، اس پر نقاب ڈالنے اور اسے غیر مرئی بنا ڈالنے کے لیے حربے کے طور پر استعمال کیا۔ صرف یہی امر کہ ٹونی موریسن اپنے ناول اور تنقید اس قدر کامیابی اور ذہانت کے ساتھ لکھتی ہے اب میلول اور ہیمنگوے کی دنیا سے دو بوائے (Du Bois)، بالڈون، لینگسٹن ہیوز اور ٹونی موریسن کی دنیا تک ہونے والی تبدیلی کو نمایاں کرتی ہے۔ کس زاویہ نگاہ کو اصل امریکہ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اور کون شخص اس کی نمائندگی اور تعریف کا دعویٰ کرسکتا ہے؟ یہ سوال بہت پیچیدہ اور نہایت گہرا ہے لیکن اس سارے مسئلے کو چند فرسودہ فقروں تک محدود کرکے حل نہیں کیا جاسکتا۔ ان ثقافتی مقابلوں میں، جن کا مقصد کسی تہذیب کی تعریف متعین کرنا ہوتا ہے، کیا کیا مشکلات حائل ہوتی ہیں، اس کا اندازہ آرتھر شلیسنگر کی حالیہ چھوٹی سی کتاب "The Disuniting of America" (امریکہ کی تحلیل) سے کیا جاسکتا ہے۔ سوادِ اعظم کے مؤرخ ہونے کی حیثیت سے شلیسنگر کی پریشانی سمجھ میں آنے والی چیز ہے اسے اس بات کی پریشانی ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ہنگامی اور مہاجر گروہوں نے امریکہ کے اس سرکاری واحدانہ تصور کو معرضِ بحث میں ڈال دیا ہے جس کی نمائندگی اس ملک کے عظیم کلاسیکی مؤرخ مثلاً بینکرافٹ، ہنری ایڈمز اور بالکل حال میں رچرڈ ہوفسٹیڈٹر کرتے رہے ہیں۔ یہ گروہ چاہتا ہے کہ تاریخ اس طرح لکھی جانی چاہیے کہ اس سے نہ صرف اس امریکہ کے خدوخال واضح ہوں جس کا خواب دیکھنے والے اور اس پر حکومت کرنے والے امراء اور جاگیردار تھے بلکہ اس امریکہ کی بھی نمائندگی ہو جس میں غلاموں، خادموں،

مزدوروں اورغریب مہاجرین نے اہم مگراب تک غیرتسلیم شدہ رول ادا کیا۔اس طرح کے لوگوں کے بیانات نے سرکاری داستان کی سست رفتار ترقی اور پر سکون تمکین کو تہ و بالا کرنا شروع کردیا ہے۔جنھیں ان خطبات و مقالات کے ذریعے خاموش کردیا گیا تھا جن کا منبع واشنگٹن،نیویارک کے سرمایہ کار بنک،امریکہ کی دانشگاہیں اور غرب اوسط(Middle West) کی بڑی صنعتی دولت تھی۔یہ وہ سوال اٹھاتے ہیں،معاشرے کے بدقسمت افراد کے تجربات کو بیچ میں لے آتے ہیں اور کم تر درجے کے افراد واقوام مثلاً عورتوں،ایشیائیوں،افریقی امریکیوں اور متعدد دیگر اقلیتوں کے جنسی اور نسلی مطالبات کو آواز عطا کرتے ہیں۔کوئی شخص خواہ شلینگر کی دل سے نکلی ہوئی چیخ سے اتفاق کرے یا نہ کرے،اس کے نسبتاً تخفی زاویہ نظر سے اتفاق کیے بغیر چارہ نہیں کہ تاریخ نویسی کسی ملک کی تعریف کے ضمن میں شاہراہ کی حیثیت رکھتی ہے نیز یہ کہ کسی معاشرے کا تشخص بڑی حد تک تاریخی تعبیر کا فرض ہوتا ہے اور یہ تاریخی تعبیر بہت سے متقابل دعووں اور جوابی دعووں کے خطروں سے گھری ہوئی ہے۔[فکریات ص ۶۵۔۲۶۳ تحسین فراقی]

اسلام: سب سے بڑا خطرہ:

ہنٹنگٹن لکھتا ہے کہ"ہلالی شکل کا اسلامی بلاک.........افریقہ کے گولائی مائل ابھار سے وسط ایشیا تک خونیں سرحدوں کا حامل ہے"یہ جذباتی بیانیہ نہیں بلکہ وہ بچی تصویر ہے جو صلیبی جنگوں میں شکست کے زخموں کے بعد مستشرقین کے ذریعہ مغرب کے قلب و روح میں پیوست کی گئی ہے اور جب تک اس کا انتقام نہ لیا جائے۔ تاریخ کا سفر ختم نہیں ہوگا،اسلام اور مغربی تہذیب میں کیا فرق ہے اس کی حقیقت صلیبی جنگوں کی تاریخ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کا کردار ہے۔عیسائیوں نے کس طرح مسلمانوں کو تہ تیغ کیا اس کے برعکس صلاح الدین مخالفین سے کس طرح پیش آیا یہ واقعات مسلم مورخین نے نہیں عیسائی وغیر مسلم مورخین نے بھی لکھے ہیں۔

مستقبل کی مغربی حکمت عملی:

اسلام اور مغرب میں تصادم کے ضمن میں ہنٹنگٹن کا نظریہ مغربی حکمت عملی کا اظہار ہے ہنٹنگٹن کا مضمون سب سے پہلے فاران افیئر ز میں ۱۹۹۴ء شائع ہوا جس نے توسیع کے بعد ضخیم کتابی شکل اختیار کی۔فاران افیئر ز ایک ایسا بلور ہے جس میں مستقبل کی امریکی حکمت عملی کے مختلف خاکے اور نقشے پیش کیے جاتے ہیں اور بحث ومباحثے کی روشنی میں خارجہ حکمت عملی کو حتمی شکل دی جاتی ہے۔ہنٹنگٹن جیسے غیر معروف مفکر کے ایک مقالے پر دنیا بھر کے اخبارات و رسائل وجرائد میں ہزاروں صفحات شائع ہوئے تب بڑے بڑے عالمی مفکرین اس بات پر حیرت کا اظہار کررہے تھے کہ آخر اس مضمون میں ایسی کیا خاص بات ہے جس پر اس قدر شور وغلغلہ برپا ہے۔وہ خاص بات یہی تھی کہ بڑے بڑے مفکرین اس خیال کو جذب نہ کرسکے کہ اسلام اور مغرب میں مکالمہ ممکن ہی نہیں اور اس

تصادم کو فکری سطح پر قابل قبول بنانے اور مستقبل کی جارحانہ حکمت عملی کے منفی و مثبت پہلوؤں کو دنیا بھر کے سامنے نمایاں کرنا ضروری تھا، اسی لیے اس مضمون کو خاص اہمیت اور شہرت دی گئی۔ اس مضمون پر عالمی شور و غوغا ایک دانستہ حکمت عملی کے تحت برپا کرایا گیا تا کہ اس نظریے کو جو مستقبل کی امریکی حکمت عملی کے طور پر افغانستان اور عراق میں نافذ العمل ہونے والا تھا۔ دنیا کے لیے ایک مانوس تصور اور مانوس حادثہ بنا دیا جائے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایڈورڈ سعید جیسا محقق و مفکر بھی مغرب و اسلام میں کوئی مغائرت محسوس نہیں کرتا اور اسے ہنٹنگٹن کی تحریر بچکانہ نظر آتی ہے اور وہ علمی دلائل سے اس کے پرخچے اڑانا چاہتا ہے۔ وہ اس خطرے کا ادراک ہی نہیں کر سکا جو چھ سال بعد قیامت کی صورت میں برپا ہونے والا تھا اور جس کی علمی بنیادیں ایک منصوبہ بندی کے تحت برنارڈ لوئس اور ہنٹنگٹن کی تحریروں کے ذریعے رکھی جا رہی تھیں۔ ایڈورڈ سعید کی سادگی کا اندازہ ان کی اس تحریر سے کیجیے۔

ایڈورڈ سعید کی سادگی:

میری رائے میں ہنٹنگٹن جو کہتا ہے اور جس طرح معاملات کو پیش کرتا ہے بہت گمراہ کن ہے کیونکہ لگتا ہے کہ وہ تاریخ یا ثقافتی تشکیلات کے محتاط تجزیے کے بجائے پالیسی سازی کے ضمن میں نسخے پیش کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ [اصل حقیقت یہی تھی]

برنارڈ لوئس کی طرح سموئیل ہنٹنگٹن غیر جانبدار، بیانیہ اور معروضی نثر نہیں لکھتا [لوئس کو غیر جانبدار کہنا بہت مشکل کام ہے لیکن عیسائیت اور یہودیت کے مابین تازہ مفاہمت کی کوشش کے پس منظر میں سعید کو یہی لکھنا چاہیے تھا] بلکہ وہ ایک مناظرہ باز ہے جس کی خطابت نہ صرف "سب کی جنگ سب کے ساتھ" جیسے پہلے سے پیش کردہ دلائل کو کثرت سے برتتی ہے بلکہ نتیجتاً انھیں تسلسل عطا کرتی ہے۔ گویا تہذیبوں کے مابین ثالث یا ثالثی بخش کے بجائے ہنٹنگٹن ایک جانبدار شخص نظر آتا ہے جو باقی تہذیبوں کے مقابلے میں صرف ایک نام نہاد تہذیب کا وکیل نظر آتا ہے۔ لوئس کی طرح ہنٹنگٹن بھی مسلم تہذیب کو تحقیقی انداز میں متعارف کراتا ہے گویا اس تہذیب کے متعلق جو چیز سب سے اہم ہے وہ ہے اس کی مفروضہ مغرب دشمنی! لوئس اپنے موقف کی تائید میں کم از کم دلائل تو پیش کرتا ہے مثلاً یہ کہ اسلام کبھی جدت سے آشنا نہیں ہوا، یہ کہ اس میں دین و سیاست کبھی علیحدہ نہیں ہوئے یا یہ کہ یہ دوسری تہذیبوں کی تفہیم کا اہل نہیں لیکن ہنٹنگٹن اس طرح کے کسی خرخشے میں نہیں پڑتا۔ لیکن کیا یہ اس دنیا کو، جس میں ہم رہتے ہیں، سمجھنے کا بہترین طریق کار ہے؟ کیا بحیثیت ایک دانشور اور ماہر عالم کے یہ زیبا ہے کہ دنیا کا ایک سادہ اور سطحی سا نقشہ تیار کر کے اسے جرنیلوں اور غیر فوجی قانون سازوں کے ہاتھ میں ایک نسخے کے طور پر تھما دیا جائے تا کہ پہلے وہ اسے سمجھیں اور پھر اس پر عمل کریں؟ کیا یہ طریقہ کار در حقیقت تصادم کو طول دینے، اسے بدتر بنانے اور اسے گہرا بنانے کا باعث نہیں بنتا؟ یہ تہذیبوں کے تصادم کو کم کرنے میں کیا فرض بجالاتا ہے؟ کیا ہم

تہذیبوں کے تصادم کے آرزو مند ہیں؟ کیا مذکورہ طریقہ کار سے وطن پرستانہ جذبات کو اور نتیجتاً قوم پرستانہ قتل و غارت گری کو شہ نہیں ملتی؟ کیا ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب نہیں: کوئی شخص ایسا کیوں کر رہا ہے؟ سمجھنے بوجھنے کے لیے یا عمل کے لیے؟ تصادم کے امکان کو کم کرنے کے لیے یا بڑھانے کے لیے؟ چنانچہ تہذیبوں کے تصادم کے بارے میں پڑھ کر ہم تصادم کے تجزیے سے اتفاق کرنے کے بجائے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں: تم تہذیبوں کو ایک بے لچک معاملے میں کیوں جکڑتے ہو اور پھر تم ان کے تعلق کو ایک بنیادی تصادم کے رنگ میں کیوں پیش کرتے ہو گویا ان کے مابین اخذ و جذب اور شیر و شکر ہونے کا عمل زیادہ دلچسپ اور اہم نہیں؟ [تاریخ نے ثابت کر دیا کہ تہذیبوں کے تصادم کا مقصد مستقبل کی غارت گری تھا]۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایڈورڈ سعید جیسا عالم فاضل شخص بھی مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب کی اصل حقیقت، حیثیت اور ماہیت سے ناواقف ہے۔ اس لیے اسے امریکا اور مغرب کے وکیلوں کی جانب سے تصادم کا ''رجز'' پڑھنے والوں پر حیرت، تعجب اور تاسف ہوتا ہے۔ وہ کئی جگہ اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''امریکہ نے بھی اپنے کندھوں پر ''انسانی فلاح کا بوجھ لے رکھا ہے'' ہم امریکی انسان دوستی پر مبنی جنگیں لڑتے ہیں۔ ہم دوسروں کے بھلے کے لیے مہم چلاتے ہیں''۔ یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ یہ وہی خبط ہے جس کے اسیر انیسویں اور بیسویں صدی میں برطانیہ اور فرانس وغیرہ تھے۔ کپلنگ کی شاعری White Man's Burden میں بیان کردہ نوادرات اور دوسری قوموں کے بارے میں Half Devil and Half Child جیسے تصورات کو ختم ہونا چاہیے۔ ایڈورڈ سعید مغربی فکر کی وحشت و بہیمیت سے صرف نظر کرتے ہوئے حسن ظن کا شکار ہو گئے ہیں۔

تہذیبوں کا تصادم: تازہ تشریح: جمہوریت مذہب ہے:

تہذیبوں کے تصادم پر مبنی فلسفے کی تازہ شرح رچرڈ رورٹی نے اپنی کتاب Achieving Our Country میں بیان کی ہے جس میں وہ جمہوریت پر عمل کو مغرب کی بنیادی ایمانیات کا حصہ بتاتا ہے اور اس کی عقلی دلیل دینے سے انکار کرتا ہے۔ وہ ولیم جیمس کے حوالے سے لکھتا ہے کہ جمہوریت ایک قسم کا مذہب ہے اور ہر مذہب کی طرح جمہوریت بھی اپنی ناکامی کے امکان کو ماننے سے انکاری ہے۔ [page 9]

مغربی عقلیت: جواز کی دلیل بے کار ہے:

وہ لکھتا ہے کہ مغرب اور امریکا کو اپنے علوم و فنون اپنی اقدار، جمہوریت و سرمایہ داری کی علمی بنیادوں کو مستحکم کرنے کا خیال ترک کر دینا چاہیے کیونکہ اس قسم کے جواز کی اسے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مغربی عقلیت کی برتری اور اس برتری کے جواز کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ وہ آج ایک غالب قوت ہے۔ وہ افسوس کرتا ہے کہ عام امریکی شہری امریکی اقدار اور امریکی نظام کے بارے میں شرمسار ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ مغربی اقدار پر

ایمان لانے کے لیے کسی علمی دلیل کی ضرورت نہیں "کیونکہ "ان معاملات کا تعلق دلیل سے نہیں ہے بلکہ ایمانیات سے ہے اور ایمانیات کا مرتبہ یہ ہے کہ ان کو پرکھنے کے لیے کوئی غیر جانبدارانہ اور معروضی پیمانہ ہو ہی نہیں سکتا۔ [p.13]وہ لکھتا ہے کہ امریکا دنیا کی وہ پہلی ریاست ہے جس کا بنیادی مقصد صرف اپنی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ امریکا اپنے سوا کسی کی خوشنودی نہیں چاہتا حتیٰ کہ اس کو خدائی خوشنودی بھی درکار نہیں ہے۔ ہم آج دنیا کی سب سے عظیم الشان طاقت اس لیے ہیں کہ ہم نے خدا کو ہٹا کر اس کی جگہ خود لے لی ہے ہم آج دنیا کی عظیم الشان طاقت اس لیے ہیں کہ ہم خود خدا بن گئے ہیں۔ [p.22]وہ لکھتا ہے کہ حق اور سچائی اور اچھائی وہ ہے جس کے ذریعے انسان کی خواہشات کی تکمیل بہتر سے بہتر طریقے پر ہو سکے۔

تمام اسلامی جدیدیت پسند جمہوریت، بنیادی حقوق کی تائید و حمایت کے ذریعے اسی فلسفے کی تصدیق و توثیق کر رہے ہیں۔ ہنٹگٹن کا دعویٰ ایک بے بنیاد دعویٰ ہے۔ کیونکہ مغربی تہذیب کی شکست کا پہلا مرحلہ ماڈرن ازم سے پوسٹ ماڈرن ازم تک کا سفر ہے جب عقلیت پرستی عالمگیر اقدار، [یونیورسل ویلیوز] عالمی قوانین، عالمی روایات [یونیورسل ٹرینڈز] سے ایمان اٹھ گیا ہے اور عقل حقیقت کلی تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں رہی، عقل کی ہلاکتیں تحدیدات اور تناقضات اور تضادات مغرب پر عیاں ہو گئے ہیں۔

مغرب کو شکست ہو چکی ہے:

نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ عقل کی بنیاد پر ایسے قوانین دریافت کر سکتی ہے جس کے نتیجے میں کسی ذی عقل کے لیے مغربی نظام اقدار و روایات کو مسترد کرنا ناممکن ہو جائے گا اور یہی عقلی نظام عالمگیری نظام ہو گا۔ پس جدیدیت پسند مفکرین Post Modernist Thinkers نے ثابت کر دیا کہ یہ دعویٰ جھوٹا ہے لیکن مابعد جدیدیت کے علمبردار تسخیر کائنات، آزادی کے بنیادی آدرشوں سے دستبردار نہیں ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ آزادی جمہوریت سرمایہ داری کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ان معنوں میں مغرب کو شکست ہو گئی کہ وہ اپنے وجود کا علمی، عقلی، عملی، فلسفیانہ جواز فراہم نہیں کر سکا۔ پس جدیدیت پسند مفکرین کا موقف یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم کیوں سرمایہ دارانہ نظام کو بالادست کرنا چاہتے ہیں البتہ ہم اس پر مجبور ہیں کہ پورے عالم پر آزادی اور سرمایہ داری کو غالب کر دیں یہ عقل کا تقاضہ نہیں بلکہ جو کچھ ہم کہتے رہے ہیں اس کا لازمی ذریعہ اظہار ہے ہمارے پاس سرمایہ دارانہ نظام، آزادی کے سوا کوئی اور متبادل نہیں ہے۔

اس صورت حال میں امام غزالی عالم اسلام کے لیے امید کی کرن بن کر طلوع ہوتے ہیں۔

The Ghazalian position is at loggerheads with these apologetic attitudes. It does not see the West as a morally,

epistemologically or ontologically superior civilization. There can be no 'scientific' proof of the superiority of Western thought. The Ghazalian approach does not see any of the streams of Western civilization as the continuation of the spirit of Islam.

ہنٹنگٹن کا فلسفہ: اس کے نتائج:

فرانسس فوکویاما کے End of History کے فلسفے کو تسلیم کرنے کا مطلب دستوریت، آزادی، سرمایہ داری، جمہوریت، لبرل ازم، مساوات، کو عالمی مسلمہ غیر متنازعہ اقدار (Narratives) تسلیم کرنا ہے۔ ایک ایسا نظام اقدار جس کا کوئی متبادل نہیں جس سے فرار ممکن نہیں، اور ان اقدار کے سوا دوسری اقدار قابل قبول نہیں، اس فلسفے کے مداحین کے طور پر برنارڈ لوئس اور ہنٹنگٹن تہذیبوں کے مابین تصادم کو لازمی سمجھتے ہیں جس تہذیب کے پاس حق ہے وہی تہذیب زندہ رہے گی۔ اور اب آخری قطعی اور عالمی حق صرف مغرب کے پاس ہے لہٰذا صرف مغربی تہذیب کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے یہی تہذیب فائق، برتر، غالب حاکم، نافذ اور رائج ہونے کا حق رکھتی ہے باقی تہذیبیں مطیع اور فرماں بردار بن کر اس تہذیب کا جزو بن جائیں یا اس میں ضم ہو جائیں یا جنگوں کے ذریعے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں اس فکر و نظر کو تسلیم کر کے مغرب اور مشرق کے مفکرین اس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں کہ دستوری جمہوریت پر پوری دنیا ایمان لا چکی ہے بنیادی حقوق کو سب نے مسلمہ اقدار تسلیم کر لیا ہے لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ یہ تمام فلسفے کہاں سے آئے ہیں، دنیا کو ایسی مستند اور مسلمہ اقدار کس نے مہیا کی ہیں جو ناقابل تغیر ہیں۔ کوئی یہ سوال پوچھنے پر یہ نہیں بتاتا کہ اگر دستوری جمہوریت پر پوری دنیا ایمان لا چکی ہے تو کیا دستوری جمہوریت کا وجود اور ارتقا فطری طور پر ہوا ہے۔ کیا سرمایہ دارانہ نظام فطری طور پر قائم ہوا ہے، کیا مارکیٹ، بینک اور دستوری ریاست دستوری جمہوریت خود بخود فطری طور پر وجود میں آ گئے اگر ایسا ہے تو واقعی تاریخ اختتام پذیر ہو چکی ہے لیکن اصلاً ایسا نہیں۔ قرآن کی آمد کے بعد تاریخ کا سفر ختم ہو چکا ہے۔ خیر و شر، حق و باطل کے جو پیمانے قرآن نے دے دیے وہ قیامت تک کے لیے ہیں وہ ابدی ہیں ان کے سوا کسی پیمانے، کسی قدر، کسی اصول کو ابدیت حاصل نہیں ہے، انہی معنوں میں مغرب اور اسلام میں فکر و نظر کے بنیادی اختلافات ہیں جو علمیاتی ہیں اور محض گفتگو کے ذریعے حل نہیں ہو سکتے۔ جمہوریت، دستوری جمہوریت و ریاست وغیرہ مغربی افکار اور دعوے ہیں مسلمہ حقیقت نہیں۔ علی محمد رضوی اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

However this is too simplistic a genealogy of the emergence of constitutional democracy and I think cannot be sustained by historical data (see for example Moore, Jr., 1966). Rawls in accord with the "standard narratives of the rise of the liberal state presents the state as peacemaker, arising out of the "Wars of Religion" to keep peace among violent religious factions". However as William T Cavanaugh shows in his brilliant contribution "these wars were necessitated by the modern state's need to domesticate the Church and thereby achieve

مذہب:توہینِ رسالت

تعارف

مذکورہ تحریر جناب خالد جامعی صاحب جیسے اہل علم کے قلم کی علمی ضیا پاشی کا محکم مدلل ثبوت ہے ،جو اپریل کے ال برھان ۔۔۲۰۱۶۔میں طبع ہوا تھا ۔اور اب أن لا ین اشاعت کے لئے محترم خالد جامعی صاھب نے خاکسار کو اجازت مرحمت فرمائی ہے۔جامعی صاھب کے تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کی مانند ہے مغربی تھذیب و تمدن اور فلسفہ سائنس و جدید مابعد الطبیعات و پس جدیدیت پر انھیں عبور حاصل ہے۔

میرا انکا ساتھ کل چھ سال پرانا ہے،میں جب بھی ان سے ملنے گیا انھونے کامل مشفقت کا مظاہرہ فرمایا ،بلخصوص درجہ تخصیص کے لئے ذاتی لا ئبیری کے قیام کے لئے ان کے سفارشی خطوط سے بھی میں مستفید ہوا۔جامعی صاحب مسلم روایتی فکر سے علیجدہ راہ کی جگہ سلف و خلف کی راہ پر چلنا اپنا سرمایہ حیات تصور کرتے ہیں ،جب میں نے انکی تحریک کو مکتبہ جامعین کے لقب سے موصوف کیا تو فرمایا نہی ھم تو مسلم امہ کا ہی ایک جز ہیں اس سے ماورا کچھ نہیں ۔

اس مضمون میں عشق رسول سے سرشار ہوکر انھونے اسلامی فکر کا تجزیہ ،جدید مسلم مفکرین پر نقد اور پاکستانی پس منظر کو سامنے رکھ کر علمی منظر نامہ پیش فرما یا ہے ،ممتاز قادری انکی نظر میں شھید حق ہے،کیوں ہے،کیسے ہے ،کس لئے ہے ؟ یہ سب جواب تو مطالعہ سے ہی واضح ہونگے،کئی جگہوں پر اختلاف کی گنجائش موجود ہے ،مگر انکا تعلق مغربی فکر سے نہیں بلکہ کچھ اسلامی واقعات کے تزکروں کے ضمن میں کیا جا رہا ،جیسے امام ابو حنیفہ ،و مالک پر کوڑوں کے ضمن میں کیا گیا ہے،حلانکہ یہ روایات صحیح شواید سے صرف امام احمد کے ضمن مٰیں ثابت کی جاسکتی ہیں،لیکین بھر حال لوگوں میں ویی مشہور ہے جسکا انھونے ذکر فرمایا۔اس کے ساتھ ،شاتم رسول کی سزا موت ہے یہ ایک متفقہ امر ہے،جس پر امام ابن تیمیۃ کی مشیور کتاب : الصارم المصلول علیٰ شاتم رسول ﷺ مو جود ہے،مگر اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ صرف الزام لگا کر خود ہی ھلاک نہیں کیا جاسکتا گواٖہوں کی گواہی کی ضرورت بحر حال لازماً پڑتی ہے ۔ کسی

ملزم کا اعتراف بھی لازما گواہوں کا نعم بدل ہے جیسا کہ جامعی صاھب نے صراحت کے ساتھ تذکرہ فرمایا ہے کہ جسٹس نذیر ،حنیف قریشی و مفتی منیب نے عدالت میں ثبوت پیش کئے تھے مگر بیرونی دباو اور ذاتی نظریاتی بنیادوں پر ممتاز قادری کے معاملے کو پاکستانی مقدمات کے مروجہ معیار سے ہٹ کر تیزی سے نمٹایا گیا ،کیونکہ انھونے ایک عام ۰ أدمی ہوکر ایک سیاسی و مالی اشرافیہ کے رکن کو نشانہ بنایا تھا ۔

یہ مضمون در حقیقت مغربی اصول تھذیب و تمدن کو دریا سے اٹھا کر کوزے میں بند کر کے قاری کی علمی أبیاری کرتا ہے جس کے لیے جامعی صاحب بلا شبہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

محمد علی جنید

ریسرچ اسکالر ،جامعہ کراچی

قانون توہین رسالت کا اطلاق

سیّد خالد جامعی

شہید ممتاز قادری کو پھانسی دیے جانے پر غامدی صاحب سے کسی نے ٹیلی فون پر سوال کیا (۱) کیا ان کو شہید کہا جا سکتا ہے؟ (۲) کیا کسی اسلامی ملک کا شہری کسی دوسرے شہری پر خود حدود و تعزیر جاری کر سکتا ہے؟ (۳) اگر پاکستان بالفرض دار الحرب ہے تو کیا اس صورت میں اس کو دار الحرب سمجھنے والے کا کسی شہری پر از خود حدود و تعزیر جاری کرنا شرعاً جائز ہوگا یا نہیں؟ کیونکہ اجماع امت ہے کہ دار الحرب میں اسلامی شریعت کا نفاذ نہیں ہو سکتا نفاذ شریعت کے لیے دار الاسلام کا وجود لازم ہے۔

اس سے پہلے کہ ہم ان سوالات کے بارے میں غامدی صاحب کے تفردات علمی آپ کے سامنے پیش کریں ایک نہایت اہم نکتے کا جائزہ لینا ضروری ہے جو شہید ممتاز قادری اور جاوید غامدی صاحب کی شخصیت میں بنیادی فرق واضح کرتا ہے وہ فرق ہے صداقت کے لیے عزیمت کا اظہار ——— یعنی ایمان کی شہادت اپنے خون سے دینے کی روایت۔

شہید ممتاز قادری جس علمیت پر یقین رکھتے تھے خواہ وہ غامدی صاحب کی نظر میں غلط ہی ہو انھوں نے اُس علمیت کے مطابق عمل کیا اور خدا کے حضور حاضر ہو گئے انھوں نے معافی مانگنے سے انکار کیا اور اپنے لہو کی لکیر سے ایمان کی شہادت دی۔

ضروری ہے کفن بردوش رہنا وطن ہے کوچۂ قاتل ہمارا
ہمیں روکے گی کیا دیوار تہمت محرک ہے خلوص دل ہمارا
ہمارے آنسوؤں اور التجا کو ترستا رہ گیا قاتل ہمارا

غامدی صاحب جس علمیت پر یقین رکھتے ہیں اس پر خود عمل نہیں کرتے ان کا اجتہاد ہے کہ داعی اپنی قوم کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا کیوں کہ داعی کے لیے اصل مخاطب کی حیثیت اس کی اپنی قوم کو حاصل ہے یہ قرآن کی نص ہے لینذروا قومھم اذا رجعوآ الیھم [غامدی، میزان، لاہور، المورد، طبع دہم، ۲۰۱۵ء ص ۵۵۰] اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ظالم حکمرانوں کا ظلم بھی انھیں [داعی کو] دعوت کے کام سے باز نہ رکھ سکے [میزان، ص ۵۵۱، محولہ بالا] قرآن کے نصوص کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اور اپنے ہی اصول اور اجتہاد کو پامال کر کے غامدی صاحب نے ملائشیا میں خود ساختہ جلا وطنی اختیار کر لی جبکہ حکمران، طاقت کے تمام مراکز، میڈیا، ریاست اور حکومت سب غامدی صاحب کے حامی تھے کوئی ان پر ظلم نہیں کر رہا تھا صرف عوام ان کے مخالف تھے انسانی تاریخ کے یہ پہلے مصلح [Reformer] ہیں جو حکمرانوں کے دل میں رہتے ہیں لیکن عوام کے دلوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ غامدی صاحب کا ہی اصول ہے جو میزان میں بیان ہوا ہے "آدمی اگر اپنے اجتہاد یا گمان کے مطابق کسی چیز کو دین و شریعت کا تقاضہ سمجھتا ہے تو اس سے قطع نظر کہ وہ فی الواقع شریعت کا حکم ہے یا نہیں اس کی خلاف ورزی اس کے لیے جائز نہیں [میزان ص ۳۶۶ محولہ بالا] اس اجتہاد کی روشنی میں ان کی جلا وطنی ان کے اصول اور اجتہاد کے خلاف ہے اور حرام ہے۔

کیا ایسے عالم سے دین اخذ کیا جا سکتا ہے جو اپنے ہی اصول پر عمل نہ کرتے ہوں۔ خود غامدی صاحب کا اجتہاد ہے داعی کے قول و عمل میں کسی پہلو سے کوئی تضاد نہ ہو وہ جس حق کی طرف لوگوں کو دعوت دیں ان کا عمل بھی ان کی شہادت دے، دعوت بے عمل واعظوں کا نہیں بلکہ ارباب عزیمت کا کام ہے جو سب سے پہلے اپنے نفس کو مخاطب بناتے اور پھر اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ بالکل آخری درجے میں اس حق کو اختیار کرے [میزان ص ۵۵۲ محولہ بالا] غامدی صاحب کے اصولوں کے تحت غامدی صاحب جیسے عالم بے عمل کے تفردات کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس کے مقابلے میں شہید ممتاز قادری عالم با عمل ہے انھوں نے امت کی اجماعی علمیت سے جو فہم دین حاصل کیا اس پر عمل کر کے دکھایا اور عزیمت کے اس کام کو بالکل آخری درجے تک پہنچا کر زمین و آسمان میں زلزلہ اور مردہ دلوں میں ولولہ پیدا کر دیا۔ شہید ممتاز قادری اس قافلہ عزیمت کے سپہ سالار تھے جس کے لیے یہ عارضی زندگی کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو ہتھیلی پر سروں کے چراغ جلاتے ہیں وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کے لیے کہا گیا ہے

ہزار بار مجھے لے گیا ہے مقتل میں وہ ایک قطرۂ خوں جو رگِ گلو میں ہے

غامدی صاحب کے تفردات پر تنقید سے پہلے ایک اہم ترین انکشاف غامدی صاحب کی علمیت کے مصادر سے متعلق ہے "میزان" کے باب "قانون جہاد" میں

انہوں نے امت کے اجماع سے ثابت اقدامی جہاد کا انکار کیا ہے اس تصور جہاد کی روشنی میں اسلامی تاریخ کے تمام جہاد دہشت گردی کے زمرے میں آتے ہیں غامدی صاحب نے جہاد کا یہ فلسفہ خود تخلیق نہیں کیا بلکہ یہ فلسفہء جہاد فرانسیسی مفکر رینے گینوں (یحییٰ نورالدین) کے گمراہ روایتی مکتب فکر [Traditional School of Thought] کے اہم محقق ولیم چیٹک کی کتاب Vision of Islam اور ڈاکٹر حسین نصر کی کتاب Islam in the Modern World اور مرزا غلام احمد قادیانی کے صاحبزادے مرزا بشیر الدین محمود کی کتاب " دعــو ــة الامیــر " کا لفظ بہ لفظ، حرف بہ حرف سرقہ اور چربہ ہے۔ روایت کا مکتب فکر وحدت ادیان کے کفر کا قائل ہے اس مکتب فکر کے یہاں غامدی صاحب کی طرح اسلامی ریاست، سیاست، خلافت، قوت طاقت، کی بحث سرے سے ناپید ہے یہ مکتب فکر اسلامی سائنس، اسلامی فن تعمیر، اسلامی فنون کے احیاء کی بات کرتا ہے مگر یہ نہیں بتاتا کے ان سب کا احیاء اسلامی ریاست کے احیاء کے بغیر کیسے ممکن ہے۔

مرزا بشیر الدین محمود کی کتاب " دعــو ــة الامیــر "۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے یہ کتاب اصلاً ایک فارسی مکتوب ہے جو امیر افغانستان امیر امان اللہ خان کے نام قادیانی مذہب کی دعوت پہنچانے کے لئے تحریر کیا گیا تھا اس مکتوب کے اردو ترجمہ کا نام بھی " دعوۃ الامیر " ہے۔ ہمارے سامنے کتاب کی نویں اشاعت ہے جو ۱۹۷۹ء میں ضیاءالاسلام پریس ربوہ سے شائع ہوئی اس کے ناشر الشرکۃ الاسلامیہ ربوہ ہیں۔ کتاب کے صفحہ ۴۲ تا ۴۷ میں قادیانیت کا نظریہ جہاد بیان کیا گیا ہے۔ غامدی صاحب نے ان چھ صفحات کا خلاصہ اور قرآن کی آیتیں بھی اپنے قانون جہاد میں سرقہ کر کے شامل کردیں۔

غامدی صاحب کی عربی دانی کا یہ حال ہے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں چھبیس صفحے کا صرف ایک عربی مضمون " شــواهــد الفراهی " کے نام سے لکھا۔ یہ مضمون ان کی کتاب مــقـامات طبع دوم ۲۰۰۶ء میں شامل تھا اس مضمون میں عربی کی چھ سو پچاس اغلاط تھیں جن کا تنقیدی جائزہ ڈاکٹر رضوان ندوی نے لیا یہ جائزہ ماہنامہ ســاحــل کے شمارہ اپریل ۲۰۰۷ء میں پیش کیا گیا جس کے بعد غامدی صاحب نے یہ کتاب بازار سے غائب کرادی اور یہی کتاب مــقــامــات کے نام سے صرف اردو میں طبع اول ۲۰۰۸ء میں شائع کرائی جس میں سے یہ عربی مضمون نکال دیا گیا۔ اشراق میں سترہ سال تک ان کی عربی تفسیر " الاشراق " کا اشتہار چھپتا رہا اب عربی تفسیر کا نام غامدی صاحب نے اپنی زیر طبع کتب کی فہرست سے بھی خارج کردیا۔ اس قسم کے متجددین کے تفردات کی علمی دنیا میں کیا حیثیت ہوگی اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

اس سوال کے جواب میں کہ کیا وہ شہید ہیں؟ حضرت غامدی صاحب نے فرمایا ممتاز قادریؒ صاحب کو شہید کہنا یہ توہین عدالت ہے پاکستان ایک اسلامی ملک ہے اسلامی عدالت کے فیصلے کی توہین اسلام کی توہین ہے ممتاز قادری سرکاری ملازم تھا اس نے لوگوں کی حفاظت کا حلف اٹھایا تھا اسے سب سے پہلے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دینا چاہیے تھا آسیہ بی بی، تاثیر صاحب قادری صاحب قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ قادری صاحب نے دہشت گردی کا ارتکاب کیا ہے۔

غامدی صاحب کے اجتہادات اور اجتہادی فتوے اپنی جگہ ___ سوال یہ ہے کہ کیا ممتاز قادریؒ ملازمت سے استعفیٰ دے کر سلمان تاثیر کو قتل کردیتے تو کیا یہ جائز ہوتا ؟ غامدی صاحب کو یہ بھی نہیں معلوم کہ شہید ممتاز قادری نے سلمان تاثیر کو قتل کر کے صرف ملازمت سے استعفیٰ نہیں دیا صرف ملازمت ہی نہیں چھوڑی بلکہ اس دنیا کی عارضی زندگی کو بھی چھوڑ دیا۔

مرکب پہ تنِ پاک تھا اور خاک پہ سر تھا اس خاک تلے جنت فردوس کا در تھا

غامدی صاحب کا یہ ارشاد کہ ممتاز قادریؒ نے گورنر کی حفاظت کا حلف اٹھایا تھا ایک کمزور دلیل ہے۔ شہید ممتاز قادریؒ نے سب سے پہلے اسلام اور ایمان کی شہادت کا حلف اٹھایا تھا۔ ایک مسلمان کا کام اللہ کی بندگی اور اس کے رسولؐ کی محبت میں زندگی بسر کرنا ہے۔ شہید ممتاز قادریؒ نے توہین رسالت کے دریدہ دہن مجرم کی حفاظت کا حلف نہیں اٹھایا تھا جس نے براہ راست شہید ممتاز قادریؒ کے سامنے ذات رسالت مآبؐ کی شان میں توہین آمیز جملے ادا کیے۔ سلمان تاثیر کی جانب سے توہین رسالت کے تمام شواہد ثبوت، دلائل علماء وکلاء، مفتی منیب الرحمان، مولانا حنیف قریشی اور جسٹس نذیر غازی نے نہایت کثرت سے اور تفصیل کے ساتھ پیش کیے ہیں جنھیں سلمان تاثیر کے صرف دوسطری وضاحتی بیان کی روشنی میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وضاحتی بیان کے بعد بھی سلمان تاثیر کی جانب سے توہین رسالت کے ساتھ ساتھ ___ توہین رسالت کے قانون کی توہین کا سلسلہ متواتر جاری رہا۔

حیرت ہے کہ غامدی صاحب نے کبھی گورنر کو سرکاری نوکری سے استعفیٰ کا مشورہ نہیں دیا کہ وہ اپنی نوکری سے استعفیٰ دیتے اور (نعوذ باللہ) کالے قانون کے خلاف مہم چلاتے۔ اپنے عہدے سے استعفیٰ دینے کا اجتہاد غامدی صاحب نے صرف ممتاز قادری کے لیے کیا ہے یہی اجتہاد سلمان تاثیر کے لیے نہیں کیا گیا یعنی متجددین اجتہاد میں

بھی مساوات قائم نہیں رکھ پاتے۔لبرل انسان کے لیے نرم اجتہاد کرتے ہیں۔راسخ العقیدہ مسلم کے لیے سخت اجتہاد اور باتیں مساوات کی کرتے ہیں۔

پاکستانی ریاست نے سلمان تاثیر کی جانب سے توہین رسالت کے قانون کی مخالفت اور توہین رسالت کے ارتکاب کے معاملے کو تحقیقات کے لئے کسی عدالتی کمیشن کے سپرد کرنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی نہ سلمان تاثیر کو اخباری مہم جوئی، بیان بازی سے روکا۔ پاکستان کی تاریخ کا یہ پہلا حکمران تھا جو اپنے حلف کی خلاف ورزی کے ساتھ ساتھ اپنی ہی حکومت اور اپنی ہی عدالت کے قانون اور فیصلوں کے خلاف مسلسل زہر اُگل رہا تھا اور قانونی طریقے اختیار کرنے کے بجائے عوامی بیانات پر اکتفا کر رہا تھا۔آسیہ بی بی کے خلاف آنے والے عدالتی فیصلے کے خلاف اپیل کے فیصلے کا انتظار کرنے کے بجائے وہ مہم جوئی کے سفر پر روانہ ہوگئے۔سلمان تاثیر کی تمام سرگرمیوں کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا تھا کیوں کہ دنیا کی پہلی نظریاتی اسلامی مملکت کے اسلامی گورنر اپنی عدالت کو جواب دہ ہی نہیں تھے۔دوسرے معنوں میں قانون پر عمل صرف اور صرف ممتاز قادری کو کرنا چاہیے تھا کیوں کہ اسے آئین نے کوئی استثناء نہیں دیا۔اسلامی ریاست میں عدالتی کاروائی کے موقع پر شہری اور حکمران برابر نہیں ہوتے۔صرف شہری کا کام قانون کی پابندی کرنا ہے،حکمران کا کام لاقانونیت پھیلانا ہے۔بے چارے علمائے کرام کو ابھی تک یہ بات سمجھ نہیں آئی کہ جدید ریاست کیا ہوتی ہے اور کیا کرتی ہے۔

توہین رسالت کی شق ۲۹۵(سی) پاکستانی قانون کا حصہ ہے یہ شق ۱۹۸۶ء میں منظور ہوئی اس کے الفاظ ہیں۔

دفعہ 295۔سی:''جو کوئی عمداً زبانی یا تحریری طور پر یا بطور طعنہ زنی یا بہتان تراشی بالواسطہ یا بلاواسطہ،اشارتاً یا کنایتاً نام محمدؐ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توہین یا تنقیص یا بے حرمتی کرے وہ سزائے موت کا مستوجب ہوگا''۔

یہ قانون توہین رسالت کا اصل متن [Text] ہے اس میں کیا چیز غلط ہے اور سلمان تاثیر صاحب اسے کالا قانون کہہ رہے ہیں کیا یہ توہین رسالت کا ارتکاب ہے یا نہیں؟ سپریم کورٹ کہہ رہی ہے کہ اس قانون کو کالا قانون کہنا توہین رسالت نہیں ہے کیا سپریم کورٹ کا یہ موقف درست ہے؟ یہ مسئلہ بھی شریعت کورٹ میں پیش کرنا چاہیے۔

سلمان تاثیر کو توہین رسالت کا قانون اچانک گورنر بننے کے بعد قابل اعتراض نظر آیا۔گورنر بننے سے پہلے اس قانون کے خلاف انھوں نے کوئی جدوجہد نہیں کی ماضی میں وہ کبھی اس قانون کے خلاف عدالت نہیں گئے،کبھی اپنے آئینی عہدے کو استعمال کرکے پیپلز پارٹی کی حکومت سے اس قانون کو تبدیل کرانے کی کوشش نہیں کی انھوں نے قانون کے مطابق عمل کیوں نہیں کیا اور اس کالے قانون (نعوذ باللہ) کی پاسداری کا حلف ہی کیوں اٹھایا،وہ حلف لینے سے انکار کر دیتے اور قانون کے خلاف مہم چلاتے تو سمجھ میں بھی آتا کہ وہ واقعی اپنے کفر میں مخلص ہیں اور بیرونی طاقتوں کے اشاروں پر کام نہیں کر رہے۔ سوال یہ ہے کہ پاکستان میں ہر قانون کا غلط استعمال ہو رہا ہے لیکن انھیں صرف توہین رسالت کے قانون کے غلط استعمال پر کیوں دکھ پہنچا،انھوں نے صرف آسیہ بی بی کے ساتھ پریس کانفرنس کیوں کی،اگر وہ جیلوں میں سڑنے والے ہر بے گناہ کے ساتھ بیٹھ کر پریس کانفرنس کرتے اور ہر قانون کے غلط استعمال پر احتجاج کرتے تو شاید ان کی بدنیتی چھپ سکتی تھی۔آسیہ کے خلاف عدالتی فیصلے کے خلاف جیل کے اندر ملزمہ کو ساتھ بٹھا کر سلمان تاثیر کی پریس کانفرنس خود توہین عدالت تھی لیکن آئین کے تحت گورنر کے خلاف کوئی کاروائی نہیں ہوسکتی تھی حالانکہ اسی عدالت نے توہین عدالت پر پاکستان کے وزیراعظم کو برطرف کر دیا تھا۔عدالت کی توہین پر وزیراعظم برطرف ہوسکتا ہے رسالت مآبؐ کی بار بار توہین پر گورنر برطرف نہیں ہوسکتا۔کیا پاکستانی آئین کی شان شان رسالتؐ سے بھی اونچی ہے؟ ہمارے علماء کسی عدالت کے سامنے یہ نقطۂ نظر پیش نہیں کر سکے۔سلمان تاثیر نے یہ بھی کہا تھا کہ صدر آصف زرداری اپیل میں آسیہ کو معاف کر دیں گے حالانکہ صدر سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد ہی آسیہ کو معاف کر سکتے تھے۔لیکن سپریم کورٹ کا فیصلہ آنے سے پہلے ہی گورنر تاثیر نے خود فیصلہ بھی سنا دیا یعنی گورنر صاحب کو یقین تھا کہ سپریم کورٹ کورٹ کا فیصلہ بھی آسیہ کے خلاف ہی آئے گا۔سلمان تاثیر کا یہ دعویٰ تھا کہ قانون توہین رسالت کا غلط استعمال کیا جا رہا ہے لیکن تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب سے یہ قانون نافذ ہوا ہے اس وقت سے لے کر آج تک کسی شخص کو اس قانون کے تحت پھانسی کی سزا نہیں ہوسکی اس قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے تمام انتظامات قانون میں موجود ہیں اور ایسے سخت انتظامات کسی اور قانون کے غلط استعمال کو روکنے کے لئے نہیں کئے گئے لہٰذا یہ بھی محض بہتان الزام دشنام طرازی ہے۔ یہ سلمان تاثیر کے جرائم کی مختصر فہرست ہے یہ دیدہ دلیری،یہ اعتماد اور یہ پس منظر،تاثیر صاحب کے دلائل اور ان کا جارحانہ انداز اگر کسی غیرت مند مسلمان کو اقدام پر آمادہ کرے تو یہ اقدام ایک اسلامی قدم ہے اس کی مذمت کی کوئی گنجائش نہیں۔ممتاز قادری کو جذباتی عاشق کہنا اسے قانون کا مجرم قرار دینا بالکل غلط بات ہے۔

سلمان تاثیر نے آئین کی دفعہ ۱۰۲ کے تحت اٹھائے گئے گورنر کے حلف کی توہین کی جب کہ وہ ریاست پاکستان کے ہر قانون کی پاسداری کا حلف اٹھا چکے تھے اس حلف کے تحت وہ عدالتوں کے دیے گئے فیصلوں کے بھی پابند تھے۔حلف کے الفاظ پڑھیے:

That, as Governorof Province of_______ I will discharge my duties, and perform my functions, honestly, to the best of my ability, faithfully in accordance with the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan and the law, and always in the interest of the sovereignty, integrity, solidarity, well- being and prosperity of Pakistan:

That I will preserve, protect and defend the Constitution of the Islamic Republic of Pakistan:

That, in all circumstances, I will do right to all manner of people, according to law, without fear or favor, affection or ill- will:

آسیہ بی بی ایک عیسائی عورت ہے جس پر الزام تھا کہ اس نے توہین رسالت کا ارتکاب کیا۔ پولس اور عدالت کے سامنے اس کے اعترافی بیان کے بعد الزام ثابت ہونے پر اس کے خلاف مقدمہ چلا، عدالت نے اسے سزا دی ابھی تک اس کی اپیل عدالت عظمیٰ میں زیر سماعت بلکہ مسلسل زیر التوا ہے ــــ سلمان تاثیر نے گورنر کے حلف کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پاکستان کے قانون کی مذمت کی جبکہ انہوں نے آئین اور قانون پاکستان کی پاسداری کا حلف اٹھایا تھا۔ انھوں نے آسیہ بی بی کے مقدمے میں عدالتی فیصلے کے باوجود اس فیصلے کے خلاف جیل میں پریس کانفرنس کی اور بعد میں توہین رسالت بھی کرتے رہے جس کے ثبوت پانچ سو علماء کے فتوے میں درج ہیں اور جسٹس نذیر احمد غازی نے وہ ثبوت عدالت میں بھی پیش کر دیے۔ اس حلف کے تحت وہ ریاست کے تمام اسلامی و غیر اسلامی قوانین [Laws] کی حفاظت کے ذمہ دار تھے انھوں نے توہین رسالت کے قانون کو کالا قانون کہہ کر اس کے خلاف اخباری مہم جوئی شروع کی ۔ ریاست عدالت سب خاموش رہے ۔ جسٹس نذیر غازی کی شہادت کے مطابق شہریوں نے گورنر کے خلاف پنجاب کے مختلف تھانوں میں FIR درج کرانے کی کوشش کی تو ہر جگہ ایک ہی جواب ملا کہ گورنر کے خلاف FIR کا اندراج نہیں کیا جاسکتا لوگوں نے گورنر کے خلاف راولپنڈی کی عدالت عالیہ میں آئینی درخواست دائر کی کہ سلمان تاثیر کو توہین رسالت کے قانون کے خلاف بیان بازی سے روکا جائے وہ توہین رسالت کے مرتکب ہو رہے ہیں انہیں ان کے عہدے سے برطرف کیا جائے سلمان تاثیر کے خلاف توہین رسالت کے تمام ثبوت بھی عدالت کے سامنے پیش کیے گئے تو عدالت نے اس درخواست کو مسترد کر دیا کہ گورنر کو آئینی تحفظ حاصل ہے ان کے اقدامات اور اعمال کو کسی عدالت میں چیلنج نہیں کیا جاسکتا ان کے خلاف مقدمہ دائر نہیں کیا جاسکتا۔ عدالت نے حکومت کو یہ ہدایت بھی نہیں کی کہ وہ گورنر کو اپنے حلف کی پاس داری کی طرف متوجہ کریں۔ واضح رہے کہ پاکستان کا آئین عین اسلامی ہے آئینی طور پر یہ ایک اسلامی ریاست ہے اور تمام مکاتب فکر کے علماء نے متفقہ طور پر ۱۹۷۳ء میں اس آئین پر دستخط کر کے اس کو اسلامی آئین کی سند بھی عطا فرمائی ہے تمام علماء اسمبلیوں میں اس آئین کا حلف بھی اٹھاتے ہیں۔ یہ غیر اسلامی شق کہ گورنر کے خلاف کوئی عدالتی کاروائی نہیں ہوسکتی۔ سلمان تاثیر کے قتل کا اصل سبب ہے۔ اگر آئین کی اصلاح کر دی جاتی یا علماء کے فتوے کو غلط ثابت کر دیا جاتا یا علماء اپنے فتوے سے خود رجوع کر لیتے اسلامی ریاست اپنے گورنر کو برطرف کر دیتی یا اس کے خلاف FIR کٹ جاتی، عدالتوں میں اس کے خلاف مقدمے چلتے رہتے یا عدالتی کمیشن قائم کیا جاتا تو شہید ممتاز قادریؒ کو عدالت، ریاست کے فرائض انجام دینے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ خلاء کبھی باقی نہیں رہ سکتا اسلام کے نام پر جو خلاء جان بوجھ کر باقی رکھا گیا شہید ممتاز قادریؒ نے اپنے ایمان سے اس خلاء کو پُر کر دیا۔ اس عمل کی علمیت اجماع امت سے ثابت ہے تمام مکاتب فکر اسے تسلیم کرتے ہیں اگر منشور انسانی حقوق اور پاکستانی قانون اجماع امت کو تسلیم نہیں کرتا تو وہ اپنی اصلاح کر لے امت کی علمیت اور اجماع امت کی اصلاح کی کوشش نہ کرے اسلام کا ہر وہ حکم جو قرآن سنت اور اجماع سے ثابت ہے پاکستان کے آئین پر بالا دست ہے۔ اسلامی قوانین کے عقلی دلائل پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں مغرب بھی اپنے معروضات اور مسلمات کی کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کرتا۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر ممتاز قادریؒ کو شہید کہنا توہین عدالت ہے تو پاکستان پیپلز پارٹی گزشتہ چالیس سال سے ذوالفقار علی بھٹو کو شہید کہہ رہی اور لکھ رہی ہے ــــ اخبارات میں بھٹو صاحب کے نام کے ساتھ شہید لکھا جاتا ہے اشتہارات شائع ہوتے ہیں پیپلز پارٹی کی قیادت چالیس سال سے بھٹو صاحب کو پھانسی دیے جانے کے فیصلے کو عدالتی قتل Judicial Murder کہہ رہی ہے ۔ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ سے بھٹو صاحب کو پھانسی کے فیصلوں کے خلاف پیپلز پارٹی کی قیادت کے ہزاروں بیانات اخبارات میں شائع ہو چکے ہیں۔ پیپلز پارٹی ہزاروں مرتبہ اس فیصلے کو منسوخ کرنے اور اس غلط فیصلے پر نظر ثانی کا مطالبہ کر چکی ہے۔ سپریم کورٹ اور فوج کے خلاف جتنا زہر پی پی نے اُگلا اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا اس زہر نا کی کی کچھ حقیقی وجوہات بھی ہیں جن کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن کسی نے آج تک اسے توہین عدالت نہیں کہا حتیٰ کہ عدالت عظمیٰ بھی اتنی روادار ہے کہ اس نے کبھی پیپلز پارٹی کے مسلسل مستقل جارحانہ بیانات پر اس کے رہنماؤں اور اخبارات کو توہین عدالت کا ایک نوٹس بھی جاری نہیں کیا

۴

عدالت کے فیصلوں کی چالیس سال سے توہین کرنے والی پیپلز پارٹی چار مرتبہ حکومت بھی بنا چکی ہے جبکہ توہین کا مجرم کبھی کسی سرکاری عہدے پر فائز نہیں ہوسکتا ـــــ غامدی صاحب نے اس بارے میں کوئی اجتہاد پیش نہیں کیا۔سوال یہ ہے کہ اگر ذوالفقار علی بھٹو کو شہید کہا اور لکھا جاسکتا ہے اور پی پی کی طرف سے عدالت عظمیٰ کو گالیاں بھی دی جاسکتی ہیں تو ممتاز قادری کو شہید کہنے میں توہین کا سوال کیسے پیدا ہو گیا؟ کیا بھٹو صاحب کے لیے کوئی خاص قانون اور ممتاز قادری صاحب کے لیے دوسرا قانون ہے یہ کیسا تخلیقی اجتہاد ہے؟ ممتاز قادری کو دہشت گردی کے الزام میں سزا سنانے والے جج نے فیصلہ سنانے سے پہلے کہا کہ اسلام کی رو سے تمہارا یہ اقدام جائز اور درست تھا لیکن ملکی قانون کے تحت میں تمہیں دہری موت کی سزا دیتا ہوں (ندائے خلافت جلد ۲۰ شمارہ ۴۰ ۱۱-۱۷ اکتوبر ۲۰۱۱ء ص ایک، اداریہ) دوسرے معنوں میں ممتاز قادری کا اقدام اسلامی قانون کی روشنی میں درست تھا لیکن ملکی سیکولر قانون کی روشنی میں غلط تھا غامدی صاحب نے اس موقع پر کوئی اجتہاد پیش نہیں کیا۔

جس زمانے میں غامدی صاحب جنرل پرویز کے مشیر خاص تھے اس زمانے میں جنرل صاحب نے چیف جسٹس افتخار چوہدری کو ایوان صدر طلب کر کے ان سے جبری استعفیٰ لینے کی کوشش کی اس کوشش میں جنرل کیانی بھی شریک تھے غامدی صاحب نے اس استبدادی موقع پر کوئی اجتہادی رائے پیش نہیں کی جدید اجتہاد استبداد اور استعمار کا ـــــ سرسید اور عبدہ کے زمانے سے چولی دامن کا ساتھ ہے۔

عدالت عظمیٰ کے چیف جسٹس افتخار چوہدری ۱۱ مئی کو کراچی کے دورے پر تشریف لائے تو ایم کیو ایم نے پرویز مشرف کے کہنے پر نہایت پُرامن، جمہوری، آئینی، سیاسی، احتجاجی، اجتماعی طریقے سے ایئر پورٹ کا گھیراؤ کر لیا اور چیف جسٹس کو ایئر پورٹ سے باہر نکلنے نہیں دیا عدالت عالیہ کے جج جو اپنے فرائض انجام دینے کورٹ آ رہے تھے انہیں ہجوم نے راستے میں جگہ جگہ روک کر واپس بھیج دیا عدالت اس دن معطل رہی۔سندھ ہائی کورٹ نے عدلیہ کے کام میں مداخلت، چیف جسٹس کو ایئر پورٹ سے باہر نہ نکلنے کے الزام میں ایم کیو ایم کے خلاف کاروائی شروع کی تو سندھ ہائی کورٹ کے کورٹ روم اور عدالت کے باہر ایم کیو ایم کے ہزاروں پرامن خاموش کارکن سیاسی، جمہوری، مذمتی، آئینی احتجاج کرنے جمع ہو گئے عدالت نے اپنے ارد گرد ہزاروں اجنبی چہرے دیکھے تو گھبراہٹ اور خوف کے باعث کاروائی کو معطل کر دیا مقدمہ ابھی تک چل رہا ہے۔اس توہین عدالت پر غامدی صاحب نے کوئی اجتہاد نہیں کیا نہ پرویز مشرف کی حمایت سے انکار کیا۔نہ عدالت کی عظمت کے قصیدے پڑھے،اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ جدید ریاست کا ہر عمل جائز ہوتا ہے خواہ وہ ریاست کے کسی بنیادی جزو کے ہی خلاف کیوں نہ ہو اور میکس ویبر Max Weber کے مطابق ریاست لامتناہی تشدد [Monopoly of unlimited violence] کا اختیار رکھتی ہے یعنی صرف جدید ریاست کو ہی یہ حق حاصل ہے کہ وہ منظّم استبدادی کاروائیاں کرسکتی ہے خواہ یہ کاروائیاں ریاست کے مخالفین کے خلاف ہوں، ریاست کی اصلاح کے طالب گروہوں کے خلاف ہوں یا ریاست کے اپنے ہی اجزاء کے خلاف ہوں۔خواہ ریاست کے سب سے معزز ادارے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے خلاف ہوں افتخار صاحب سے بندوق کی نوک پر جبری استعفیٰ طلب کرنا ـــــ کیا پرویز مشرف کا یہ اقدام دہشت گردی تھا یا نہیں ـــــ تو کیا اس عمل پر عدالت نے دہشت گردی کی دفعات کے تحت کارروائی کی یا نہیں؟ مسئلہ یہ ہے کہ ریاست جو کچھ بھی کرتی ہے اس کا قانونی جواز اسے ہمیشہ حاصل رہتا ہے۔اور غامدی صاحب ایسی جمہوری استبدادی ریاست کو عین اسلامی سمجھتے ہیں۔

عہد حاضر میں مغرب کی پیدا کردہ جدید قومی آمرانہ جابرانہ سیکولر جمہوری سرمایہ دارانہ ریاست کی طاقت اور قوت بہیمانہ جبلت کی حقیقت جاننے کے لیے Anthonoy Giddens،Haber Mass،Carl Schmit، Hans Kelsen،Gramsci،Focualt, John Lock, Hobbes کی کتابیں کلیدی رہنمائی مہیا کرتی ہیں مغرب کی تخلیق کردہ جدید ریاست کو ہر قسم کا اختیار قانونی طور پر حاصل ہے جبر پر صرف ریاست کا اجارہ ہے اس میں کوئی دوسرا شرکت نہیں کرسکتا۔James M. Lutz کی کتاب Global Terrorism، مائیکل گراس Michael L. Gross کی کتاب Moral Dilemmas of Modern War: Torture, Assassination, and Blackmail in an Age of Asymmetric Conflict اور Robert Pape کی کتاب Dying to win

Beau Grosscup کی کتاب Strategic Terror: The Politics and ethics of Aerial Bombardment۔

فرانسیسی فلسفی J.illul کی کتاب The Technological society طلال اسد کی کتاب On Sucide Bombing انتھونی گڈنز کی کتاب The nation state & violence اس موضوع پر اہم ترین کتابیں ہیں

بلدیہ ٹاؤن کی فیکٹری Ali Enterprises میں تین سو مردوں عورتوں کو زندہ جلا کر قتل کر دینے والوں کو دہشت گردی کے قانون کے تحت مقدمات کا سامنا کیوں نہیں ہے۔ آرمی پبلک اسکول کے حملے میں تو صرف ۱۴۱ بچوں کو گولیوں سے مار دیا گیا تھا لیکن ان تین سو مرد عورتوں کو تو جلا کر مارا گیا ان کی لاشیں آگ میں جلتی، چربی پگھلتی اور ہڈیاں چٹختی رہیں۔ اس اذیت ناک اور دردناک حادثے کا آرمی پبلک اسکول کے حادثے سے کوئی موازنہ ہی نہیں کیا جاسکتا۔ مگر دہشت گردی کی یہ بدترین کاروائی بھلا دی گئی یہ مرنے والے کسی کے دشمن، حریف، فریق اور حلیف بھی نہیں تھے انھوں نے کسی کے ماں باپ کے خلاف جنگ بھی نہیں کی تھی یہ تو کسی جنگ کا حصہ ہی نہیں تھے یک طرفہ دہشت گردی کی یہ ہولناک واردات کیوں فراموش کردی گئی یہ قومی سانحہ کیوں نہ بن سکی؟ حتیٰ کہ شرمین عبید نے بھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ جلتی ہوئی عورت کی پگھلتی ہوئی چربی سلگتے ہوئے بالوں اور مچلتے ہوئے جسم کی فلم تو بہت چلتی۔

یہ ریاست کی قوت کا اظہار ہے صرف ریاست پر اس کے اداروں پر حملہ بدترین دہشت گردی اور قومی سانحہ ہے کسی فیکٹری میں بے گناہ عورتوں پر بدترین حملہ صرف ایک افسوس ناک حادثہ، محض واقعہ اور سانحہ ہے سلالہ چیک پوسٹ پر حملے اور ڈرون حملوں کے سلسلے میں ریاست کے دو مختلف ردعمل اسی قوت اور جبروت کا اظہار ہیں۔

کراچی میں ڈکیتیوں کی وارداتوں میں بے تحاشہ اضافہ ہوا اور حکومت، پولیس، ریاست، ایجنسیوں نے کوئی کردار ادا نہیں کیا تو لوگوں نے موقع واردات پر ڈاکوؤں کو پکڑ پکڑ کر قتل کر دیا، زندہ جلا دیا، ڈنڈے مار مار کر نہایت وحشیانہ، ظالمانہ طریقوں سے ہلاک کر دیا۔ تب کسی NGO، کسی لبرل نے اس عمل کو دہشت گردی قرار نہیں دیا۔ شرمین عبید چنائے نے انسانیت کی اس تذلیل پر کوئی فلم نہیں بنائی، کوئی NGO مقتولین کے غم میں موم بتیاں جلانے، کبوتر اڑانے، چراغ بجھانے اور پھولوں کی پتیاں نچھاور کرنے کے لیے نہیں آئی۔ کیوں کہ اس دہشت گردی سے عوام کا کتھارسس ہوا، ریاست مضبوط ہوئی، لوگوں کا غصہ ریاست کی طرف منتقل نہیں ہوا، کسی کو سول سوسائٹی، انسانی حقوق، آئین و قانون کی پاسداری کا خیال نہیں آیا۔ چیف جسٹس افتخار چوہدری نے اس دہشت گردی کا suomoto نوٹس تک نہیں لیا۔ پاکستان میں اس دہشت گردی کی اجازت کس قانون کے تحت دی گئی؟ تمام عدالتیں، حکومت، ریاست NGOs سب چپ رہے جب لوگ اپنے مال کے ڈاکو کو قتل کر رہے تھے اور ریاست چپ تھی تو اگر کسی شخص نے اپنے ایمان کے ڈاکو کو قتل کر دیا تو ریاست کیوں حرکت میں آ گئی؟

اگر ممتاز قادری کا فعل دہشت گردی تھا تو کراچی میں ڈاکوؤں کی زندگی چھیننے والے ڈاکوؤں کو زندگی سے محروم کرنے والے شہری ڈاکوؤں کے لیے دہشت گردی کی اصطلاح کیوں استعمال نہیں کی گئی اور ان کو دہشت گرد قرار دے کر ان کے خلاف مقدمہ کیوں نہیں چلایا گیا۔ عوام کو کس نے اختیار دیا کہ وہ مال پر ڈاکہ ڈالنے والے مہذب متمدن شہریوں کی زندگی پہ سر عام ڈاکہ ڈالیں اور دہشت پھیلا کر دہشت زدہ کر کے کسی عدالتی فیصلے کے بغیر خود سر عام بے دردی سے ملزموں کو مجرم قرار دے کر خود ہی قتل کر دیں۔ ریاست کی قوت اور قانون کی بالادستی تب کہاں رہ گئی تھی؟

کوئٹہ میں خروٹ آباد میں ازبک شہریوں کو سڑک پر نہایت بے دردی کے ساتھ دہشت گرد قرار دے کر قتل کر دیا گیا۔ تحقیقات ہوئیں، دہشت گرد بے گناہ قرار دیئے گئے، مگر اس حادثے میں دہشت گردی کا مقدمہ نہیں بنایا گیا۔ چیف جسٹس افتخار چوہدری جو بات بات پر سوموٹو نوٹس کے تحت مقدمات قائم کرتے تھے انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ اگر آئندہ پولیس مقابلے میں ملزم، مجرم یا بے گناہ لوگ مارے گئے تو اس واردات کا مقدمہ دہشت گردی کی دفعات کے تحت پولیس والوں اور محکمہ پولیس کے سربراہ اور وزیر داخلہ کے خلاف قائم کیا جائے گا کیوں کہ صرف جدید ریاست کو دہشت گردی کا اختیار حاصل ہے وہ جو چاہے کرے۔ لاہور میں ریمنڈ ڈیوس نے دہشت گردی کا ارتکاب کیا ایک غیر ملکی شہری نے پاکستانی شہریوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کیا وہ دہشت گردی کے دائرے میں آتا تھا لیکن اس کے خلاف دہشت گردی کا مقدمہ درج نہیں کیا گیا مگر ایک عاشق رسول کے خلاف دہشت گردی کے الزام میں مقدمہ درج کیا گیا کیا عشق رسالتؐ اور دہشت گردی مترادف اصطلاحات ہیں؟ یہ مسئلہ بھی وفاقی شریعت عدالت کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے۔

پنجاب میں بسنت کے میلے کے موقع پر ہر سال کئی بچوں اور لڑکیوں کی گردنیں مانجھے سے کٹ جاتی ہیں سینکڑوں بچے چھتوں سے گر کر معذور ہو جاتے ہیں ہزاروں لوگ زخمی ہوتے ہیں سپریم کورٹ نے پتنگ سازی پر پابندی عائد کی تو پتنگ والے احتجاجی جلوس لے کر پہنچ گئے کہ ہم بھوکے مریں گے۔ لوگوں کی گردنیں کاٹنا اور اس عمل کو اپنے روزگار کے جواز کے طور پر پیش کرنا اور اس پر احتجاج بھی کرنا کیا دہشت گردی کی بدترین صورت نہیں ہے۔ کیا بچوں کی گردن کاٹنے والے اور بچوں کو پتنگوں کے ذریعے چھتوں سے زمین پر گرانے والے دہشت گرد نہیں ہیں۔

٦

آج تک کسی NGO نے، ہیومن رائٹس کمیشن آف پاکستان نے بسنت پر پابندی کا مطالبہ نہیں کیا شرمین عبید کو بھی فلم بنانے کا خیال نہیں آیا کہ یہ کیسا ملک ہے جہاں ہر سال ماؤں کے لال کی گردن پتنگ کی ڈور سے کاٹ دی جاتی ہے روتی ہوئی ماں، کٹتی ہوئی گردن، زمین پر خون کا ساگر، بلکتی ہوئی بہن، مچلتے ہوئے ننھے بھائی، باپ کے آنسو، عورتوں کی آہ و بکا ان دل دوز مناظر کی عکس بندی کی کوشش اصلاً آزادی کے عقیدے [Faith of Freedom] کے لیے تباہ کن ہے ایسی فلموں پر آسکر ایوارڈ نہیں مل سکتا لہٰذا آزادی کے عقیدے کی بھاری قیمت ادا کی جارہی ہے بسنت کے قتل دہشت گردی نہیں ہیں۔ یہ آزادی Freedom کے عقیدے کی خونی گواہی ہے آزادی میں اضافے کے لیے خون کا بہنا اور بہانا بھی جائز ہے بسنت کے میلے سے لوگوں کی آزادی، لذت، افادہ، مزوں میں اضافہ ہوتا ہے لہٰذا یہ عمل کانٹ کے فلسفہء اخلاق کے تحت بالکل ٹھیک ہے۔ مغرب اسے پسند کرتا ہے لہٰذا کوئی عالمی تنظیم، انسانی حقوق کا کوئی علم بردار، کوئی NGO، HRCP، بسنت پر پابندی کا مطالبہ نہیں کررہے۔

جدیدیت، سیکولرازم اور لبرل ازم میں آزادی میں اضافے کی خاطر لذت مسرت [Pleasurism] کے لیے پتنگ سے بچے کی گردن کاٹ دینا جائز عمل ہے اور اگر کوئی اپنے پیغمبر کے لیے ان کی شان قائم رکھنے کے لیے کسی کی گردن کاٹ دے تو وہ حرام ہے؟ مغرب اگر اپنے تصور خیر آزادی کے لیے لوگوں کی جان لے سکتا ہے تو اسلام بھی اپنے تصور خیر بندگی اور محبت رسولؐ کے لیے کسی کی جان لے سکتا ہے۔ جان دونوں لے رہے ہیں تو پھر اعتراض صرف اسلام پر کیوں آزادی [Freedom] کے عقیدوں پر کیوں نہیں؟

کسی تہذیب کا تصور الحق [Suprem Good] جبر کے بغیر کام نہیں کرتا آخر آزادی کے جبر [Compulsion of Freedom] کی خاطر دو سال کے بچوں کو پوری دنیا کے ہر ملک ہر شہر اور ہر گھر میں صبح سویرے مکّے، ٹھڈے، جوتے، تھپڑ، گھونسے لاتیں مار کر اور گالم گلوچ کر کے بستروں سے کھینچ کر مارتے ہوئے اسکول بھیجا جاتا ہے یہ صرف جبر نہیں دہشت گردی ہے تاریخ کی بدترین دہشت گردی کہ ایک سگی ماں اپنے بچہ کو دہشت زدہ کر کے جبراً اسکول بھیج رہی ہے کوئی بچہ صبح اسکول جانا پسند نہیں کرتا یہ آزادی کا جبر ہے ہمیں یہ قبول ہے مگر مذہب کا جبر [Compulsion of Religion] تمہیں قبول نہیں ہے۔

آزادی کے عقیدے کے لئے مذہب، روایات، اقدار، اخلاق پر پابندیاں قبول ہیں مگر اسلام کے عقیدے کی پابندیاں ناقابل قبول ہیں جبر آزادی میں بھی ہے جبر مذہب میں بھی ہے یہ ایمان اور عقیدے کا سوال ہے کہ کون سا جبر تمہیں قبول ہے، جبر کے بغیر دنیا میں کوئی تہذیب، ریاست، سلطنت، عقیدہ مستحکم نہیں رہ سکتا۔

لبرل ازم کا یہ دعویٰ کہ اس نے ہر قسم کے جبر سے آزادی دی جھوٹا دعویٰ ہے مغرب کے بڑے بڑے فلسفی لکھ چکے ہیں کہ ماڈرن ازم اور لبرل ازم نے عیسائیت کے مذہبی جبر سے آزادی کے نام پر وہ وہ جبر قائم کئے جس کا تصور عیسائیت میں بھی نہیں کیا جاسکتا۔ انسان اپنی خواب گاہ میں بھی محفوظ نہیں ہے امریکہ کے ہر شہری کے فون روزانہ ٹیپ کئے جاتے ہیں انسان کی نجی زندگی بھی آلات کے ذریعے ریاست کی دسترس میں آچکی ہے مگر پاکستانی لبرل ابھی تک مذہبی جبر کے خلاف آوازیں بلند کررہے ہیں آزادی کے بے تحاشہ جبر پر چپ ہیں۔

شرمین عبید چنائے کبھی صبح سویرے ماؤں کے ہاتھوں بچوں پر ہونے والے بدترین مظالم بلکہ دہشت گردی اور روزانہ کی دہشت گردی پر فلم نہیں بنائے گی کیونکہ یہ فلم مذہب کے خلاف دلیل فراہم نہیں کرتی بلکہ مغرب، لبرل ازم، فریڈم اور آزادی کے عقیدے کے جبر ظلم و ستم کی ہولناک، خونی، وحشت ناک کہانی سناتی ہے اور اس پر 'آسکر ایوارڈ' بھی نہیں ملے گا نہ نواز شریف اسے ایوان وزیراعظم میں گھسنے دیں گے نہ اس کی عزت ہوگی نہ دولت ملے گی نہ اخباروں میں ان کا چرچا ہوگا عزت، دولت اور شہرت صرف اسے ملتی ہے جو اسلام کے جسم پر زخم لگائے اور مغرب کے عقیدہ آزادی [Freedom] کو عام کردے۔

پاکستان کی سپریم کورٹ نے کبھی بچوں کے خلاف ہونے والی اس دہشت گردی کا Suo Moto نوٹس نہیں لیا کیوں کہ خود عدالت عظمٰی کے جج اور ان کے گھروں کے بچے اسی طریقے سے تعلیم حاصل کرتے ہیں اور یہ جبر جائز ہے اس جبر سے علم، تہذیب، اعتماد، نوکری، دولت، عزت، شہرت اور بلندی ملتی ہے، بس ممتاز قادری کا مذہبی جبر ناجائز تھا۔

شرمین عبید چنائے کی فلم A Girl in the River صرف یہ بتاتی ہے کہ لڑکی کے باپ نے اسلام پر عمل نہیں کیا اس نے اسلام کے اصول توڑے اور بیٹی کی گناہ گار زندگی پر اسے قتل کرنے کی کوشش کی لیکن شرمین نے فلم میں یہ نہیں بتایا کہ اسلام پر عمل کرنا صرف باپ کے لئے ضروری ہے، مخلوط نظام تعلیم مخلوط تہذیب و معاشرت، بے حیا میڈیا اور پاکستانی ریاست اور خود لڑکی پر اسلامی احکامات کا اطلاق نہیں ہوتا___ یہ سب عین اسلام کے مطابق کام کررہے تھے لڑکی اسلام پر عمل کرتے ہوئے لڑکے سے دوستی کررہی تھی، باپ کے پیسوں پر عشق لڑا رہی تھی ریاست کا نظام تعلیم، میڈیا، موبائل فون کی سروس عین اسلام اور شریعت کے مطابق آزادانہ تعلقات قائم کرنے کے مواقع

فراہم کر رہے تھے ان اسلامی مواقع کی فراہمی کے بعد جب باپ نے آشناؤں کی آشنائی میں گولی سے مداخلت کی تو بس یہ غیر شرعی کام تھا باقی سب کام شریعت کے مطابق تھا۔ ریاست، لڑکی، لڑکا، سب شریعت پر چل رہے تھے۔ ظاہر ہے جدید اسلامی ریاست، معاشرت میں باپ ہی گناہ گار ہے۔ یہ طریقہ Reductionism ہے یعنی اصل واقعے کو پس منظر سے کاٹ کر مغربی مقاصد کے مطابق بیان کرنا اگر پاکستانی ریاست حکومت یہاں کا میڈیا، یہاں کا نظام تعلیم، یہاں کی معاشرت یہاں کی موبائل فون کمپنیاں اوران کے پیکج وہ لڑکی وہ لڑکا سب اسلام کے تابع ہوتے اور شریعت کو اپنا رہنما بناتے تو باپ کو اس انتہائی اقدام کی ضرورت ہی نہ ہوتی جب ریاست کے کسی دائرے نے شریعت پر عمل نہیں کیا سب شریعت کی خلاف ورزی کر رہے تھے تو باپ کو یہ الزام دینا کہ تم شریعت کی خلاف ورزی کر رہے ہو درحقیقت اس طریقہ کار کا مقصد صرف یہ ہے کہ حقیقت کو مسخ کر کے اس طرح پیش کیا جائے کہ اصل مجرم، بدمعاش معصوم بن جائے اور ایک شریف غیرت مند باپ ہی اصل ظالم نظر آئے۔

غامدی صاحب نے ممتاز قادریؒ شہید کو دہشت گرد قرار دیا ہے لیکن انہیں معلوم ہی نہیں کہ دہشت گردی کی تعریف ابھی تک طے نہیں ہوئی UNO نے گیارہ ستمبر کے بعد جو مجلس بنائی تھی وہ ابھی تک دہشت گردی کی متفقہ تعریف پر نہیں پہنچ سکی تعریف ابھی طے نہیں ہوئی لیکن UNO اور امریکہ چودہ سال سے دہشت گردی کے خلاف جنگ میں مصروف ہیں۔ بعض مغربی مفکرین کی کوششوں سے جو تعریف طے شدہ ہے اس کے مطابق بھی ممتاز قادری کا عمل دہشت گردی کے دائرے میں نہیں آتا دہشت گردی کی تعریف یہ ہے:

The definition that will be used throughout this book is one that is derived from the works of Crenshaw (1983), Hoffman (2006), and Claridge (1996),

Terrorism involves political aims and motives. It is violent or threatens violence. It is designed to generate fear in a target audience that extends beyond the immediate victims of the violence. The violence is conducted by an identifiable organization. The violence involves a non-state actor or actors as either the perpetrator, the victim of the violence, or both. Finally, the acts of violence are designed to create power in situations in which power previously had been lacking (i.e., the violence attempts to enhance the power base of the organization undertaking the actions). [J.M. LUTZ Global Terrorism London Routledge 2008 -page9]

شہید ممتاز قادریؒ نے ایسا کوئی عمل نہیں کیا جو دہشت گردی کے معیار پر پورا اترتا ہو۔ پولیس مقابلوں میں جو بے گناہ یا گناہ گار مار دیے جاتے ہیں ان مقابلوں میں غیر قانونی طریقوں سے مجرموں، ملزموں اور بے گناہوں کو قتل کرنے والے پولیس والوں کے خلاف آج تک دہشت گردی کا مقدمہ درج نہیں کیا گیا۔ پر امن شہریوں کو پولیس مقابلے میں مارنے والے کبھی دہشت گرد قرار نہیں پائے۔ حکومت عدالت نے کبھی پولیس والوں کو دہشت گردی کا ذمہ دار قرار نہیں دیا تو اس اصول کے تحت ممتاز قادری کا عمل کیسے دہشت گردی کے دائرے میں آسکتا ہے؟

بے شمار موقر شہادتوں کے مطابق سلمان تاثیر نے توہین رسالت کا ارتکاب کیا تھا۔ ممتاز عالم دین حنیف قریشی صاحب کی شہادت کے مطابق تمام مکاتب فکر کے پاکستان کے پانچ سو علماء نے سلمان تاثیر کے خلاف توہین رسالت کا فتویٰ بھی جاری کیا تھا۔ دنیا اخبار میں مفتی منیب الرحمان کے ایک کالم کے مطابق بعض علماء نے سلمان تاثیر کے قتل کا فتویٰ بھی صادر کیا تھا[مفتی منیب الرحمان زاویہ نظر روزنامہ دنیا مورخہ ۵/ مارچ ۲۰۱۶ء کراچی، لاہور] پاکستانی ریاست کی لاتعلقی آئین کی بے بسی دیکھ کر اور مسئلہ توہین رسالت پر حنیف قریشی صاحب کی تقریر سن کر پانچ سو علماء کا فتویٰ پڑھ کر اور بعض علماء کی جانب سے قتل کا فتویٰ جاری ہونے کے بعد ہی ممتاز قادری شہید نے سلمان تاثیر کو قتل کرنے کا فیصلہ کیا___

شہید ممتاز قادریؒ کا عمل امت کے اجماع، تعامل، تواتر، تسلسل اور تمام مکاتب فکر کے علمائے دین کے متفقہ فتوے، حنیف قریشی صاحب کی تقریر اور پانچ سو علماء کرام کے فتوے کی اتباع میں تھا___ شہید ممتاز قادری کو ایمانی قوت حنیف قریشی صاحب کی خطابت اور امت کی اجتماعی علمیت پر مبنی تمام مکاتب فکر کے علمائے دین کے متفقہ فتوے سے حاصل ہوئی۔ ریاست نے علماء کے فتوے کے مطابق عمل کرنے علما کے فتوے کی تحقیق کرنے دلائل کو پرکھنے اس فتوے کو غلط قرار دینے یا اس فتوے کی روشنی میں سلمان تاثیر کو عہدے سے معطل کرنے، برطرف کرنے، ان کے خلاف تحقیقاتی کمیشن قائم کر کے توہین رسالت کے الزام کی تحقیقات کرنے، ان کو گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلانے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی تو شہید ممتاز قادری نے اپنے ایمان سے وہ کام کیا جو سیکولر آئین کے تحت ریاست اور اس کی عدالت کو کرنا چاہیے تھا۔ پاکستانی ریاست کا یہ

رویہ اتفاقی، حادثاتی نہیں ہے۔ یہ امریکا کی سازش، نواز شریف کی سیاست یا فوج کے دباؤ پر کیا گیا فیصلہ نہیں ہے جیسا کہ بہت سے لوگوں کا خیال ہے۔ یہ درست ہے کہ فاطمہ بھٹو، آصفہ بھٹو، بختاور بھٹو اور ملالہ یوسف زئی مریم نواز شریف کے لیے مستقبل کے ہولناک خطرات ہیں لہٰذا ان کے مقابلے پر مسلم لیگ اپنے لبرل ازم کا ثبوت بھی عالمی قوتوں کو پیش کرنا چاہتی ہے مگر اس کے باوجود یہ تنہا مسلم لیگ کا فیصلہ نہیں۔ یہ جدید ریاست کی لادینیت کا تقاضہ ہے۔ کیونکہ جدید ریاست منشور انسانی حقوق کے تحت آئین بناتی ہے اور اس آئین کے تحت خدا کی حاکمیت قائم ہی نہیں ہوسکتی [UCHR] یوروپین کورٹ آف ہیومن رائٹس نے رفاہ پارٹی کے نجم الدین اربکان کی حکومت کی ترکی سپریم کورٹ کے ایک حکم کے ذریعے برطرفی کے خلاف رفاہ کی اپیل کو مسترد کرتے ہوئے جو فیصلہ لکھا ہے اس میں تمام تفصیل موجود ہے یہ فیصلہ [UCHR] Rafah vs Turkey کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ اس فیصلے میں واضح طور پر یہ لکھا ہے کہ کسی ریاست میں خدا کی حاکمیت کے قیام کا مطلب ہے بندوں کی حاکمیت اور مساوات کے اصولوں کا خاتمہ جو جمہوریت کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے لہٰذا جمہوری عمل سے منتخب ہونے والوں کو جمہوریت کے مقاصد، اہداف کے خلاف عمل کرنے کی آزادی نہیں دی جاسکتی یعنی جمہوریت کسی بھی مذہب کی حاکمیت قائم ہی نہیں کرسکتی یہ منشور انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہے لہٰذا تمہاری حکومت کی برطرفی منشور انسانی حقوق کی شقوں اور آزادی کے عقیدے کے مطابق بالکل جائز ہے۔ تمہیں آزادی کے عقیدے کے تحت ایک لادینی، کافر حکومت قائم کرنے کی اجازت ہے مگر کسی قسم کی مذہبی حکومت قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے خواہ وہ اسلامی ہو یا عیسائی یا یہودی۔

۱۹۵۳ء میں جب تمام اسلامی جماعتوں [All Pakistan Muslim Parties Convention] نے قادیانی تحریک کے موقع پر سر ظفر اللہ جان کی برطرفی اور قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کیا تو وفاقی حکومت نے ان تمام مطالبات کو مسترد کردیا۔ اور کہا کہ احمدیوں یا کسی اور فرقے کو اقلیتی جماعت قرار نہیں دیا جاسکتا نہ کسی احمدی کو کلیدی عہدے سے ہٹایا جائے گا۔ [عزیز احمد، برصغیر میں اسلامی جدیدیت، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۷ء، ص ۲۴۲]

۱۹۶۴ء میں پاکستانی ریاست کی منافقانہ حکمت عملی گومگو کے رویے کی حقیقی نقشہ کشی کرتے ہوئے عزیز احمد لکھتے ہیں:

۱۹۵۳ء میں یہ پُر فساد مقابلہ (مراد احمدیوں کے خلاف تحریک ختم نبوت اور پنجاب میں مارشل لاء کا نفاذ ہے) ایک ایسی حکومت کے درمیان، جو مغربی لادینی تصور کو مبنی برحقیقت سمجھ رہی تھی اور روایاتی اور اساسیت پسند علماء کے مابین جو پاکستان میں ایک مذہبی ریاست دیکھنے کے متمنی تھے، وقوع پذیر ہوا۔ اس کی جامع و دقیق تحلیل جج محمد منیر اور جج ایم آر کیانی نے اپنی رپورٹ میں پیش کی ہے جو عام طور پر ''منیر رپورٹ'' سے موسوم کی جاتی ہے۔ اس رپورٹ میں موجودہ دور میں ایک ''اسلامی ریاست'' کے تصور کے مسئلہ اور الجھن کو بڑی سچائی اور ایمان داری سے پیش کیا گیا ہے۔ اگر پاکستان، علماء یا اساسیت پسندوں کی تعریف کے تحت ایک اسلامی ریاست کہا جاسکتا ہے تو جدید معنوں میں اسے جمہوریت نہیں کہا جاسکتا ہے۔ تکنیکی لحاظ سے اگر اختیارِ اعلیٰ خدا کو سونپ دیا جاتا ہے تو پھر وہ مقتدر و بااختیار ریاست نہیں کہی جاسکتی ہے۔ [عزیز احمد، ص ۳۴۴ بحولہ بالا] رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اسلام اور جدید ریاست کے مابین مصالحت آمیز طرز عمل درست نہیں لہٰذا ایک فیصلہ کرلیا جائے ریاست یکسو ہو جائے'' پاکستان شش و پنج کا شکار ہوگیا ہے یہ انتشار مسلسل قائم رہے گا اور بار بار ایسے مواقع پیدا ہوتے رہیں گے تاوقتیکہ ہمارے قائدین منزل کا صحیح تصور اور اس تک پہنچنے کے ذرائع حاصل نہیں کرلیتے [عزیز احمد، ص ۳۴۵ بحولہ بالا] رپورٹ میں واضح کردیا گیا تھا کہ اسلام عصری مسائل کو حل نہیں کرسکتا اسلام لوگوں کا ذاتی معاملہ ہے اسے ریاست و حکومت میں داخل کرنے کی کوشش کی گئی تو ۱۹۵۳ء جیسے حادثے وقوع پذیر ہوتے رہیں گے سیاست داں لوگوں کو جبراً مسلمان بنانے اور مسلمان رکھنے کی کوشش نہ کریں جسٹس منیر اور جسٹس ایم آر کیانی جدید مغربی فلسفے اور جدید ریاست سے بخوبی واقف تھے اصلاً وہ جان لاک کے تصور ریاست کی ترجمانی کررہے تھے جس کا ماخذ Two treatise of Government ہے۔

۲۰۱۶ء میں پاکستانی ریاست نے اسی طرح شہید ممتاز قادری کو پھانسی دینے کے لیے عجلت کا مظاہرہ کیا جس طرح ۱۹۵۳ء میں مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا کا حکم عجلت میں سنایا گیا تھا۔ شہباز شریف نے وعدہ کیا کہ پھانسی نہیں ہوگی مگر پھانسی دے دی گئی یعنی ریاست کی اصل ماہیت ۲۰۱۶ء میں بھی وہی ہے جو ۱۹۵۳ء میں تھی فرق صرف یہ ہوا کہ ۱۹۵۳ء میں ریاستی حکمران جھوٹ نہیں بولتے تھے نہ علماء سے جھوٹے وعدہ کرتے تھے وہ سچے مخلص راسخ العقیدہ لبرل تھے منافق نہیں تھے۔

اصولاً یہ انسداد دہشت گردی کی عدالت، عدالت عظمیٰ اور حکومت کی ذمہ داری تھی کہ وہ امت مسلمہ کی اجماعی علمیت کو، حنیف قریشی صاحب اور پانچ سو علماء کو اور تمام اسلامی مکاتب فکر کے متفقہ فتوے کی بنیاد پر تمام مدارس اسلامیہ کو اعانت مجرمانہ کے جرم میں اس مقدمہ قتل میں نامزد کرتی عدالت عظمیٰ نے اسلامی علمیت کے حامل ان

اداروں، اجماع امت اور علماء کے فتوے کو مقدمہ کا حصہ نہ بنا کر اسلامی شریعت پر مبنی علمیت کو نظر انداز کر کے عجلت اور رواروی میں ممتاز قادری کی شہادت کا فیصلہ سنا دیا اس فیصلہ پر فوری نظر ثانی کی ضرورت ہے۔ امت کا اجماع ہے کہ شاتم رسول کو قتل کرنے والے کو قصاص میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔

ایک اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ اگر عدالت کے کسی جج کی توہین کا ارتکاب کسی فرد کی جانب سے ہو تو توہین عدالت کے اس مقدمے کی سماعت صرف اور صرف وہی جج کرتا ہے دوسرا کوئی جج توہین کے مقدمے کی سماعت نہیں کرتا۔ جس عدالت کے جج کی توہین ہوئی ہو صرف اس کو یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ وہ توہین کے مرتکب فرد کو معاف کر دے ایک عام، دنیاوی عدالت کی یہ شان ہے تو شان رسالتؐ میں گستاخی اور توہین کا ارتکاب کرنے والوں کو معاف کرنے کا اختیار نہ عدالت کے پاس ہے اور نہ حکمرانوں کے پاس اور توہین کے مجرم کی معافی پر مشتمل ایسا ہر قانون اسلامی عدل کے اصولوں کے منافی ہے ویسے بھی رسالت مآبؐ امتناع نظیر ہیں لہٰذا توہین کے مرتکب کو اس مقدمے میں سزا دینا اس لئے ضروری ہے کہ رسالت مآبؐ نے اپنی زندگی میں کئی مواقع پر توہین کے مرتکب کے لئے اس سزا کا اطلاق کیا اور اگر کسی صحابی نے از خود توہین رسالت پر کسی کو قتل کر دیا تو رسالت مآبؐ نے اس واقعے کی تحقیق کرنے کے بعد اس عمل کی تصدیق، تائید اور تصویب فرمادی۔ ذات رسالت مآبؐ کی سنت اس امت کے لئے قیامت تک حجت ہے اور اس سنت کے تحت شاتم رسول کے قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ برنارڈ لیوس جو اسلام، مشرق وسطیٰ اور سلطنت و خلافت عثمانیہ پر سند کا درجہ رکھتا ہے اس نے اپنی اکثر کتابوں میں بار بار یہ بات وضاحت اور تکرار کے ساتھ لکھی ہے کہ تمام اقلیتوں کو مسلمانوں کی خلافت، مملکت، سلطنت میں مکمل امان حاصل تھی لیکن اگر کوئی اقلیت یا ان کا کوئی فرد ذات رسالت مآبؐ کی توہین کرتی تو مسلمان خلیفہ اور عوام اس کو بالکل برداشت نہیں کرتے تھے اقلیتیں اس معاملے میں صحیح طرز عمل کا مظاہرہ کرتیں تو خلافت عثمانیہ میں انہیں ہر طرح کی آزادی اور سہولیات میسر رہتیں۔ توہین رسالتؐ کے مسئلے میں خلیفہ اور مسلمانوں کی حد درجہ حساسیت کی وجہ یہ تھی کہ ذات رسالت مآبؐ کی وجہ سے ہی ذمیوں کا خصوصی خیال رکھنا خلافت کی بنیادی ذمہ داری تھی اگر اس ذات کی شان ہی محفوظ نہیں ہے تو ذمیوں کی امان کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ خلافت عثمانیہ میں فقہ حنفی رائج تھی اس کے باوجود حنفی فقہ کے تحت خلیفہ، قاضی توہین رسالتؐ پر سخت ترین سزا نافذ کر دیتے تھے یہ امت کا تواتر، تعامل اور تسلسل ہے اس عمل میں امت نے کبھی کوتاہی نہیں کی یہ ایمان کا مسئلہ ہے۔

ہمارے پاکستانی لبرل دانش ور اور جاوید احمد غامدی صاحب اس امت کو بار بار رواداری اور صبر و تحمل کا درس دینے کی کوشش کرتے ہیں وہ کبھی مغربی دانش وروں اور مستشرقین کی تحقیقات کا مطالعہ کریں اسلام پر مغرب میں سب سے بڑی سند برنارڈ لیوس ہے اس کی کتاب Islam in Europe پڑھ لی جائے تو اقلیتوں سے خلافت عثمانیہ کے بے مثال سلوک کا تذکرہ وہاں مل جائے گا اس صدی کے سب سے بڑے سیاسی فلسفی جان رالز نے اپنی آخری کتاب Law of The People میں خلافت عثمانیہ اور مسلمانوں کے یہاں اقلیتوں سے بہترین سلوک کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے مائیکل مین نے اپنی معرکہ آراء کتاب The Dark Side of Democracy میں لکھا ہے کہ مسلمانوں کا غیر مسلموں سے سلوک کتنا بہترین تھا صدر بش کی کچن کیبنٹ کے رکن اور نیوز ویک وٹائم کے سابق مدیر فرید زکریا نے بھی اپنی کتاب The Future of Freedom میں مسلمانوں کی جانب سے غیر مسلموں کے سلوک کا نہایت عمدہ طریقے سے ذکر کیا ہے۔ Lamberd J.E.B کی کتاب Fundamentalism, Betrayal of Tradition میں خلافت اسلامیہ کے دور میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات پر مبنی بے شمار تاریخی حوالوں کا خوبصورت انتخاب ہے لہٰذا پاکستانی حکومت کو اور لبرل سیکولر طبقات کو اقلیتوں کے بارے میں زیادہ متوحش ہونے کی ضرورت نہیں اسلام نے اپنی حاکمیت کے زمانے میں ان سے بے مثال سلوک کیا اور اگر آج کہیں اقلیتوں کو اسلامی معاشروں میں کہیں کوئی مشکل درپیش ہے تو برنارڈ لیوس کی تحقیق کے مطابق اس کا واحد سبب منشور انسانی حقوق کی مسلط کردہ جمہوریت اور مساوات ہے جب تک اقلیتیں ذمی کے طور پر رہیں اس امت نے رسالت مآبؐ کی آخری وصیت کے مطابق ان ذمیوں کا ہر طرح سے تحفظ کیا اور کبھی انہیں کوئی تکلیف نہیں پہنچائی۔ جب اسلامی شریعت کا خاتمہ کر کے جمہوریت اور مساوات کی مغربی شریعت نافذ کر دی گئی تو اقلیتوں کا ذمہ بھی ختم ہو گیا۔

سوال یہ ہے کہ اقلیتوں پر بعض جگہ زیادتیوں کا سبب جمہوریت اور مساوات کیوں ہے اس کے لئے برنارڈ لیوس کی کتابوں کی طرف رجوع کیجئے۔ برما میں بدھوں کی جانب سے مسلمانوں پر ظلم و ستم کا اصل سبب بھی بدھ مت نہیں برما میں جمہوریت اور مساوات کا اصول ہے برما کے بدھوں کو خطرہ ہے کہ مسلمانوں کی آبادی اسی تیزی سے بڑھتی رہی تو وہ اقلیت بن جائیں گے اور مسلمان جمہوریت کی وجہ سے ان کے ملک پر قابض ہو جائیں گے اگر بادشاہت رہتی تو یہ مسئلہ ہرگز پیدا نہ ہوتا لبنان، شام اور عراق میں عیسائی مسلم کشمکش، دروزی سنی، اور شیعہ سنی کشمکش کا سبب بھی جمہوریت ہے اگر جمہوریت مساوات کا خاتمہ کر کے وہاں بادشاہت قائم کر دی جاتی تو خون ریزی کا خاتمہ ہو سکتا تھا عراق میں جب تک صدام کی حکومت تھی عراقی شیعہ صدام کے ساتھ تھے عراق ایران جنگ میں بھی وہ صدام کا ساتھ دیتے رہے۔

ایک اہم نکتہ اقلیتوں سے متعلق یہ بھی ہے کہ منشور انسانی حقوق میں اقلیتوں سے مراد اصلاً مذہبی اقلیتیں نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ اقلیت [Capital Minority] مراد ہے کیونکہ مساوات کے عقیدے کے نتیجے میں تمام اقلیتیں تمام مذاہب محض علامتی طور پر باقی رہ جاتے ہیں اصل اقلیت جو ہمیشہ اکثریت کے رحم وکرم پر ہوتی ہے اور ہمیشہ شدید خطرے اور مصیبتوں کے نرغے میں رہتی ہے وہ سرمایہ دارانہ اقلیت ہے اس نقطہ نظر کے تاریخی، واقعاتی دلائل کے لئے عالمی بینک کی سابق نائب صدر ایمی چوا کی کتاب The World On Fire کا مطالعہ کیجئے جس میں اس نے دنیا بھر میں موجود سرمایہ دارانہ اقلیتوں کی تاریخ اور ان پر اکثریت کی جانب سے کیے گئے مظالم کی تاریخ بیان کی ہے مثلاً امیر کبیر اقلیتوں کے کارخانوں اور مال کو قومی ملکیت میں لے کر قومیالینا [Nationalization] انسانی حقوق کے منشور میں جس اقلیت کا تحفظ مطلوب ہے وہ صرف اور صرف سرمایہ دارانہ اقلیت ہے جسے ہمیشہ اکثریت کی ممکنہ آمریت سے خطرہ رہتا ہے۔ اسی لیے سرمایہ قوم پرست جمہوری ریاست میں خود کو سب سے زیادہ محفوظ تصور کرتا ہے۔

علماء اور دینی مدارس کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اس مقدمے میں خود فریق بننے کی استدعا کرتے اور عدالت سے کہتے کہ ممتاز قادری کو نہیں صرف ہم پانچ سو علماء کو نہیں بلکہ اس امت کی علیت کو، اس کی تاریخ کو، آثار صحابہ کو، خیر القرون کے تمام فیصلوں کو اور تمام مکاتب فکر کو بھی پھانسی کے پھندے پر لٹکا دو ہم اس زمین پر زندگی کو پسند ہی نہیں کرتے جس زمین پر اسلامی مملکت کا گورنر کھلم کھلا، بار بار رسول ؐ کی توہین کرے اور اس توہین پر ریاست، عدالت، پارلیمنٹ مقتدرہ خاموش رہے اور اگر کوئی عاشق رسول قتل کردے تو اسے معاف کرنے کے بجائے اسے قصاص میں قتل کردیا جائے۔ اس امت کی اجتماعی روایت یہ ہے کہ توہین رسالت کے مجرم کو قتل کرنے کے لئے ہمیشہ اور ہر وقت کسی عدالتی کارروئی کی ضرورت نہیں عدالتی کاروائی ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی ــــ عدالتی کاروائی امر لازمی نہیں ہے۔ رسالت مآب ؐ کی سنت اس معاملے میں حرف آخر ہے عدالت شریعت کے معاملے میں مداخلت نہیں کرسکتی۔

اسلام کا قانون کانٹ کے فلسفے سے نہیں نکلا ہے اس کی بنیاد مغرب کے تصورات فطرت وعقلیت پر نہیں ہے یہ وحی الٰہی اور سنت محبوب الٰہی سے اخذ کردہ قانون ہے اس کا صغریٰ کبریٰ، اس کی ماہیت، حقیقت اس کی حرکیات سب کچھ مغرب کے انسانی قوانین سے یکسر مختلف ہے جب تک آپ فلسفہء مغرب، فلسفہء انسانی حقوق اور فلسفہء آزادی کے منہاج میں کھڑے ہیں آپ کو یہ مباحث سمجھ میں نہیں آسکتے یہ ایمان وعقیدے کا مسئلہ ہے جس طرح مغرب پر ایمان لانے والے کو مغرب کی ہر چیز فطری عقلی حقیقی نظر آتی ہے بالکل اسی طرح اسلام پر ایمان لانے والے کو اسلام کا ہر حکم عقلی فطری حقیقی نظر آتا ہے لہٰذا مسلمانوں کو از سرنو اسلام پر ایمان لانے کی ضرورت ہے۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ ۲۰۱۱ء میں جب اسلامی جماعتوں کی کل جماعتی کانفرنس میں اجماع امت، اسلامی تاریخ، اسلامی علیت اور کلیت کی بنیاد پر یہ بات طے ہوگئی کہ شتم رسول جرم ہے اور اس کی سزا قتل ہے اور ممتاز عالم دین مولانا مفتی محمد خان قادری صاحب نے اپنے خطاب میں واضح کردیا کہ

اسلامی قانون کی رو سے اگر کوئی شخص توہین رسالت کا مرتکب ہوتا ہے حضور اکرم ﷺ کی ذات گرامی پر چھینٹے اڑاتا ہے اور سننے والا اپنے جذبہ ایمانی کے سبب اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتا اور اسے قتل کردیتا ہے تو جب ثابت ہوجائے کہ ہاں توہین رسالت ہوئی تھی تو قاتل سے قصاص نہیں لیا جائے گا اور مقتول کا خون رائیگاں ہوگا۔ [ندائے خلافت، ۲۴ / اکتوبر ۲۰۱۱ ص ۴]

تو اس علیت کے نفوذ ونفاذ کے لیے دینی جماعتوں نے کوئی ہمہ گیر جدوجہد کیوں نہیں کی اور ریاست حکومت پارلیمنٹ اور عدالت کو کیوں نہیں بتایا کہ شاتم رسول کو قتل کرنا ایک مسلمان کا حق [Right] نہیں فرض [Duty] ہے یہ حماقت نہیں اضطراری اور جذباتی عمل نہیں اجتہادی مسئلہ نہیں ہر فرد کی صواب دید پر منحصر قضیہ نہیں امت کی اجماعی علیت کا متفقہ فیصلہ ہے اور اجماع امت اور تعامل تواتر امت سے ثابت ہے اس کے سامنے کسی دوسرے قانون اور اصول کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا اور پاکستانی ریاست کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ وہ شریعت کے اس حکم کو تسلیم کرتی ہے یا نہیں کیوں کہ آئین کی بعض دفعات شریعت کی بالادستی کو واضح طور پر تسلیم کرتی ہیں لہٰذا ان دفعات کی روشنی میں ریاست خود یا ریاست کی عدالت اور شریعت کورٹ فیصلہ کردے کہ اس ملک میں شریعت بالادست ہے یا منشور انسانی حقوق کے تحت شریعت کے منافی قوانین کو بالادستی حاصل ہے تاکہ اس التباس کا خاتمہ ہوجائے جو ۱۹۵۳ء سے جاری وساری ہے اور دوٹوک فیصلے کا منتظر ہے اس فیصلے کے بعد ہی پاکستانی ریاست کی اصل حقیقت کا اندازہ ہوسکتا تھا مگر دینی جماعتوں نے اس سنہری موقع کو ضائع کردیا اس موقع پر وفاقی شرعی عدالت کے ذریعے چند بنیادی سوالات پر بھی شرعی نقطۂ نظر پیش کیا جاسکتا تھا تاکہ ان تاریخی التباسات کو منطقی انجام تک پہنچادیا جاتا جو گزشتہ سو برس سے اسلامی قوتوں کی سمت سفر کو متعین نہیں ہونے دیتے اور فکری انتشار کا سبب ہیں۔

مثلاً شرعی عدالت سے پوچھا جاتا کہ وہ اسلامی ریاست اور وہ حاکم وہ حکومت اور وہ نظام اقتدار جو توہین رسالت کے مجرم اور ایسے مجرم کو جو اسلامی ملک کا گورنر بھی ہو خود سزا دینے میں دانستہ غفلت کا مرتکب ہو تو اس کی شریعت میں کیا سزا ہے کیا ایسے نظام اور اس نظام کے کارپرداز حکمرانوں نے کفر بواح کا ارتکاب کیا ہے یا نہیں؟

وہ عدالت سے پوچھتے کہ اگر سپریم کورٹ کے جج جو دینی احکامات سے ناواقف ہیں اور صرف سیکولر قوانین کے ماہر ہیں تو یہ عدالت اگر کسی شرعی مسئلے کے سلسلے میں غلط فیصلہ کر رہی ہے تو اس کا حکم کیا ہے؟ کیا ریاست یا ریاست کے اعلیٰ سرکاری حکام کی جانب سے توہین رسالت کا جرم اگر ثابت ہو جائے تو کیا حیلہ شرعی سے یہ کفر بواح کے دائرے میں نہیں آئے گا؟ حکمراں سے کفر بواح کا ارتکاب صرف اس کا ذاتی فعل سمجھا جائے گا یا اجتماعی، ریاستی یا حکومتی فعل بھی؟ کیوں کہ جدید ریاست میں طاقت کے کئی دائرے ہوتے ہیں کس دائرے میں طاقت زیادہ ہے اس کا پتہ نہیں کسی ایک حاکم کے فعل کی ذمہ داری پوری ریاست پر عائد نہیں ہوتی تو اس صورت میں حکم کیا ہوگا؟ اگر یہ ثابت ہو جائے کہ ایک حکمراں نے کفر بواح کا ارتکاب کیا ہے تو اس کا کیا حکم ہوگا؟ اگر ریاست نے ارتکاب کیا ہے تو کیا کفر بواح کے باعث ریاست کے خلاف خروج کیا جاسکتا ہے یا نہیں؟

وہ عدالت سے یہ بھی پوچھتے کہ ایک آئینی دستوری جمہوری ریاست میں بادشاہ، خلیفہ، سلطان، حاکم نہیں ہوتے حکومت شخصی نہیں اداراتی ہوتی ہے طاقت، قوت، اقتدار، اختیار کا مرکز معلوم ہی نہیں ہوتا تو خروج کس کے خلاف کیا جائے گا؟ صوبائی حکومت، مقامی حکومت، وفاقی حکومت، منتخب حکومت، غیر منتخب لیکن مستقل حکومت مثلاً انتظامیہ عدلیہ وغیرہ وغیرہ؟ کیا خروج اداروں کے خلاف ہوسکتا ہے یا صرف فرد کے خلاف ہوتا ہے؟ اگر خروج اداروں یا ادارے کے نمائندگان کے خلاف نہیں ہوسکتا تو کیا عہد حاضر میں خروج ساقط ہو جائے گا کیوں کہ عہد حاضر کی ریاست کی طاقت کا سرچشمہ تو معلوم ہی نہیں۔ مثلاً ریمنڈ ڈیوس کے معاملے میں یہ معلوم ہی نہیں ہوسکا کہ ریمنڈ ڈیوس کی رہائی کا فیصلہ کس نے کیا وفاقی حکومت نے، صوبائی حکومت نے، وزارت داخلہ نے، وزارت خارجہ نے یا وزارت دفاع نے یا شرعی قانون نے، یا مقتولین کے ورثاء نے یا پنجاب کی عدالت کے جج نے، یا اس بھاری رقم نے جو امریکہ نے مہیا کی۔ کیونکہ جدید جمہوری ریاست میں طاقت کا سرچشمہ مخفی ہوتا ہے یہاں فرد Subject غیر حاضر ہوتا ہے ریاست De- Personilized ہوتی ہے صرف ادارے موجود ہوتے ہیں جن میں طاقت کے مراکز تقسیم ہوتے ہیں مگر طاقت کا حقیقی مرکز غیر مرئی ہوتا ہے۔ جدید ریاست میں اصل طاقت سرمایہ [Capital] کے پاس ہے مگر سرمایہ کے خلاف خروج نہیں کیا جاسکتا تو پھر اس خروج کے متبادل طریقے کیا ہوں گے؟ یہ سوالات اگر پوچھے جائیں تو جدید ریاست کی ماہیت، حقیقت، اصلیت دینی مکاتب فکر پر آشکار ہو جاتی جس کے بارے میں بہت کچھ خوش فہمیاں ابھی تک پائی جاتی ہیں۔

شرعی عدالت سے یہ بھی پوچھنا چاہیے تھا کہ اگر جمہوریت کے فلسفے کے تحت عوام کو طاقت کا سرچشمہ سمجھ لیا جائے تو عوامی نمائندوں اور منتخب و غیر منتخب حکومتوں کے بجائے اصلاً جمہوری ریاست میں خروج تو عوام ہی کے خلاف ہونا چاہیے۔ کیوں کہ انہوں نے ایسے نمائندے چنے اور ایسی حکومت قائم کی جو کفر بواح کی مرتکب ہوئی تو کیا ریاست کے لوگوں یعنی عوام [Public] کے خلاف خروج کیا جاسکتا ہے؟ اگر خروج لوگوں کے خلاف کیا جاسکتا ہے تو یہ کیسے معلوم ہوگا کہ ریاست کے کس کس شہری نے موجودہ حکمرانوں کو ہی ووٹ ڈالے تھے کیونکہ ووٹ تو خفیہ ہوتے ہیں لہٰذا یہ پتہ چلانا ممکن ہی نہیں ہے کہ کس نے کس کو ووٹ دیے اس صورت میں کیا خروج ساقط ہو جائے گا یا نہیں؟ کیا خروج کے نظریے پر عمل کے لیے جمہوری حکومت ختم کر کے شخصی حکومت کے قیام کی کوشش کی جائے تاکہ مستقبل میں خروج کا احیاء ہو سکے یا اس وقت تک صرف آئینی احتجاجی جدوجہد پر اکتفا کیا جائے۔

عدالت سے یہ بھی پوچھا جاتا کہ انفرادی کفر بواح کا ارتکاب کرنے والوں اور ریاست کی جانب سے کفر بواح کا ارتکاب کرنے والوں کے بارے میں صرف خاموش رہ کر دل میں افسوس کرنا یا صرف اخبارات میں بیانات دینے پر اکتفا کرنا شریعت کی نظر میں کس درجے کا جرم ہے؟ یہ کہا جا رہا ہے کہ ممتاز قادری کو دہشت گردی کے الزام میں سزائے موت ہوئی ہے لہٰذا دہشت گرد کی نماز جنازہ پڑھنا اس کے لیے دعائے خیر کرنا اس کے لیے لاکھوں کی تعداد میں نکلنے والے سب دہشت گرد ہیں تو کیا رسول کے عاشق سے عشق رکھنے والوں کو دہشت گرد تسلیم کیا جاسکتا ہے؟ شرعی عدالت سے یہ بھی پوچھا جانا چاہیے۔ علماء کرام ان سوالات پر خود غور کریں تو انہیں معلوم ہو ہی جائے گا کہ وہ اکیسویں صدی میں کہاں کھڑے ہیں وہ جدید ریاست کے فلسفے سے لاتعلق رہ کر اس میں اسلام کی پیوندکاری کی کوشش کر رہے ہیں وہ اس پیوندکاری [Crafting] کا انجام ہے جو ان کے سامنے آچکا ہے۔ علماء کرام اگر ۱۹۵۳ء میں چیف جسٹس منیر کمیشن کی رپورٹ پر سنجیدگی سے مباحثہ کرتے تو وہ ایک متبادل حکمت عملی تیار کر سکتے تھے مگر ان کا ایمان یقین کی حد تک مستحکم ہے کہ جدید ریاست ہی عین اسلامی شریعت کا تقاضہ ہے۔ جنرل ضیاء الحق سے لے کر سوڈان، انڈونیشیا، ملائشیا، بنگلہ دیش

،ایران اور برونائی میں اسلامی علمیت، معاشرت، شخصیت، انفرادیت، روحانیت، تہذیب، کے غلبے کے بغیر صرف اور صرف اسلامی قوانین کے نفاذ کی حکمت عملی بری طرح ناکام ہورہی ہے ادخلو فی السلم کافه دین کا حکم ہے کہ دین میں پورے پورے داخل ہوجاؤ مگر اس اصول کے خلاف پیوندکاری اسلام کے لئے مہلک خطرات تخلیق کررہی ہے ۱۹۷۷ء میں جنرل ضیاءالحق کی جانب سے اسلامی قوانین نافذ کرنے کے باوجود چالیس سال کے عرصے میں کسی ایک شخص کو بھی حدود، تعزیر، توہین رسالت کے تحت سزا نہیں دی جاسکی۔ ایلوے کے پودے نیم کے درخت میں انگور کی قلم لگانے اور کریلے کی بیل میں گڑ کا پانی ڈالنے سے مٹھاس پیدا نہیں ہوسکتی۔ پاکستانی سیاسی آمر کے سیاسی مقاصد نے عجلت میں دین کی جو پیوندکاری کی اس نے اسلام کو ہی استہزاء کا نشانہ بنادیا ہے۔ جنرل ضیاءالحق نے فیڈرل شریعت کورٹ کے نام پر شریعت کے ساتھ جو مذاق کیا وہ نہایت شرم ناک ہے۔ آئین میں شریعت کورٹ کے چیف جسٹس اور جج کی شرائط ملازمت اسلام کے نام پر بدنما ترین داغ ہیں ان داغوں کو مٹا کر اپنی غلطیوں کا اعتراف کرکے نئی حکمت عملی اختیار کئے بغیر اسلام کبھی طاقت ور نہیں ہوگا بلکہ مسلسل پسپا ہوتا رہے گا ۱۹۸۰ء سے ۲۰۱۶ء تک پاکستان میں اسلامی قوانین کی عبرت ناک شکست اس کا ثبوت ہے کہ دو تصورات خیر ایک ساتھ نہیں چل سکتے دونوں میں سے ایک تصور خیر دوسرے کو اپنے اندر تحلیل کرلے گا اسلامی قوانین ناکام ہیں سیکولر قوانین کامیاب ہیں کیونکہ اسلامی قوانین کو اس ملک کے سیکولر لوگ علمیت ہی نہیں سمجھتے۔

مفتی منیب الرحمان صاحب نے کہا کہ شہباز شریف نے یقین دہانی کرائی تھی کہ ممتاز قادری کو پھانسی نہیں دی جائے گی لہٰذا ہم نے حکمران کے وعدے کا اعتبار کیا ہمیں اندازہ ہی نہیں تھا کہ اچانک انھیں پھانسی دے دی جائے گی ہم اندھیرے میں رہے کیا ایک حکمران کے وعدے پر اعتبار کرلینا اور عدالت کے حکم کو غیر موثر سمجھنا کیا اسلامی رویہ ہے؟ شرعی عدالت میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آنا چاہیے تھا کہ اگر ملک اسلامی ہے عدالت اسلامی ہے تو عدالت کا حکم آخری فیصلہ سمجھا جائے گا یا حکمران کے وعدے کو عدالت کے حکم پر برتری حاصل رہے گی کیا جمہوری حکومت میں شخصی فیصلے بھی ہوسکتے ہیں؟ کیا شہباز شریف ملک کی سب سے بڑی عدالت سے زیادہ طاقت ور ہیں کہ ان کے وعدے پر یقین کیا گیا؟ شہباز شریف نے وعدہ کرکے سپریم کورٹ کی توہین کی یا نہیں؟ جو شخص سپریم کورٹ کی توہین کرے وہ اقتدار میں رہ سکتا ہے یا نہیں؟ سپریم کورٹ نے اپنی توہین پر وزیراعظم گیلانی کو برطرف کردیا تھا تو ایک صوبے کے وزیراعلیٰ کو اس توہین پر کیوں برطرف نہیں کیا جارہا؟ کیا توہین عدالت کا قانون بھی امتیازی [Discriminatry] ہوسکتا ہے؟ شرعی عدالت میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آنا چاہیے تھا۔

یہ کہا جارہا ہے کہ لبرل ڈسکورس میں سلمان تاثیر اور آسیہ بی بی نے آزادی اظہار رائے کے بنیادی حق کے تحت رسول کی توہین کرکے اپنے حق کا اظہار کیا مگر ممتاز قادری صاحب نے جس آزادی رائے کا اظہار کرکے تاثیر کو قتل کیا لبرل ڈسکورس اور ہیومن رائٹس فریم ورک میں اس آزادی کی گنجائش نہیں ہے توہین رسالت کی آزادی ہے توہین رسالت کرنے والے کی آزادی چھیننے کی آزادی نہیں ہے ممتاز قادری صاحب نے آزادی کی مذہبی قدر [Religious value of Freedom] پر حملہ کیا لہٰذا مذہب کے دفاع کے لیے شہید ممتاز قادری کو پھانسی دی گئی ہے کیا اسلامی تناظر میں یہ بات درست ہے؟ کیا آزادی اسلام میں عقیدہ، اصول اور قدر [Value] ہے یا صرف صلاحیت Ability ہے اسلام کیا کوئی مذہب بھی آزادی کے عقیدے کو قبول نہیں کرتا جب تک اسلامی علمیت آزادی کے عقیدوں کو رد نہ کرے اسلامی جدوجہد صحیح سمت اختیار نہیں کرسکتی۔ اس مسئلے کا حل بھی شرعی عدالت سے معلوم کیا جاتا۔

شرعی عدالت سے یہ بھی پوچھا جاتا کہ پاکستانی ریاست شریعت کے قانون سے بالاتر ہے یا شریعت پاکستان کی ریاست سے بالاتر ہے؟ یا پاکستانی ریاست خود شریعت کا دوسرا نام ہے؟ اگر پاکستانی ریاست شریعت کا نام ہے تو اس کا ہر اقدام ہر کام مذہبی ہے یا غیر مذہبی اگر پاکستانی مذہبی ریاست کی مذہبی عدالت عظمٰی نے قتل کی سزا دے دی تو اس قتل پر احتجاج کرنا جائز ہے یا ناجائز؟ کیا اسلام میں آزادی ایک عقیدہ، قدر، بنیاد ہے یا آزادی ایک صلاحیت کے طور پر تسلیم کی جاتی ہے؟ عدالت سے یہ بھی پوچھا جاتا کہ شہباز شریف نے چوری چھپے جو وعدہ کیا اس کی آئینی قانونی اسلامی حیثیت کیا ہے؟ یہ سوال بھی اٹھایا جاتا کہ اس وعدے کو پریس میں کیوں نہیں لایا گیا؟ کیا شہباز شریف کا یہ وعدہ عدلیہ کی توہین نہیں ہے توہین عدالت کا مجرم کیا حکمران ہوسکتا ہے؟ حکمران اور عدالت میں تنازعہ پیدا ہوجائے تو حکمران عدالت کو معزول کرسکتا ہے یا عدالت حکمران کو معزول کرسکتی ہے۔ اسلامی قانون اس بارے میں کیا کہتا ہے؟

حیرت ہے کہ علماء نے شریعت عدالت سے ان مباحث پر غور و فکر کے لیے رجوع کرنے کی زحمت ہی نہیں کی کم از کم اس ادارے میں نظریاتی مباحث کے ذریعے اسلامی علمیت کی بالادستی برتری سیکولر دستور پر ثابت کی جاتی اور اس کی روشنی میں مستقبل کا لائحہ عمل تیار کیا جاتا افسوس یہ ہے کہ نظریاتی مباحثے کا اہم ترین موقع ضائع کردیا گیا۔

جماعت اسلامی کے زیر اہتمام ادارۂ نور حق میں تقریب کی صدارت کرتے ہوئے مفتی منیب الرحمان نے کہا کہ ممتاز قادری نے اپنا دینی اور مذہبی فرض ادا کیا ہے[جسارت جمعہ ۱۱ مارچ ۲۰۱۶ء ص ۱۱ بقیہ نمبر ۷] سوال یہ ہے کہ اگر ممتاز قادری نے اپنا فرض ادا کیا تو علماء نے یہ فرض ادا کیوں نہیں کیا وہ عدالت میں کیوں نہیں گئے انھوں نے عدالت اور حکومت کو کیوں نہیں بتایا کہ یہ مذہبی فرض تھا اس کو ادا کرنا حکومت کی بنیادی ذمہ داری تھی جب تم نے اسلامی حکومت کا دعویٰ اور اسلامی قوانین کے نفاذ کا وعدہ ___ کرنے کے باوجود یہ فرض ادا نہیں کیا تو ممتاز قادری نے یہ فرض ادا کر دیا اور ہمارا فرض تمہیں یہ بتانا ہے کہ تم اسے پھانسی نہیں دے سکتے۔ حیرت ہے کہ علماء شریعت کے اس حکم کو عدالت، ریاست یا پارلیمنٹ، شرعی عدالت میں کیوں بیان نہیں کر سکے اور کیوں انتظار کرتے رہے۔

غامدی صاحب کی دلیل تو یہ ہے کہ ریاست کا فریضہ یعنی سزا___ صرف ریاست ادا کرے گی کیونکہ وہ نہیں جانتے کہ جدید سیکولر ریاست جب اپنے فرائض ادا کرنے سے قاصر رہ جاتی ہے تو اس کا متبادل NGO's پیدا کرتی ہے تاکہ ریاست کی نااہلی کے باعث پیدا ہونے والے خلاء کو پر کیا جائے تاکہ لوگ سرمایہ دارانہ ریاست کے خلاف بغاوت برپا نہ کردیں ان NGO's کا فنڈ اربوں ڈالر ہے ان کی کئی اقسام ہیں مثلاً [GONGO]، [GRINGO]، [INGO] ان تنظیموں کے بارے میں معلومات کے لئے GRAHAM TAYLOR کی کتاب The New Political Sociology کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ لہٰذا جب سیکولر سرمایہ دارانہ ریاست بھی ریاستی نااہلی دور کرنے کے لئے متبادل طریقے اختیار کرتی ہے تو ایک لفظی حرفی آئینی اسلامی ریاست اسلامی قوانین نافذ کرنے میں ناکام ہوجائے تو اس خلاء کو پر کرنے والی انفرادی اجتماعی کوششیں بھی جائز ہیں۔

ہمارے سامنے سپریم کورٹ کے فیصلے کا مکمل متن موجود نہیں ہے مگر مفتی منیب الرحمان نے شہادت دی ہے کہ سپریم کورٹ نے دِفاع کے وکلاء کو پورے طریقے سے نہیں سُنا، نہ ان کے مؤقف اور دلائل کو عدالت نے فیصلے کا حصہ بنایا۔ سپریم کورٹ نام نہاد آزاد عدلیہ ہے۔ جب یہ جج ریٹائرمنٹ کے بعد عوام کے درمیان آئیں گے تو انہیں پتہ چلے گا کہ عاشقان رسولؐ انہیں کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ عدالت نے قانونی موشگافیوں کا سہارا لیا۔ ''قانون انسان کے لئے ہوتا ہے انسان قانون کے لئے نہیں'' [دنیا اخبار میں مفتی منیب الرحمان کا ۵ مارچ ۲۰۱۶ء کا کالم]

شہید ممتاز قادریؒ کے وکیل جسٹس نذیر غازی کی تقریر بھی ریکارڈ پر موجود ہے جس میں انھوں نے بتایا کہ انسداد دہشت گردی عدالت کے جج نے مقدمے کے قواعد وضوابط کا کوئی خیال نہیں رکھا۔ اگر یہ تمام باتیں درست ہیں کہ ادنیٰ، اعلیٰ اور عظمیٰ عدالتوں نے قانون کے تحت مقدمہ نہیں چلایا تو سوال یہ ہے کہ وکلاء نے ان عدالتوں پر ان کی کاروائی پر ان کے ججوں پر ان کے طریقہ کار پر عدم اعتماد کا اظہار کیوں نہیں کیا، عدالت میں ججوں پر اعتراض کیوں نہیں کیا کہ تم انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر رہے عدالت کی غیر قانونی کاروائی کا بائیکاٹ کیوں نہیں کیا گیا، تم سے زیادہ جرات مند تو عاصمہ جہانگیر ہے جو عدالت کے سامنے کھڑی ہو کر عدالت کی توہین کرتی ہے اور پھر معافی مانگنے سے انکار کر دیتی ہے اور عدالت پھر بھی ان کا مؤقف خندہ پیشانی سے سنتی رہتی ہے۔ اگر سپریم کورٹ نے ناانصافی کی تو علماء کیوں چپ رہے۔ آپ سے اچھے تو پی پی پی کے جیالے ہیں جنھوں نے آج تک سپریم کورٹ کے فیصلوں کو قبول نہیں کیا اور مسلسل اسے عدالتی قتل کہتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پاکستانی لبرل اور سیکولر لوگ مذہبی لوگوں سے زیادہ جرأت مند ہیں۔ NAP کے تحت فوجی عدالتیں قائم ہوئیں تو ان کی سب سے شدید مخالفت لبرل سیکولر دانش وروں نے علمی اور عملی طور پر کی۔ آرمی پبلک اسکول کے سہولت کاروں کو پھانسی کی سزا ہوئی تو عاصمہ جہانگیر نے سپریم کورٹ سے ان کی سزا کو ملتوی کرا دیا۔ کیا علمائے دین اور دینی قوتیں ایمان کی اس سطح پر آچکی ہیں کہ عاصمہ جہانگیر جتنی جرأت بھی نہیں رکھتیں اس ایمان کے ساتھ امریکا اور مغربی تہذیب کی یلغار کا مقابلہ کیسے ہوگا؟

مولانا فضل الرحمان نے فرمایا کہ پنجاب اسمبلی کا منظور کردہ تحفظ حقوق نسواں بل صرف اسلام نہیں آئین پاکستان کے بھی خلاف ہے [۱۳ مارچ ۲۰۱۶ء جنگ کراچی] مولانا کا یہ بیان درست نہیں۔ یہ بل آئین پاکستان کے عین مطابق ہے جو آزادی کو ایک عقیدے کے طور پر قبول کر کے منشور انسانی حقوق کے ذریعے ہر فرد کی آزادی کے تحفظ اور اس میں مسلسل اور مستقل اضافے کا آرزومند ہے یہ بل مساوات کے فلسفے کی عکاسی کرتا ہے ایک جانب فضل الرحمٰن صاحب آزادی اور مساوات کے عقیدوں کو تسلیم کرتے ہیں منشور انسانی حقوق کے ان دو اصولوں کو اسلامی بتاتے ہیں پھر ان کے نتائج پر بل پر تنقید بھی کرتے ہیں یہ رویہ Oxymoron ہے۔

بل میں مرد کی آزادی کو محدود کر کے عورت کی آزادی میں اضافہ کیا گیا تاکہ وہ مرد کی اجازت کے بغیر آزادی سے جو چاہے کر سکے۔ شوہر اس کی گناہ گار زندگی میں بھی مداخلت کا مجاز نہیں وہ اس کا حق ہے گناہ گار زندگی گزارنے پر شوہر بیوی کو بس طلاق ہی دے سکتا ہے لیکن آزاد زندگی بسر کرنے سے نہیں روک سکتا۔ آپ آزادی کے

عقیدے اور آئین کے بنیادی ڈھانچے پر اعتراض نہیں کر رہے جو مذہب حقوق انسانی کو الحق تسلیم کرتا ہے جبکہ منشور انسانی حقوق کی اکثر شقیں اسلامی علمیت اور ماخذات دین کا انکار کرتی ہیں علماء کرام نے ابھی تک اس منشور کا گہرائی سے جائزہ نہیں لیا مگر فلسفے اور فلسفۂ سیاست کے تمام لوگ اسلام اور اس منشور میں کوئی ہم آہنگی نہیں پاتے ___ منشور انسانی حقوق کو عین اسلام اور خطبہ حجۃ الوداع سے ماخوذ سمجھنا علماء کی غلطی ہے جس کی اصلاح کم از کم ممتاز قادری کی شہادت کے بعد اب ہونی چاہیے۔ آئین کو پرکھنے کا اصل پیمانہ اسلام نہیں منشور حقوق انسانی ہے آئین اسلام کو اسی پیمانے پر پرکھتا ہے اور صرف اسلام کے اتنے حصے پر عمل کی آزادی دیتا ہے جتنا حصہ آزادی کے عقیدے سے ہم آہنگ ہے اور اسلام کا وہ حصہ جو آزادی کے عقیدے اور منشور انسانی حقوق کے خلاف ہے اس پر عمل کی آزادی کبھی نہیں دے گا۔

سپریم کورٹ اب اسلام کو اسی پیمانے پر پرکھ رہی ہے ممتاز قادری کی پھانسی کا فیصلہ، ارتداد کی آزادی کا فیصلہ اور تحفظ حقوق نسواں بل کی صورت میں منشور انسانی حقوق کا الحق [Supreme Good] آزادی [Freedom] رفتہ رفتہ ظہور کر رہا ہے کیونکہ پاکستان ایک مذہبی معاشرہ ہے اور مذہب کی گرفت ابھی مضبوط ہے لہٰذا لبرل ازم آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا ہے فرید زکریا کی کتاب Future of Freedom لبرل ازم کے نفوذ کے طریقے بتاتی ہے۔

غامدی صاحب کا اجتہاد ہے کہ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں یعنی آسیہ بی بی، سلمان تاثیر اور ممتاز قادری شہید سوال یہ ہے کہ یہ تینوں کس قانون کی نظر میں برابر ہیں اسلامی قانون کی نظر میں یا سیکولر مغربی قانون کی نظر میں ___ غامدی صاحب سے زیادہ جرأت ایمانی تو انسداد دہشت گردی کی عدالت کے سربراہ جسٹس پرویز علی شاہ کی تھی جو شہید ممتاز قادری کے خلاف دہشت گردی کے مقدمے کی سماعت کر رہے تھے انھوں نے دلائل سننے کے بعد کہا کہ اسلامی قانون کے تحت تو آپ کو سزائے موت نہیں دی جا سکتی مگر انسداد دہشت گردی کے ملکی قانون کے تحت آپ کو یہ سزا دی جا رہی ہے۔ حیرت ہے کہ ایک سیکولر عدالت کا جج بھی اسلامی قانون اور سیکولر قانون میں فرق کو واضح طور پر جانتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ اسلامی قانون کی روشنی میں یہ تین مختلف نقطہ ہائے نظر رکھنے والے لوگ کیسے برابر ہو سکتے ہیں یہ کیسا اجتہاد ہے؟ اسے ہم الحاد اور فساد کہہ سکتے ہیں اسلامی قانون اور اسلامی علمیت میں اور تہذیب میں، مساوات نہیں ہوتی وہ حفظ مراتب کی تہذیب ہے جہاں مراتب وجود ہوتے ہیں ہر شخص کا درجہ اس کے مقام و مرتبے کے لحاظ سے متعین ہوتا ہے۔ سورہ توبہ میں عرب کے تمام مشرکین کے قتل کا حکم دیا گیا لیکن رسول اللہؐ نے فرمایا کہ مشرکین کی عورتیں اور بچے قتل نہیں کیے جائیں یعنی مشرک مرد، عورت، بچے بھی برابر نہیں ہیں۔

مرتد ہونے والے مسلمان مرد کو قتل کیا جائے گا لیکن مسلمان مرتد عورت کو قتل نہیں کیا جائے گا۔ حج میں مرد سر مونڈے گا عورت سر نہیں مونڈے گی۔ قرآن تمام کفار میں مساوات کا اصول تسلیم نہیں کرتا وہاں بھی مراتب موجود ہیں۔ قرآن نے اہل کتاب میں بھی مساوات نہیں رکھی عیسائیوں کا درجہ یہود سے بہتر ہے۔ قرآن نے کفار میں بھی فرق کیا قرآن میں کفار اور مشرکین کے قتال کا حکم دیا گیا مگر کفار اہل کتاب کو جزیہ دے کر زندہ رہنے کی اجازت دی گئی۔ مشرکین کو اہل کتاب سے بدتر قرار دیا گیا اور ان کے قتال کا حکم دیا گیا لیکن منافقین کو مشرکین اور اہل کتاب سے بھی زیادہ ذلیل قرار دیا گیا۔ منافقین اسلام قبول کرنے کے باوجود تمام کفار سے بدتر ہیں اور دوزخ کے سب سے نچلے درجے میں رہیں گے۔ باپ اولاد کو قتل کر دے تو اولاد باپ کو قصاص میں قتل نہیں کر سکتی۔ لہٰذا مساوات کا اصول تو اسلام تسلیم ہی نہیں کرتا یہ قرآن کے نصوص کا فیصلہ ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسجد میں مساوات ہے مگر وہاں بھی کوئی مساوات نہیں مثلاً موذن مسجد میں سب سے پہلے آتا ہے اور مقتدی سب سے آخر میں۔ اگر مساوات مسجد میں ہے تو امام صاحب لوگوں کی صف کے آگے کیوں کھڑے ہوتے ہیں؟ مسجد میں ہر مسلمان بھی نہیں آ سکتا آنے والے کا پاکیزہ ہونا ضروری ہے ناپاک نہیں آ سکتا ___ مسجد میں عورتیں کبھی مردوں کے ساتھ نہیں کھڑی ہو سکتیں وہ پچھلی صف میں کھڑی ہوں گی پہلی صف میں کھڑے ہونے والے اور آخری صف میں کھڑے ہونے والا کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ جو تکبیر اولی کے ساتھ نماز میں شامل ہوا اور جو نماز کے آخر میں شامل ہو دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ کوئی مقتدی امام اور موذن کے مساوی نہیں ہو سکتا جس مقتدی کا وضو ٹوٹ جائے وہ نماز میں شامل نہیں رہ سکتا وہ صف سے الگ ہو جائے۔ یعنی وضو والا اور بغیر وضو والا برابر نہیں ہو سکتے۔

امام معذور ہو جائے تو وہ جماعت کی امامت نہیں کرا سکتا لہٰذا معذور اور صحت مند مسجد میں برابر نہیں ہو سکتے جو امامت صغریٰ کا مستحق ہے وہی امامت کبریٰ کا مستحق ہے جو امامت کبریٰ کا مستحق ہے اسی پر جہاد فرض ہے لہٰذا عورت کو اسلام نے تینوں ذمہ داریوں سے بری الذمہ قرار دیا اور اسے گھر میں رہنے کا حکم دیا گھر کے کام نسل کی تربیت یہی اس کا جہاد ہے اولاد کی میراث میں ماں باپ کا حصہ برابر ہے جبکہ ماں عورت ہے مگر بیٹی بیٹے کا حصہ برابر نہیں جبکہ بیٹی بھی عورت ہے یعنی حصہ کا تعین جنس کی بنیاد پر نہیں مرتبے کی بنیاد پر ہو رہا ہے۔ اسلام میں کوئی مساوات نہیں ہے مرد طلاق دیتا ہے عورت طلاق لیتی ہے مرد عورت کو سزا دے سکتا ہے عورت مرد کو سزا نہیں دے سکتی مرد کا ستر کم ہے عورت کا ستر زیادہ ہے لہٰذا عورت اور مرد بھی مساوی نہیں۔ ان دلائل کی روشنی میں غامدی صاحب کی یہ دلیل کہ اسلامی قانون کی نظر میں سب مساوی ہیں غلط دلیل ہے۔ لہٰذا

اسلامی قانون کی روشنی میں توہین رسالت کرنے والا غیر مسلم، توہین رسالت کرنے والا مسلمان، اور ایک عاشق رسولؐ کبھی برابر نہیں ہوسکتے۔

حفظ مراتب کا مسئلہ صرف اسلام کا نہیں ہیومن رائٹ ڈسکورس اور ہیومن رائٹس ڈیکلریشن کے تحت بھی آسیہ بی بی اور شہید ممتاز قادری برابر نہیں ہیں اس کا ثبوت یہ ہے کہ ممتاز قادری کو پھانسی دی گئی تو ایمنسٹی انٹرنیشنل نے صرف اس پھانسی کی مذمت کی لیکن اگر آسیہ بی بی کو توہین رسالت کا الزام ثابت ہوجانے کے بعد پاکستان کی عدالت عظمیٰ پھانسی دے دیتی تو ایمنسٹی انٹرنیشنل UNO,NATO اور مغرب کے تمام ممالک اسے انسانی حقوق اور آزادی اظہار رائے کی بدترین خلاف ورزی قرار دیں گے کیونکہ انسانی حقوق کے منشور میں آزادی رائے کے تحفظ کے حق کے تحت ہر شخص کسی کو گالی دے سکتا ہے اس کی توہین کرسکتا ہے۔ آسیہ بی بی نے جو کچھ کیا انسانی حقوق کے عالمی منشور کے تحت ایسا کرنا دنیا کے ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ امریکہ کے آئین کی دوسری ترمیم بھی اس حق کا بھرپور تحفظ کرتی ہے۔ لیبیا میں توہین قرآن اور توہین رسالت کے خلاف ایک مظاہرے کے دوران مشتعل مظاہرین نے امریکی ایمبیسی پر حملہ کردیا، آگ لگادی چند امریکی مرگئے تو UNO کا اجلاس طلب کیا گیا۔ صدر اوباما نے اس اجلاس سے خطاب کیا اور صاف صاف لفظوں میں کہا کہ توہین قرآن اور توہین رسالتؐ آزادی اظہار رائے کی ایک شکل ہے امریکی آئین اس آزادی کا تحفظ کرتا ہے آزادی اظہار رائے پر پابندی عائد نہیں کی جاسکتی امریکیوں کی اکثریت عیسائی ہے ہم اپنے مقدس عیسائی نظریات اور حضرت عیسیٰ کی توہین پر بھی کوئی پابندی عائد نہیں کرتے دنیا کے سب لوگ آزادی کے الحق الخیر [Good] اور اصول کو تسلیم کرتے ہیں لہٰذا ہر شخص کو اظہار رائے کی آزادی حاصل ہے مگر امریکی صدر نے یہ نہیں بتایا کہ اگر کوئی شخص امریکی پرچم کی توہین کرے امریکہ کے قومی پرندے کو گھر میں بند کردے اس کی توہین کرے تو اس توہین پر سزائیں کیوں دی جاتی ہیں کوئی امریکی سپریم کورٹ کی توہین کردے تو اس پر سزا کیوں ملتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ اور انجیل کی تمہارے ملک میں اتنی حیثیت بھی نہیں جو ایک کپڑے کے ٹکڑے، ایک پرندے اُلّو اور امریکی عدالت کے جج کی ہے تو تم مذہب کو بے کار سمجھتے ہو تم اسے علمیت نہیں سمجھتے لہٰذا تم مذہب کی توہین کی اجازت دیتے ہو جس کو علم سمجھتے ہو قابل عزت سمجھتے ہو یعنی امریکی پرچم، امریکی قومی پرندے اور امریکی عدالت اس کی توہین پر سخت سزائیں دیتے ہو یعنی تمہارے یہاں بھی امتیازی [Discriminatory] رویہ ہے مذہبی علامات، شخصیات کی توہین کی عام اجازت ہے سیکولر علامات، شخصیات کی توہین حرام ہے۔ بس یہی معاملہ ہمارے یہاں بھی ہے ہم مذہبی شخصیات کی توہین کو جرم سمجھتے ہیں اور سیکولر عقیدے آزادی، مساوات کی مخالفت کو عین اسلام سمجھتے ہیں۔

اہل مغرب علمائے دین کے ہی دشمن نہیں وہ سائنس کے علماء کے بھی بدترین دشمن ہیں جس طرح علمائے دین سرمایہ دارانہ نظام زندگی کی ترقی، نشونما، عروج میں اپنے فتووں سے رکاوٹ ڈالتے ہیں اور جدیدیت کو روحانیت کے زوال کا ذمہ دار ٹھہراتے ہیں بالکل اسی طرح سائنس دان ماحولیاتی تباہی و بربادی سے پیدا ہونے والے خطرے سے آگاہ کرکے سرمایہ دارانہ نظام کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرتے ہیں لہٰذا ان سائنس دانوں کو بھی جاہل، پاگل، بے وقوف قرار دے کر گرفتار کرلیا جاتا ہے ان کی تحقیقات پر پابندی عائد کردی جاتی ہے کیونکہ مغرب کی دنیا آزادی اور سرمایہ مرکز دنیا [Freedom/Capital Centic World] ہے۔

ہر اصول اور قدر کا پیمانہ صرف یہ ہے کہ اس سے سرمایہ اور آزادی میں اضافہ ہو رہا ہے یا نہیں کیونکہ آزادی کی ٹھوس شکل محض سرمایہ ہے۔ لہٰذا سرمایہ اور آزادی کی راہ میں رکاوٹ بننے والے ہر علم کا انکار کردیا جاتا ہے مغرب کی جدیدیت نے پہلے آسمانی کتابوں، آخرت، مذہبی علوم اور علماء کا انکار کیا ان کی تحقیر، تضحیک، توہین میں کوئی کمی نہیں چھوڑی اب اس تحقیر، تذلیل، تضحیک، انکار کا رخ سائنس دانوں کی طرف ہے۔

منشور انسانی حقوق کے تحت جدید ریاست کا مقصد ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جہاں آزادی میں مستقل و مسلسل اضافہ ہو آزادی کی ٹھوس شکل صرف اور صرف سرمایہ Capital ہے لہٰذا جدید ریاست کا اصل تصور خیر صرف سرمایہ ہے لہٰذا ریاست کا ہر عمل سرمایہ میں اضافے سے مشروط ہوتا ہے کیونکہ معیار زندگی میں مستقل و مسلسل اضافہ سرمایہ کی مسلسل و مستقل فراہمی اور بڑھوتری کے بغیر محال ہے لہٰذا سرمایہ مرکز یہ دنیا [Capital Centric Wrold] ہر اس عمل، طریقے، کام، تحقیق علم کی دشمن ہے جس سے سرمایہ میں کمی کا خطرہ در پیش ہو لہٰذا جدید ریاست ہر فیصلہ اس بنیاد پر کرتی ہے کہ اس سے سرمایہ کی رفتار تیز تر ہوسکے آزادی اور سرمایہ [Freedom and Capital] لازم و ملزوم ہیں اس راستے میں مذہب سائنس فلسفہ جو بھی رکاوٹ بنے جدید ریاست ان سب کو کچل کر رکھ دیتی ہے کیونکہ خیر، حق، سچائی جدید ریاست کی نظر میں صرف سرمایہ ہے لہٰذا علم کے ہر دائرے کو خواہ وہ مذہب سے نکلتا ہے یا سائنس سے یا فلسفے سے یا شاعری سے اسے صرف اور صرف سرمایہ کی میزان پر پرکھا جائے گا اگر وہ دائرہ سرمایہ کی راہ میں رکاوٹ پیدا نہیں کرتا تو اسے نظر انداز کردیا جائے گا اگر وہ دائرہ علم سرمایہ کے لیے خطرہ بن رہا ہے تو اسے کچل دیا جائے گا۔

عالم اسلام میں بلاوجہ سائنس کو سب سے برتر علم اور سائنس داں کو سب سے بہتر عالم جانا جاتا ہے لیکن سائنس دان [Scientists] کی مغرب میں اتنی عزت بھی نہیں کی جاتی جتنی عزت سٹے باز Risk Managers رنڈیوں، مراثیوں، بھانڈوں [Showbuisness Stars] اور کھلاڑیوں [Call girls/Sports men] کی ہوتی ہے۔

سائنس دانوں کی عزت کا حال یہ ہے کہ ان کی تحقیقات جو سرمایہ دارانہ نظام اور کارپوریشن کے مفادات کے خلاف ہوں ان کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا جاتا اور ایسی تحقیقات پیش کرنے والے سائنس دانوں کو گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی پروفیسر Noamiorsekes اپنی کتاب Collapse of Western Civilization میں لکھتی ہے

A crucial but under-studied incident was the legal seizing of notes from scientists who had documented the damage caused by a famous oil spill of the period, the 2011 British Petroleum Deepwater Horizon. Though leaders of the scientific community protested, scientists yielded to the demands, thus helping set the stage for further pressure on scientists from both governments and the industrial enterprises that governments subsidized and protected. Then legislation was passed (particularly in the United States) that placed limits on what scientists could study and how they could study it, beginning with the notorious House Bill 819, better known as the "Sea Level Rise Denial Bill," passed in 2012 by the government of what was then the U.S
. state of North Carolina (now part of the Atlantic Continental Shelf) Meanwhile the Government Spending Accountability Act of 2012 restricted the ability of government scientists to attend conferences to share and analyze the results of their research. Though ridiculed when first introduced, the Sea Level Rise Denial Bill would become the model for the U.S. National Stability Protection Act of 2025, which led to the conviction and imprisonment of more than three hundred scientists for "endangering the safety and well-being of the general public with unduly alarming threats." By exaggerating the threat, it was argued, scientists were preventing the economic development essential for coping with climate change. When the scientists appealed, their convictions were upheld by the U.S. Supreme Court under the Clear and Present Danger doctrine, which permitted the government to limit speech deemed to represent an imminent threat. Had scientists exaggerated the threat, inadvertently undermining the evidence that would later vindicate them? [Nomi Oreskes & E. Mcnway The collapse of western civilization: a view from the future , Columbia University Press. New York, 2014, p. 13, 14]

Naomi Oreskes نے ریاست ناتھ کیرولینا کے ساحلوں سے متعلق جس بل House Bill 189 کا ذکر کیا ہے اس بل کے نفاذ کا مقصد سمندر کی سطح بلند ہونے کی سائنسی حقیقت کو قانون کی طاقت سے نظر انداز کرنا تھا اس قانون کی غیر منصفانہ منظوری پر تبصرہ کرتے ہوئے امریکا کے ایک مسخرے [Comedian] اسٹیفن کولبرٹ نے اپنے مزاحیہ پروگرام میں عجیب وغریب جملہ کسا۔ اگر سائنس آپ کو کوئی ایسا حل پیش کرتی ہے جو آپ کو پسند نہیں تو آپ اس کے خلاف ایک قانون منظور کرلیں کہ سائنسی نتائج غیر قانونی ہیں مسئلہ حل ہوجائے گا۔ قانون دانوں کی یہ کوشش سائنس کو غیر قانونی قرار دینے کے مترادف ہے

"If your science gives you a result you don't like, pass a law saying the result is illegal. Problem solved, "the Joked. lawmakers' efforts as an attempt to outlaw science.

امریکا میں سائنس اور سائنس دانوں کے ساتھ قانون دانوں نے وہی سلوک کیا جو پاکستان میں اینکر پرسن، لبرل مفکر اور رنڈیاں اسلامی پروگرام میں اسلام کے ساتھ کرتی ہیں لہٰذا بلڈروں کے ایک نمائندے نے بل کی حمایت میں کہا

Fom Thompson, president of NC- 20, a coastal development group and a key supporter of the law, said the science used to make the 39 - inch prediction was flawed, and added that the resources commission failed to consider the economic consequences of preparing the coast for a one - meter rise in sea level, under which up to 2,000 sequre miles would be threatened.
The endeavor would cost the state hundred of millions of dollars, Thompson said.
"I don't want to say they're being dishonest, but they;re pulling data out of their hip pocket that arn't working,"

بل کا متن لکھنے والی رکن اسمبلی نے ارشاد فرمایا:

Republican State Rep. Pat McElraft, who drafted the law, called the law a "breather" that allows the state to "step back" and continue studying sea - level rise for the next several years.with the goal of achieving a more accourate prediction model.

"Most of the environmental side say we're ignoring science, but the bill actually asks for more science," she said "We"re not ignoring science, we're asking for the best science possible, the best extrapolationpossible, looking at the historical data also. We just need to make sure that we're getting the proper answers."

[http://abcnews.go.com/US/north-carolina-bans-latest-science-rising-sea-level/story?id=16913782]

اصول یہ برآمد ہوا کہ ہرتہذیب اپنے تصور خیرالحق اورالعلم کے خلاف تنقید کوخطرہ بننے کی آزادی نہیں دیتی البتہ تقلید کی لامحدود آزادی عطا کرتی ہے۔عصر حاضر بھی آزادی اظہاررائے کے نام پر اجتہاد، آزادخیالی، آزادی کا عہد نہیں اصلاً تقلید ہی کا عہد ہے مغرب کے مذہب آزادی یعنی سرمایہ داری کی کامل تقلید کا عہد۔حیرت کی بات یہ ہے کہ مغرب میں تقلید کا نام آزادی اور علم ہے لیکن یہی مغرب مشرق میں تقلید کو بدترین جہالت قرار دیتا ہے۔مغرب کے اصول کے عین مطابق اگر اسلامی تہذیب بھی اپنے تصور خیرالحق اور العلم کے خلاف تنقید کی اجازت نہیں دیتی تو اس پر متجددین کوشرم کیوں محسوس ہوتی ہے؟

عزت کا پیمانہ مغرب اور دنیائے جدید [Modren Age] میں صرف مادی ہے اور وہ ہے پیسہ۔ ہرعمل، فیصلے، حکمت عملی کی بنیاد صرف یہ ہے کہ سرمایہ میں اضافہ کس طریقے سے ہوگا؟ ۔ جوزیادہ کماتا ہے وہ زیادہ عزت پاتا ہے سب سے زیادہ پیسہ سٹے باز کماتے ہیں اس کے بعد رنڈیاں اور کھلاڑی وغیرہ اس کے بعد سائنس دانوں کا نمبر آتا ہے کیونکہ سٹے باز اور رنڈیاں سرمایہ کی پیداوار میں سائنس دانوں سے زیادہ بہتر ہیں مثلاً عالمی اولمپکس کے ایک ہفتے کے کھیل سے جتنا سرمایہ پیدا ہوتا ہے امریکہ کی تمام یونیورسٹیاں سال بھر میں اتنا سرمایہ پیدا نہیں کرسکتیں اولمپکس کے کھیل کے دوران ایک ہفتے میں جتنی شراب پی جاتی ہے دنیا کے بائیس ملکوں میں اتنی شراب ایک سال میں پی جاتی ہے۔صرف امریکہ میں عریانی فحاشی کی صنعت ایک سال میں جتنا سرمایہ پیدا کرتی ہے دنیا کی کئی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں (جن میں مائیکروسافٹ جیسی کمپنی بھی شامل ہے)اجتماعی طور پر بھی اتنا سرمایہ پیدا نہیں کرتیں کرس ہیجز کی کتاب دیکھ لیجیے۔

World wide porn revenues topped 97 billion Dollar in 2006. That is more than the revenues of Microsoft, Google. Amazon, e Bay, Yahoo, Apple, Net flix & Earth link combined. [Chris Hedges., *Empire of illusion : The end of literacy & the triumph of spectalce* , Nation Books USA 2009, p. 58]

لہٰذا زیادہ اجرت [Salaries/wages] اسے ملے گی جوزیادہ سرمایہ پیدا کرے گا۔ برکلے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی تنخواہ یونیورسٹی کے فٹبال کوچ سے کم ہے فٹبال کوچ سالانہ تین ملین ڈالر کماتا ہے اور وائس چانسلر تین لاکھ ڈالر بھی نہیں کماتا۔ایک فٹبال میچ سے جتنا سرمایہ پیدا ہوتا ہے برکلے اتنا سرمایہ کئی سالوں میں نہیں پیدا کرسکتی۔لہٰذا استاد، پروفیسر، وائس چانسلر کوفری مارکیٹ کے اصول Each according to his ability کے مطابق بہت کم پیسے ملتے ہیں مغرب جدید دنیا سرمایہ دارانہ نظام میں صلاحیت قابلیت سے مراد صرف سرمایہ پیدا کرنے [Creation of money] کی صلاحیت ہے فٹبال کوچ اس پر پورا اترتا ہے لہٰذا زیادہ کمانے والے کوزیادہ نوازا جاتا ہے اسی لیے پاکستان کے کسی بڑے سے بڑے دینی مدرسے کے شیخ الحدیث کی تنخواہ بارہ پندرہ ہزارروپے سے زیادہ نہیں ہے مگر سرکاری یونیورسٹی کے ایک چپراسی اور خاکروب کی تنخواہ بائیس ہزارروپے ہے صرف اس لیے کہ وہ نظام سرمایہ داری کا کارندہ ہے اور شیخ الحدیث اس نظام کا باغی ہے ان کا علم اور دین اس نظام کے راستے میں حلال وحرام کے فتوے لگا کر ترقی کی رفتار روک دیتا ہے۔لہٰذا اس بغاوت کی سزا اسے دی جارہی ہے۔لیکن یہی شیخ الحدیث اسی علم اور اسی جسم کے ساتھ کسی سرکاری وغیرسرکاری یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں استاد بن جائے ،اسلامی نظریاتی کونسل میں شامل ہوجائے کسی اسلامی غیراسلامی بینک کا مشیر امور مذہبی بن جائے تو فوراً اسے لاکھوں روپے تنخواہ ملنے لگتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیوں؟اس لیے کہ وہ نظام حاضر موجود کے لیے اپنے علم کواستعمال کرنے پرآمادہ ہوگیا ہے۔لہٰذا نظام اس کا صلہ اوراجرا سے عطا کرے گا۔

کرس ہیجز اپنی کتاب *The impire of illusion* میں لکھتا ہے

The football coach is Berkeley's highest paid employee. He makes about 3 million dollar. [p. 94]

کرس ہیجز اسی کتاب کے باب Illusion of Love میں لکھتا ہے کہ امریکہ میں ایک اعلیٰ ترین رنڈی تین ہزار ڈالر فی گھنٹہ کماتی ہے۔آج کل اسے

آرٹسٹ،فلم اسٹار،فلمی ستارہ sex worker کہاجاتا ہےلیکن اس پیشے کے عیوب ظاہر کرنے کے لیے سب سے بہترین لفظ یہی ہے۔

The porn stars make anywhere from 1500 dollar to 3000 dollar an hour as prostitute. [p. 68, ibid]

اگر یہ رنڈی روزانہ بارہ گھنٹے کام کرے تو اس کی روزانہ کی آمدنی ۳۶ ہزار ڈالر ہے جوایک امریکی استاد کی سالانہ آمدنی ہے یہ رنڈی ماہانہ دس لاکھ اسی ہزار ڈالر کماتی ہے جبکہ امریکی سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ایک سال میں صرف دولاکھ سترہ ہزار چار سو ڈالر کماتا ہے رنڈی کا لفظ اب متروک ہوگیا ہے کیونکہ معاشرے میں گناہ اور گناہ گار کو پسند کیا جارہا ہے۔اسے برداشت [tolerance] کہتے ہیں یہ آزادی کے عقیدے کا نتیجہ ہے ہر پھول کو کھلنے دو۔آپ نیک کام کریں دوسرے کو برے کام کرنے دیں دونوں کا حق ہے عہد حاضر حق [Right] کے منہاج کا عہد ہے آپ جو چاہے کریں کہ حق [Good] کچھ نہیں ہوتا یہ ہر شخص کا محض دعویٰ ہوتا ہے ہر شخص کوحق [Right] ہے کہ جسے خیر [Good] سمجھے اپنی ذاتی زندگی میں اسے خود اختیار کرے دوسرے کواختیار کرنے پر مجبور نہ کرے اپنی مرضی آزادی اختیار مطلق سے آپ جس خیر کواختیار کرنا چاہیں کرسکتے ہیں۔دوسرے معنوں میں خیر کی بحث بے معنی ہے خیر کچھ نہیں ہوتا اصل چیز پیسہ ہے۔بس پیسے کماؤ جدید نظام تعلیم اور تعلیمی اداروں کا یہی مقصد ہے۔

حسین نصر نے بھی یہ بات لکھی ہے کہ مغرب میں اسپورٹس ہیرو کی ایک سال کی آمدنی ایک بہت بڑے سائنس داں اور عظیم مفکر کی پوری زندگی کی آمدنی سے زیادہ ہوتی ہے۔

There are now sports heroes who make more of a salary in one year than the greatest westren scientists or scholars will do in his or her life time. [S. H. Nasr: *A Young Muslim's guide to the modern world*, Suhail Academy Lahore, 1988, p.232]

مشہور فلسفی مائیکل سانڈل لکھتا ہے کہ امریکہ میں اسکول کا ایک عام استاد ایک سال میں ۴۳ ہزار ڈالر کماتا ہے لیکن ڈیوڈ لیٹر مین جو رات گئے فحش گوئی کے پروگرام کی میزبانی کرتا ہے اس کی سالانہ آمدنی اکتیس ملین ڈالر ہے امریکہ کا سب سے عاقل اہم ترین آدمی سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ایک سال میں صرف دولاکھ سترہ ہزار چار سو ڈالر کماتا ہے اور ایک ٹیلی ویژن شو کی جج جوڈی ایک سال میں ۲۵ ملین ڈالر کما لیتی ہے

☆The average schoolteacher in the United States makes about $43,000 per year. David Letterman, the late-night talk show host, earns $31 million a year.

☆John Roberts, chief justice of the U.S. Supreme Court, is paid $217,400 a year. Judge Judy, who has a reality television show, makes $25 million a year. [*Justice, What's The Right Thing To Do?*, Michael J. Sandel ,p.162]

مسلمانوں ، اسلامی جماعتوں پر مغرب کا اعتراض یہ ہے کہ ایک طرف تم آزادی کو صلاحیت [Ability] کے بجائے ایک قدر [Value] اصول [Principle] ،عقیدے [Faith] کے طور پر تسلیم کرلیتے ہو اور اس کے بعد آزادی پر تحدیدات [Limitations] عائد کرنا شروع کردیتے ہو۔تمہارا طریقہ Oxymoron ہے آزادی کو جب تم نے عقیدہ کے طور پر قبول کرلیا تو اس میں If اور But کے لاحقے سابقے بے بنیاد ہیں جب آزادی قدر ہے تو رسول،قرآن،انسان، پیغمبر سب کی توہین تنقیص کی آزادی ہے اور اگر کوئی شخص قرآن یا رسول کی توہین کرتا ہے تو اس کا علاج تشدد جھگڑا نہیں بلکہ یہ ہے کہ اسے مزید آزادی دو۔مزید آزادی۔یہ مغرب کا قطعی حتمی دعویٰ ہے دلیل اور ثبوت پیش خدمت ہے:

We have taken these positions because we believe that freedom and self-determination are not unique to one culture. These are not simply American values or Western values - they are universal values. And even as there will be huge challenges to come with a transition to democracy,

That is what we saw play out in the last two weeks, as a crude and disgusting video sparked outrage throughout the Muslim world. Now, I have made it clear that the United States government had nothing to do with this video, and I believe its message must be rejected by all who respect our common humanity. I know there are some who ask why we don't just ban such a video. And the answer is enshrined in our laws: Our Constitution protects the right to practice free speech.

Here in the United States, countless publications provoke offense. Like me, the majority of Americans are Christian, and yet we do not ban blasphemy against our most sacred beliefs. As President of our country

and Commander-in-Chief of our military, I accept that people are going to call me awful things every day - (laughter) - and I will always defend their right to do so. (Applause.)
Americans have fought and died around the globe to protect the right of all people to express their views, even views that we profoundly disagree with. We do not do so because we support hateful speech, but because our founders understood that without such protections, the capacity of each individual to express their own views and practice their own faith may be threatened.
We do so because given the power of faith in our lives, and the passion that religious differences can inflame, the strongest weapon against hateful speech is not repression; it is more speech - the voices of tolerance that rally against bigotry and blasphemy, and lift up the values of understanding and mutual respect.
But in 2012, at a time when anyone with a cell phone can spread offensive views around the world with the click of a button, the notion that we can control the flow of information is obsolete. The question, then, is how do we respond?
It is time to marginalize those who - even when not directly resorting to violence - use hatred of America, or the West, or Israel, as the central organizing principle of politics.
[Remarks from President Barack Obama to the UN General Assembly, New York, 2012.09.26]

اقوام متحدہ میں صدر امریکہ کی تقریر کے بعد ایران کے احمدی نژاد، پاکستان کے زرداری، مصر کے صدر مرسی، ترکی کے طیب اردگان نے خطاب کیا لیکن کسی ایک کی یہ جرات نہ ہوئی کہ وہ صدر اوباما کی تقریر پر تنقید کرتے اور کہتے کہ ہم آزادی کے اس عقیدے کو جو تمہارے جدید فلسفے فیڈرلسٹ پیپرز اور منشور انسانی حقوق کے کفر سے نکلا ہے نہیں مانتے تم امریکہ میں حضرت عیسیٰؑ کی توہین کی اجازت دے سکتے ہو لیکن مسلمان نہ حضرت عیسیٰؑ کی توہین کی اجازت دیں گے نہ رسالت مآب ﷺ کی توہین کرنے دیں گے ہم ایسے کسی عقیدۂ آزادی کو تسلیم نہیں کرتے ان چاروں نے صرف یہ کہا کہ اسلام آزادی کی اجازت دیتا ہے آزادی اسلامی قدر [Value] ہے ہم اسے مانتے ہیں مگر اسلام توہین رسالت کی آزادی کی اجازت نہیں دیتا امریکی صدر کی تقریر کے بعد یہ جاہلانہ استدلال صرف علم کی نہیں ایمان اور عقیدے کی شکست کا مسئلہ ہے مغرب سے ہم علم ایمان اور عقیدے کی جنگ ہار رہے ہیں اس کو جیتنے کا صرف ایک طریقہ ہے اپنے ایمان علمیت عقیدے کا جرات سے اظہار اور اس پر عزیمت کے ساتھ استقرار ـــــــ اوباما نے صاف لفظوں میں کہہ دیا ہے کہ انٹرنیٹ کی دنیا میں توہین، تمسخر، تذلیل، تضحیک، گالم گلوچ ایک عام بات ہے۔ اس میں برا ماننے، غصے میں آنے، تشدد کرنے کی ضرورت نہیں۔ ہر شخص کو کسی کی توہین کرنے، گالیاں دینے، تمسخر اڑانے کی مکمل آزادی ہے آزادی کے خیر کو تمام دنیا مانتی ہے منشور انسانی حقوق اور امریکی دستور اظہار رائے کی اس آزادی کو تحفظ دیتے ہیں تمام اسلامی ممالک نے جو اس UNO کے رکن ہیں اس منشور پر دستخط کئے ہیں لہٰذا آپ کو صرف گالیاں سننے کی، صبر کرنے کی آزادی ہے۔ گالیاں دینے والے کے لیے کوئی قاعدہ، قانون، ضابطہ، سزا نہیں ہے۔ یہ ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ گالیاں دینے والے کے لیے پابندی کا کوئی قانون نہیں ہے۔ گالیاں سننے والے کے لیے صرف سننے اور برداشت کرنے کا قانون ہے۔ اگر کوئی گالی سن کر مشتعل ہو جائے تو وہ انسان ہونے کا ثبوت نہیں دیتا اسے انسان بن کر رہنا چاہیے اگر انسان نہیں بنے گا تو ہم ڈرون حملے سے ان کو انسان بنا دیں گے۔ انسان وہ ہے جو آزادئ اظہار رائے کے حق کو تسلیم کرے اور اگر کوئی اس حق کا غلط استعمال بھی کر رہا ہے تو اس کو اس حق کے استعمال سے نہ روکے ـــــ اس مسئلے کا حل صرف یہ ہے کہ گالیاں دینے والے کو گالیاں دینے کی مزید آزادی عطا کی جائے، اور زیادہ آزادی ـــــ مزید آزادی اس آزادی میں اضافہ کرتے چلے جائیں اور سننے والے صبر و ضبط کرتے رہیں یہی انسانیت کا تقاضا ہے۔ روشن خیال انسان ایسا ہی ہوتا ہے جو ان اصولوں کو نہیں مانتا وہ وحشی، درندہ، بھیڑیا، پاگل ہے اور پاگل کے لیے جدیدیت میں کوئی آزادی نہیں جان رالز لکھتا ہے کہ ایسے پاگلوں کو اس طرح ختم کر دیا جائے جس طرح جراثیم کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔

That there are doctrines that rejects one or more democratic freedom is itself a permanent fact of life, or seems so. This gives us the practical task of containing them__like war and disease __ so that they do not overturn political justice [John Rawls, Political Liberalism, New York : Columbia University Press, 2005, p.64]

اوباما کی یہ دلیل کہ اکیسویں صدی میں کوئی بھی شخص موبائل فون کا بٹن دبا کر نہایت متشددانہ جابرانہ خیالات پوری دنیا میں پھیلا سکتا ہے تو ہم اطلاعات کے اس بہاؤ کو کیسے روک سکتے ہیں لہٰذا اس مسئلے کا حل اوباما نے یہ بتایا کہ مسلمانوں ضبط کرنا سیکھو ـــ یہ جابرانہ متشددانہ ٹیکنالوجی ایجاد کرنے والے، اسے فروخت اور استعمال کرنے

والے امن کے علم بردار ہیں اور جارحیت، نفرت، تشدد پھیلا کر لوگوں سے اور اسلام سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ وہ ہر فرد کے جذبات کو قابو میں رکھے__ اگر بٹن کو آزادی ہے کہ وہ جب چاہے جارحیت پھیلا دے، ٹیکنالوجی کے بٹن کے لئے کوئی قاعدہ، اخلاقیات اصول نہیں بس ہر انسان اپنے جذبات کو قابو میں رکھے یہ ایک احمقانہ خواہش ہے اسلام اور اسلامی علمیت اس مسئلے میں کچھ نہیں کر سکتی مغرب کے خلاف عالم اسلام میں ہلکا پھلکا تشدد جدیدیت کے جبر کا ردعمل ہے اور ردعمل کو کوئی نہیں روک سکتا یہ ردعمل صرف اسلام کی طرف سے نہیں ہے دنیا میں ہر جگہ جدیدیت کی عالمگیریت کے خلاف ردعمل کی سینکڑوں تحریکیں چل رہی ہیں جن کی اطلاعات میڈیا یا اسی طرح چھپاتا ہے جس طرح شہید ممتاز قادریؒ کے جنازے کی اطلاعات چھپائی گئیں۔ جاپان کی مذہبی متشدد تنظیم Aum Shinrikyo امریکہ میں اسقاط حمل کے خلاف دہشت گرد تحریک، اسپین، بورنیو، بوسٹن، کی نسلی قومی دہشت گرد تحریکیں، جرمنی، اٹلی، ارجنٹینا، بھارت میں کمیونسٹوں سوشلسٹوں کی دہشت گرد تحریکیں ان کی تفصیل J.M Lutz کی کتاب Global Terrorism میں پڑھیے۔

ویسے بھی مغربی تہذیب دنیا کی سب سے متشدد، جابر، ظالم تہذیب ہے اور اس کا ثبوت کراچی یونیورسٹی کے ایم اے کے بین الاقوامی تعلقات کے نصاب میں پڑھائی جانے والی کتاب Global Politics میں موجود ہے دنیا کی بدترین مغربی دہشت گردی کے اعداد وشمار پڑھیے دنیا کی تمام قوموں کی دہشت گردی ایک طرف مغرب کی عالمی دہشت گردی دوسری طرف

It has been suggested that since 3600 B.C., there have been only 292 years without war, and each decade since 1816 has averaged twenty-two wars.It is estimated that more than 150 million people have died from war-related deaths since 3000 B.C.
"Each of the centuries prior to the sixteenth accounted for less than 1 percent of all war deaths. In fact all of them added together accounted for little more than 4 percent of these deaths, while almost 96 percent of war deaths were estimated to occur in the modern period of history, 1500-2000."Seventy-three percent of all war-related deaths since 3000 B.C. have occurred in the twentieth century A.D." Civilian deaths have been a large part of the increase in war deaths. According to UN Secretary General Kofi Annan, "UN sources estimate that at least three-quarters of the casualties of recent conflicts have been civilians, though the precise numbers are not known. " Over half of the civilians, though war victims of the past decade have been children, including two million dead and six million physically disabled since 1990.
Most of the war throughout history have occurred in the past two centuries. perhaps more disturbing.
from the point of global security, it is a shocking fact... that in some ways we are living through one of the worst decades in modern history. The 1970s were the decade with the most war onsets of all types. This was not an insolated spike, as 1960s and 1980s were also worse decades than average. And while the data for the 1990s are not complete, the 1990s will likely win the dubious distinction of being one of the two most war-prone decades [along with the 1970s] since the Congress of Vienna.
Juliet Kaarbo . -James Lee Ray Global Politics, Wadsworth publishing 10 edition (Febuary 2010)chap 5 International Confilct p.162,163]

یہ مغربی دہشت گرد عالم اسلام کو امن کے اسباق پڑھا رہے ہیں اور علماء شہادت دے رہے ہیں کہ اسلام دہشت گردی کا حامی نہیں ہم دہشت گرد نہیں ان میں جرات نہیں کہ وہ کہہ سکیں کہ دہشت گرد تم ہو دنیا کو دہشت گردی کے تمام طریقے تم نے سکھائے ہیں تم اپنے اسلحے کے تمام کارخانے بند کر دو اور تلوار گھوڑے کا زمانہ واپس لے آؤ دہشت گردی ختم ہو جائے گی ۔ امریکی دہشت گردی کے لئے ہارڈ ورڈ یونیورسٹی سے شائع ہونے والی مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of Democracy پڑھیے کہ امریکہ نے پچاس سال میں دس کروڑ ریڈ انڈین کس طرح قتل کئے۔

آسیہ بی بی کے مسئلے کو امریکی صدر کی تقریر کے تناظر میں دیکھیے ——— اگر آسیہ بی بی کو پھانسی دی جاتی تو UNO پاکستان پر تجارتی پابندی عائد کرتا اس کی برآمدات بند کر دیتا اور UNO یا NATO کے ذریعے پاکستان کی تجارتی ناکہ بندی بھی کر سکتا تھا پاکستان پر حملے کی اسے بہر حال جرات نہ ہوتی کہ پاکستانی فوج دنیا کی چھٹی عظیم بری فوج ہے اور ایسی فوج ہے کہ اگر لڑنا چاہے تو امریکہ کو بھی شکست دے سکتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ سیکولر مغربی قوانین بھی توہین رسالت کرنے والے مجرم اور

توہین رسالت کے مجرم کو قتل کرنے والے شہید کے درمیان فرق کرتے ہیں اور دونوں کے لئے اس کے رویے، طریقے، سزا و جزاء کے اصول یکسر مختلف ہیں۔ سپریم کورٹ نے آسیہ بی بی کے خلاف توہین رسالت کے مقدمے کی سماعت التواء میں رکھی لیکن ممتاز قادری کے خلاف مقدمے کی سماعت تیز رفتاری سے کر کے انھیں سزائے موت سنا دی یہ رویہ بھی ریاست اور آئین کی ترجیحات کا تعین کر رہا ہے سیکولر آئین کے تحت بھی مراتب کا خیال رکھا جاتا ہے آسیہ بی بی نے آزادی اظہار رائے کا حق استعمال کیا جس کی ضمانت منشور حقوق انسانی نے دی ہے لہٰذا ان کی زندگی اہم ہے جبکہ ممتاز قادری نے اس آزادی کو چھیننے کا ارتکاب کیا ہے جس کی آزادی منشور حقوق انسانی میں نہیں دی گئی ہے لہٰذا آزادی کے متوالے کے مقدمے کی سماعت ملتوی رکھی گئی آزادی کے دشمن کو جلد پھانسی دے دی گئی امتیازی سلوک [Discrimination] یہاں بھی موجود ہے یعنی ہر تہذیب اور علمیت میں خواہ وہ جدید مغربی تہذیب اور اس کا منشور انسانی حقوق ہو__ اس میں بھی تمام انسان برابر نہیں ہوتے جو اس تہذیب کی علمیت پر اور عقیدے پر ایمان لاتا ہے اس کا مقام بلند ہوتا ہے جو اس عقیدے پر ایمان نہیں لاتا وہ کمتر ہوتا ہے مساوات عملاً ممکن ہی نہیں حیرت ہے کہ غامدی صاحب نے اس سلسلے میں کوئی اجتہاد پیش نہیں کیا۔

غامدی صاحب جیسے عقلی لوگ سوال اٹھائیں گے کہ توہین رسالت ؐ کے قانون کی خلاف ورزی پر قتل کرنے کی عقلی دلیل کیا ہے۔ ہم اجماع کو نہیں مانتے ہمیں عقل سے بتایا جائے۔ سوال یہ ہے کہ کیا عقل ماخذ دین ہے اگر ہے تو اس کی نقلی یا عقلی دلیل پیش کی جائے پھر عقل سے بھی اسے ثابت کر دیا جائے گا ویسے غامدی صاحب کا اصول یہ ہے کہ (دانش) عقل پہلی وحی ہے اور قرآن دوسری وحی [افضال ریحان جاوید غامدی سے انٹرویوص ۵۸ مشمولہ اسلامی تہذیب بمقابلہ مغربی تہذیب حریف یا حلیف لاہور دارالتذکیر ۲۰۰۴ء] اس علمی اصول کے ساتھ انہوں نے قرآن کی کوئی دلیل پیش نہیں کی ویسے بھی تاریخی طور پر یہ معتزلہ کا اصول ہے جو عقل کو پیغمبر باطن قرار دیتے ہیں معتزلہ کے اس اصول پر عالم اسلام میں بے شمار کتابیں لکھی گئیں ہیں لہٰذا اس پر تنقید کی ضرورت نہیں۔ جاوید غامدی صاحب سرسید کے مکتب فکر کے آدمی ہیں جو خود کو معتزلی کہتے تھے ویسے بھی دنیا میں ہر دائرہ علم کے کچھ مقدمات، بدیہیات ہوتے ہیں اور اس دائرہ علم میں کلام کرنے کے لئے ان مقدمات پر ایمان لانا ہوتا ہے اس ایمان کی کوئی دلیل نہیں ہوتی سائنس اور ریاضی میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے [اس سلسلے میں تفصیلات کے لئے ہمارا مضمون "**ہر فرد مجتهد مطلق هے : محترم ڈاکٹر نجات الله کی تحقیق**" کا مطالعہ فرمائیے]۔

جدیدیت کے سب سے بڑے فلسفی کانٹ سے پوچھا جائے کہ ہم آفاقی اخلاقی اصولوں کے فلسفے (C.I) کو عقل کی بنیاد پر کیوں قبول کریں تو وہ کہے گا Believe In Reason یعنی عقل پر ایمان لاؤ پہلے ایمان لاؤ پھر دلیل دیں گے۔ مگر ایمان محتاج دلیل نہیں ہے کیوں کہ وہ take for granted اور self evedent evidence ہے بدیہی حقیقت ہے، آفاقی سچائی ہے اس کی دلیل کیوں طلب کر رہے ہو بس اسے مان لو کانٹ کا مضمون What is Enlightenment پڑھ لیجئے اس میں کانٹ نے لکھا ہے کہ روشن خیال عقل مند انسان وہ ہے جو وحی، عالم ڈاکٹر کا انکار کرتا ہے اور ہدایت و روشنی کے لئے کسی خارجی ذریعے کی طرف نہیں دیکھتا انسان وہی ہے جو صرف اپنی عقل سے فیصلے کرتا ہے __ اس فلسفے کی کوئی عقلی دلیل کانٹ نے بیان نہیں کی یہ مضمون نیٹ پر موجود ہے۔

کانٹ بتائے گا کہ ایمان عقلیت سے ماوراء ہے اس ایمان کے بعد یعنی اس مابعد الطبیعیات سے ہمارے ذرائع علم نکلیں گے وہ ذرائع علم عقلیت اور تجربیت ہیں ان کے بغیر حقیقی علم کا حصول ممکن ہی نہیں۔ لہٰذا اصل علم سائنسی علم ہی ہے اور اس پر ایمان لانا ہوگا۔

اس صدی کے سب سے بڑے سیاسی فلسفی John Rawls نے لبرل ازم کو زندہ کرنے کے لیے جتنی بھی دلیلیں دی ہیں وہ سب کی سب ایمانی دلیلیں ہیں۔ سوال یہ ہے کہ سرمایہ داری کے نظریہ لبرل ازم کے عقیدوں، آزادی، مساوات، دستوری آئینی جمہوریت، پر ہم کیوں ایمان لائیں۔ ان عقیدوں کی عقلیت [Rationality of Faith] ان عقائد کی عقلی توجیہہ کیا ہے تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے جان رالس کا شارح ڈربن اپنی کتاب "On Rawls & Political Liberalism" میں صاف صاف لکھتا ہے آئینی دستوری لبرل جمہوری روایات اور ریاست عہد جدید کا الحق اور الخیر [Suprem Good] ہے جس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اگر کوئی جاہل شخص لبرل دستوری جمہوریت جیسے معیاری، مثالی نظام میں زندگی بسر کرنے کے فوائد اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا تو میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسے جاہل کو کس طرح سمجھایا جائے۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ایسے شخص کو گولی ماردی جائے ایسے احمق جاہل شخص کے ساتھ مکالمے کی ضرورت نہیں ان موضوعات پر کسی کو دلیل دینے کی ضرورت نہیں کیوں کہ جمہوریت آزادی مساوات دستوری ریاست کو ہم بدیہی حقیقت، ناقابل تردید سچائی، امور لازم take for granted سمجھتے ہیں ایسی آفاقی حقیقتیں جن میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں اس کے لئے دلائل کی ضرورت نہیں ڈربن لکھتا ہے:

What Rawls is saying is that there is in a constitutional liberal democracy a tradition of thought which it is

our job to explore and see whether it can be made coherent and consistent... We are not arguing for such a society. We take forgranted that today only a fool would not want tolive in such a soceiety... If one cannot see the benefits of living in a liberal constitutional democracy, if one does not see the virtue of that .ideal, then I do not know how to convince him. To be perfectly blunt,sometimes I am asked,when I go around speaking for Rawls, What do you say to an Adolf Hitler? the answer is [nothing]. You shoot him. You do not try to reason with him. Reason hasno bearing on this question. So I do not want to discuss it (Derben,Freeman Press USA 2003: 328-329)

اس صدی کا سب سے بڑا فلسفی گلز دیلوز جسے [Philospher of Desires] کہا جاتا ہے۔ جو سرمایہ دارانہ نظام کا سب سے بڑا ناقد ہے اور سب سے بڑا نقیب بھی جس نے ہسپتال کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی مغربی تہذیب کے پیغمبرایسے ہی ہوتے ہیں، ایک خودکشی کرتی ہوئی تہذیب سے مسلمان ڈرر ہے ہیں اور ہمیں اس مرتی ہوئی تہذیب سے مفاہمت پر مجبور کیا جارہا ہے ____ دیلوز اپنی کتابوں میں صاف صاف سرمایہ داری کو ''ایک شیزوفرینک سسٹم'' لکھتا ہے وہ اپنی تحریروں میں جدید مغربی نظام کو فحش گالیاں دیتا ہے. واضح رہے کہ لبرل ازم، سوشل ازم، فاشزم، کمیونزم، فیمن ازم نیشنل ازم، انارکزم، سب کے سب سرمایہ داری کے عقیدے کے نظریات ہیں۔ یہ تمام نظریات سرمایہ داری کو ____ ایمان اور عقیدے کی سطح پر قبول کرتے ہیں صرف اس کے اطلاقات [Applications] کے سلسلے میں ان نظریات کے مابین جزوی فقہی اختلافات ہیں۔ آزادی، مساوات ترقی پر اجماع ہے اس کے حصول کے طریقے مختلف ہیں۔ دیلوز کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ **سرمایه دارانه نظام عقلیت سے ماورا هے اس میں هر شے عقلی هے سوائے سرمایه [Capital] کے اور خود سرمایه دارانه نظام [Capitalism] کے یه دونوں ماورائے عقل** [Meta Rational] هیں. دوسرے معنوں میں اگر آپ سرمایہ داری پر ایمان لے آئیں تو آپ کو اس کی ہر چیز عقلی لگے گی مگر اس ایمان کی کوئی عقلی دلیل میسر نہیں۔

Everything is rational in capitalism, except capital or capitalism itself. The stock market is certainly rational; one can understand it, study it, the capitalists know how to use it, and yet it is completely delirious, it's mad.

Deleuze, G. (2009). Capitalism: A very special delirium. In F. Guattari, & S. Lotringer (Eds.), *Chaosophy: Texts and interviews, 1972-1977 (pp.35-52). Cambridge: MIT Press.*

معاشیات سوشل سائنس کا اہم ترین مضمون ہے لیکن تمام جدید سیکولر یونیورسٹیوں میں جدید علم معاشیات کے اصولوں، عقیدوں، ایمانیات، مابعدالطبیعیات کی کوئی عقلی دلیل نہیں دی جاتی تمام یونیورسٹیوں میں معاشیات کے عقیدوں پر تنقید تحقیق کی آزادی نہیں بلکہ ان پر ایمان لاکر ہی اس علم کی تدریس کی جاتی ہے جو ان عقیدوں پر تنقید کرے وہ امتحان میں ناکام قرار پاتا ہے۔ فرانس کی ایک جامعہ کا پروفیسر ایمریطس گلبرٹ رسٹ جو History of Development جیسی معرکہ آراء کتاب کا مصنف ہے اپنی کتاب The Delusion of Economics میں لکھتا ہے کہ وہ فرانس کی ایک جامعہ میں شعبہ معاشیات کے طلباء اور اساتذہ سے خطاب کے لیے گئے انہوں نے اپنی زیر طبع کتاب The Delusions of Economics: the Misguided Certainities of a Hazardous Science کے چند اہم تنقیدی مباحث اپنی تقریر میں پیش کیے معاشیات کے اصول پر رسٹ کی تنقید سے سب نے اتفاق کیا کوئی اعتراض سامنے نہیں آیا مگر اساتذہ کا جواب یہ تھا ہم آپ کے دلائل سے اتفاق کرتے ہیں مگر ہم معاشیات کے بنیادی اصولوں اس کی مابعدالطبیعیات اس کے اعتقادات وایمانیات پر آپ کی تنقید طلباء کو نہیں پڑھا سکتے ہمارا کام صرف طلباء کو امتحان میں کامیاب کرانا ہے ہمارے طلباء کی امتحانی کاپیاں جانچنے کا کام بیرونی ممتحن حضرات کو دیا گیا تو وہ یقیناً ہمارے طلباء کو نصاب میں شامل معاشیات کے مسلمہ اصولوں سے انحراف پر مبنی جواب لکھنے کے باعث امتحان میں ناکام قرار دیں گے

A little story may not be out of place here. When I was invited to speak about the assumptions of economics to a hundred pupils preparing for their beccalaureate exam at a French lycee, I decided to present some of the theses in this book and was rewarded with an attentive audience and a number of interesting questions. Still I was rather afraid of how the teachers accompanying the pupils would react. What did they think of my critical arguments? their reply was disconcerting 'Of course we largely agree with your point of view, 'they said but, we can't teach it. Our job is to get our pupils through the bac. And

as their papers will be corrected by external examiners they would certainly fail if they deviated from the mainstream views in the syllabus. This is how a lack of critical spirit and ultimately ignorance are transmitted. [Gilbert Rrist., The Delusions of Economics, pg. 7]

سوال یہ ہے کہ جب مغرب والے اپنے باطل سائنسی علم معاشیات کے لیے کڑا تنقیدی رویہ [Critical spirit] اختیار نہیں کرتے اور اپنی جاہلانہ علمیت پر اصرار کرتے ہیں تو عالم اسلام کو اپنے منصوص احکامات میں تقلید کے بجائے اجتہاد کی ضرورت کیوں محسوس ہو رہی ہے؟ کیا کفار کا ایمان اپنے کفر پر۔ ہم مسلمانوں سے بہتر ہے جو الحق کے علم بردار ہیں۔

معاشیات سائنسی علم ہے ارتقاء پذیر ہے اس میں اغلاط کا ہر لحہ صرف امکان نہیں کامل یقین ہے اس پر تنقید ہو رہی ہے لیکن اس کے باوجود یونیورسٹی کے طلباء کو تنقیدی نقطۂ نظر اختیار کرنے کی اجازت نہیں مگر عالم اسلام کے تمام جدیدیت پسند مجتہدین منصوص احکامات پر تنقید کی اجتہاد کی آزادی دینے کی تحریک چلا رہے ہیں۔

Steve Keen اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ معاشیات کے اعلیٰ ترین عالمی تحقیقی علمی جریدوں میں کوئی ایسا مقالہ شائع نہیں ہوسکتا۔ جب تک وہ جدید معاشیات کے مفروضہ مسلمہ متفقہ اصولوں کے مطابق تحریر نہ کیا گیا ہو۔

It is almost impossible to have an article accepted into one of the mainstream academic economics journals unless it has the full panoply of economic assumptions: rational behaviour (according to the economic definition of rational!) markets that are always in equilibrium, risk as an acceptable proxy for uncertainty and so on. When it comes to safeguarding the channels of academic advancement little else matters apart from preserving the set of assumptions that defines economic orthodoxy. (Steve Keen Debunking Economics: The Naked Emperor of the Social Sciences London Zed Books 2007 (2004) p. 154),

دوسرے معنوں میں مغرب جو علوم کی توسیع ارتقاء کے لیے ہر علم پر اور خصوصاً مذہبی علوم، اور اصول پر تنقید کا مدعی ہے اپنے علوم کو ہر قسم کی تنقید سے ماوراء سمجھتا ہے اور کسی علمی تنقید کو جو اس کے اصولوں کے منافی ہو تسلیم کرنے پر تیار نہیں مگر اسلام کے اصولوں میں وہ مسلسل اجتہاد کی دعوت دے رہا ہے اور مغرب سے متاثر ہمارے متجددین مغرب کی اس دعوت اجتہاد کو قبول کر رہے ہیں کسی میں یہ جرات نہیں ہے کہ وہ مغرب سے کہے کہ تم جب اپنے عقلی متغیر سائنسی علوم کے مفروضات پر ایمان رکھتے ہو ان میں اجتہاد نہیں کرتے کسی کو ان کا تنقیدی جائزہ لینے کی اجازت نہیں دیتے، کسی علمی جریدے میں معاشیات کے اصولوں کے خلاف تنقیدی مضامین لکھنے کی بھی اجازت نہیں دیتے تو اسلام اپنے نقلی علوم کے اصولوں میں کیوں اجتہاد کرے؟

اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مغرب کے اپنے غیر عقلی علوم اور عقیدوں پر کتنا اعتقاد، ایمان اور یقین ہے اور مسلمان اپنے علوم پر یقین کرنے کے بجائے اسے عقلی میزان پر تولنے کے لئے بے تاب ہیں۔

غامدی صاحب کی محدود عقلیت کو اندازہ ہو گیا ہوگا کہ ایمان کی قوت کیا ہوتی ہے مغربی باطل، کفر اپنے ایمان کا اعلان کر رہا ہے اس پر دلیل دینے مباحثہ، مکالمہ کرنے اعتراض سننے کے لئے تیار نہیں ہے گولی مارنے قتل کرنے پر آمادہ ہے اور شہید ممتاز قادریؒ نے باطل کو گولی ماردی تو اس پر غامدی صاحب شرمندہ ہو رہے ہیں اور غامدی صاحب ایسے جابر، مکار دشمن ___ مغرب ___ سے مکالمے کی باتیں کر رہے ہیں۔

مغرب کے پاس عقلیت کے عقیدے [Faith of Reason] اور سرمایہ داری کے عقیدوں پر ایمان کی کوئی عقلی دلیل نہیں ہے۔ پوسٹ ماڈرن ازم نے تو عقلیت پر جدیدیت کے ایمان کی دھجیاں اڑادی ہیں۔

اسلام ہمیں نقل سے ملا ہے۔ وحی الٰہی کسی انسان کی تخلیق نہیں یہ عقل کُلی خالق حقیقی کا نازل کردہ علم ہے جو رسالت مآبؐ کے ذریعے اس امت کو نسل در نسل اجماع سے منتقل ہوا ہے۔ لہٰذا ماخذات دین پر کوئی سوال نہیں اُٹھایا جاسکتا اس پر اسی طرح ایمان لانا ہوگا جس طرح کانٹ، ڈیلوز، ڈربن اور مغرب عقلیت اور سرمایہ داری پر ایمان لائے۔ عقل کلی کے عطا کردہ علم پر ایمان لانا ہی عقل سلیم کا تقاضا ہے مخلوق خالق سے دلیل عقلی کا مطالبہ نہیں کرسکتی۔

اسلام اور مغرب میں ایک بنیادی فرق ہے مغرب نے آزادی کے عقیدے کو اختیار کرنے کے بعد اس کو لامحدود کرنے کے طریقے [Maximization of Freedom] تلاش کیے۔ عالم اسلام میں آزادی کے عقیدے کو تحدیدات کے ساتھ [Limits of Freedom] قبول کیا گیا ___ مغرب تحدیدات کا

قائل نہیں عالم اسلام تحدیدات کے دائرے میں رہنا چاہتا ہے ۔مغرب کا اعتراض یہ ہے کہ جب تم نے آزادی کو عقیدے کے طور پر تسلیم کرلیا تو اب تحدیدات [Limination] کا سوال بے معنی ہے۔ جدید تہذیب مادی ہے اس کے دائرۂ علم میں صرف اسی عمل کی توجیہہ ممکن ہے جو مادیت سے متعلق ہے وہ معاملات جو مادیت سے ماوراء ہیں ان کو سمجھنا اور ان کی توجیہہ اس تہذیب اور اس کی علمیت کے لیے ممکن نہیں ۔لہٰذا جدیدیت سلمان تاثیر کے عمل کی توجیہہ بیان کرسکتی ہے جو عقلی ہے۔ مگر ممتاز قادری کے عمل کی توجیہہ بیان کرنا اس کے لیے ممکن نہیں کیوں کہ وہ عمل اس کے علم کے مطابق غیر مادی ہے روحانی ہے اور غیر عقلی ہے۔سلمان تاثیر آسیہ بی بی کو مذہب کے جبر سے آزاد کرار ہا تھا ۔ممتاز قادری سلمان تاثیر پر مذہبی جبر نافذ کررہے تھے____ مغرب کے دائرہ علم میں آزادی کا جبر عین الحق، الخیر اور عقلی [Compulsion of Freedom is Rational] ہے۔لیکن مذہب کا جبر غیر عقلی [Compulsion of Freedom is irrational] ہے۔

جبر ہر تہذیب،عقیدے اور ایمان کے دائرے میں لازم ہے جس عقیدے نظریے، ایمان کے ساتھ جبر نہ ہو وہ الحق نہیں کھیل تماشہ ہے لفظی گورکھ دھندہ ہے [Language Game] ہے جس کے لیے کسی قانون، تحدید، سختی کی ضرورت نہیں ۔مغرب صرف آزادی کے ایمان اور عقیدے کے لیے جبر کو ناگزیر سمجھتا ہے کسی دوسرے عقیدے کے لیے جبر ناجائز اور حرام ہے کیونکہ آزادی Freedom ہی الحق، الخیر ہے اس کے سوا سب باطل ہے لہٰذا باطل کو قوت سے نافذ کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی الحق کے لئے ہر قسم کی قوت استعمال کی جاسکتی ہے۔

اسلام میں کائنات کا مرکز اللہ [God Centric Universe] ہے یہ کائنات اور یہاں موجود مخلوق خالق کائنات کے علم ،رضا، اور خوشنودی کی طالب ہے۔جدیدیت میں یہ کائنات خدا مرکز نہیں انسان مرکز [Anthro Pocentric Universe] ہے۔یہ دو متضاد نقطۂ ہائے نظر ہیں اگر کائنات خدا مرکز ہے تو اس کائنات میں انسان کا ہر عمل خدا کی مرضی کے تابع ہوگا۔مغرب نے انسان کو مرکز کائنات بنادیا۔یعنی اب اس کائنات میں انسان ہر مسئلے کا حل ہر الجھن کا فیصلہ اس بنیاد پر کرے گا کہ انسان کیا چاہتا ہے دوسرے معنیٰ میں خدا کی جگہ انسان نے لے لی اور افادیت پرستی، لذت پرستی اور نتائجیت پرستی کے نظریات آگئے____ نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کے بارے میں نطشے نے کہا تھا خدا مر گیا ہے (نعوذ باللہ) فوکالٹ نے اس نقطۂ نظر کو توسیع دے کر کہا کہ انسان بھی مر چکا ہے۔لہٰذا ایمان سے محروم اس مردہ کائنات میں ہم مادی زندگی کو اہم سمجھ رہے ہیں روحانی زندگی غیر اہم ہوگئی ہے۔

سب سے اہم کام اس زمین پر زندگی کی حفاظت نہیں بلکہ ایمان کی حفاظت ہے۔وہ زندگی جو ایمان کی نعمت سے محروم ہے زندگی نہیں زندگی کا کفن ہے۔ممتاز قادریؒ نے زمین پر ایمان کی حفاظت کے لیے دوسرے کی جان لی اور اپنے ایمان کی شہادت دینے کے لیے اپنی جان کا نذرانہ بھی پیش کیا۔ایمانی زندگی اسی جدوجہد کا نام ہے۔قرآن نے یہ بات واضح کردی ہے کہ اہل ایمان پہلے مارتے ہیں اور پھر مرتے ہیں وَقَاتلُو وَقُتِلُو اور پھر حیات جاوداں پاکر اللہ کے حضور حاضر ہوجاتے ہیں۔

اصلاً مغرب اور اسلام کے مابین جنگ علم، عقیدے اور ایمان کی جنگ ہے دونوں کی مابعد الطبیعیاتی اساسات یکسر مختلف ہیں دونوں کے ماخذات علم مختلف ہیں دونوں میں مکالمہ ممکن نہیں اس صدی کا بہت بڑا فلسفی رچرڈ رارٹی صاف صاف لکھتا ہے کہ اسلام سے، بلکہ اسلامی جدیدیت پسندوں سے بھی____ یعنی سرسید، یوسف قرضاوی، جاوید غامدی، طارق رمضان سسٹر آف اسلام ملائیشیا، طاہر جابر العلوانی، یاسر قاضی، حمزہ یوسف، وحیدالدین خان، عمار خان ناصر، عیسیٰ منصوری جیسے نام نہاد روشن خیال اسلامی مفکرین سے بھی مکالمہ ممکن ہی نہیں وہ کہتا ہے:

There was no dialogue between the philosophers and the Vatican in the eighteenth century, and there is not going to be one between the mullahs of the Islamic world and the democratic West. The Vatican in the eighteenth century had its own best interests in mind, and the mullahs have theirs. They no more want to be displaced from their positions of power than the Catholic hierarchy did (or does). With luck, the educated middle class of the Islamic countries will bring about an Islamic Enlightenment, but this enlightenment will not have anything much to do with a "dialogue with Islam."[A dialogue between American State philosopher Richard Rorty and Gianni Vatimo from page 72 to 75 Columbia University Press, New York

ممتاز قادری شہید کے حوالے سے اسلامی اور سیکولر اور پاکستانی قوانین کی بحث کے دوران چند اہم امور پر تحقیقی نظر کرنے کی ضرورت ہے۔اسلامی علمیت تہذیب اور ریاست میں قوانین اور فیصلوں کا مرکز جدید ریاست کی طرح اوپر سے نیچے کی طرف نہیں آتا بلکہ نیچے سے اوپر کی طرف [vertical] جاتا ہے۔عدالتیں مختلف علماء کی

آراء سے مستفید ہوتی ہیں قاضی ان علماء کی آراء کی روشنی میں کسی نتیجے پہنچتا ہے فتویٰ نویسی کی تاریخ ایک غیر معمولی عبقری تاریخ ہے اس کے روحانی ایمانی اور علمی تحقیقی و تاریخی پہلو کے مطالعے کے لیے قدیم کتابوں میں ادب المفتی والمستفتی اور خلافت عثمانیہ کے شیخ الاسلام کی لکھی ہوئی شرح شرح الایضاح میں درج نادر اصول افتاء اور جدید کتابوں میں اصول الافتا و آدابہ کا مطالعہ مفید رہے گا اور فتویٰ کے واقعاتی، تجزیاتی، معلوماتی اور تحلیلی پہلو کے مطالعے کے لیے ڈاکٹر خالد مسعود کی مرتبہ کتاب (Islamic Legal Interpretation Muftis and Their fatwas (Harvard Studies in Islamic Law نہایت اہمیت کی حامل ہے۔ ڈاکٹر خالد مسعود صاحب نے افتاء کی تاریخی تحقیق سے جو نتائج اخذ کیے ہیں وہ درست نہیں مثلاً ان کا یہ دعویٰ کہ علماء کو ریاست سے الگ رہنا چاہیے درست نہیں کیونکہ قاضی خود عالم ہوتا ہے اور بادشاہ بھی عموماً عالم ہی ہوتا ہے اسلامی ریاست چلانے والے علماء ہوتے ہیں جاہل نہیں ہوتے مامون کی علم فقہ میں غیر معمولی دسترس جس پر بڑے بڑے فقہاء حیران رہ گئے اس رسوخ کی شہادت شبلی کی ''المامون'' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اسلامی تاریخ کے بے شمار بادشاہ عالم دین تھے اسلامی علمیت میں اسی لیے صرف امامت صغریٰ کا مستحق ہی امامت کبریٰ کا مستحق ہے جو مصلے پر کھڑے ہوکر امامت کے قابل نہیں وہ تخت حکومت پر فائز ہونے کے بھی قابل نہیں۔

اسلام کا قانون مغربی سیکولرازم کے عقلی، فطری قانون کی طرح جابر نہیں کیونکہ اسلامی قوانین مغربی قوانین کی طرح Codify اور Rigidify نہیں ہیں ان میں لچک ہے جس کا فیصلہ وقت کا پیغمبر اسلامی ریاست کا قاضی اور حکمران خود کسی واقعے کے تناظر میں کرسکتا ہے۔

حضرت حاطب ابی بلتعہؓ نے فتح مکہ سے پہلے ایک خط کے ذریعے مکہ میں کچھ لوگوں کو بعض مصلحتوں کے تحت اطلاع دینی چاہی وحی کے ذریعے رسالت مآبؐ تک اطلاع پہنچی عورت کو حضرت علیؓ نے راستے میں پکڑ لیا اس کے بالوں سے خط برآمد ہوا حضرت حاطب ابی بلتعہؓ کو کوئی سزا نہیں دی گئی رسالت مآبؐ نے فرمایہ یہ بدری صحابی ہیں انہیں معاف کردیا گیا یہ اسلامی قانون کی قوت، ندرت اور وسعت ہے جو مساوات کے عقیدہ کو نہیں مانتا اسلامی ریاست مغرب کی طرح ۴۶ فی صد ٹیکس نہیں لے سکتی احادیث میں ٹیکس لینے والے کو جہنم کی وعید سنائی گئی ہے اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کی تقسیم کے ذریعے ریاست کو لوگوں کے مال سے بالکل لاتعلق کردیا گیا ہے جدیدیت کے تمام قوانین لوگوں پر ٹیکس لگانے کے سوا کچھ نہیں کرتے یہ جبر کی بدترین مثال ہے اسی لئے کوئی ایک شخص بھی پاکستانی ریاست کو ٹیکس دینا پسند نہیں کرتا لیکن متجددین کہہ رہے ہیں کہ اس ریاست کو زکوٰۃ بھی دے دو اسلامی قانون مال میں بھی جبر کا قائل نہیں۔

سنن نسائی اور سنن ابوداؤد وغیرہ میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی حدیث کے مطابق ایک نابینا صحابہؓ کی ایک لونڈی تھی اکثر رسول اللہ ﷺ کو برا کہتی۔ نابینا صحابی اسے بار بار ڈانٹتے لیکن وہ باز نہ آئی۔ ایک رات اس نے پھر رسول ﷺ کا تذکرہ کیا اور آپؐ کو برا کہنے لگی۔ نابینا صحابیؓ سے ضبط نہ ہوسکا انہوں نے تکلا اٹھایا اور اس کے پیٹ پر رکھ کر دبا دیا یہاں تک کہ وہ مرگئی —— امام ابن تیمیہؒ اس روایت پر لکھتے ہیں کہ وہ عورت نابینا صحابی کی منکوحہ تھی یا مملوکہ لونڈی، ان دونوں صورتوں میں اگر اس عورت کا قتل ناجائز ہوتا تو رسول اللہ ﷺ فرمادیتے کہ اس کا قتل حرام اور وہ معصوم الدم تھی، پھر آپؐ معصوم الدم کو قتل کرنے پر کفارہ لازم کرتے۔ لیکن آپؐ نے ایسا نہیں کیا بلکہ آپؐ نے فرمایا (الا شھدو ان دمھا ھدر) تم سب گواہ رہنا اس لونڈی کے خون کا بدلہ نہیں لیا جائے گا۔ اس معاملے میں جدید قانون کے تقاضے پورے نہیں کئے گئے استغاثہ پیش نہیں ہوا ملزم کو صفائی کا موقع نہیں دیا گیا اسلامی قانون مغرب کے قانون کی طرح بے لچک نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ نے اسی سنت رسول کے مطابق عمل کیا آپؐ کے زمانے میں ایک شاتم رسولؐ کو ایک صحابی نے قتل کردیا ریاست عدالت خلافت اسلامی موجود تھی حضرت عمر نے تحقیق کی شاتم رسولؐ کا شتم ثابت ہوگیا تو آپ نے صحابی پر حد جاری نہیں کی نہ قصاص اور دیت کا مطالبہ کیا ___ شان رسالت مآبؐ اس قدر اہم ہے کہ عدالت اور ریاست کے بغیر ایک اقدام کی معقول وجوہات پیش کردی گئیں تو اسے تسلیم کرلیا گیا لیکن حضرت عمرؓ کے صاحب زادے نے آپ کے قاتل لولو کو قتل کردیا تو حضرت عثمانؓ نے قاتل کے ولی کو قصاص لینے کا حکم دیا اسلامی قانون صرف ان دونوں طریقوں سے نہیں بلکہ مختلف حالات میں کئی طرح سے عمل کرتا ہے۔ اس میں لچک ہے گنجائش ہے یہ اسلام کی وسعت اور جامعیت ہے۔ اسلام مغربی سیکولر قانون کی طرح جابرانہ نہیں ہے۔

حضورؐ کے پاس قبیلہ غامدیہ کی ایک عورت آئی اور اس نے زنا کا اعتراف کیا مگر آپ نے اسے تین مرتبہ واپس کردیا نہ اسے گرفتار کیا نہ اسے دوبارہ آنے پر مجبور کیا۔ نہ اس کی نگرانی کا نظام قائم کیا نہ اسے دارالامان کی حفاظتی تحویل میں دیا نہ اس کے قبیلے کو حکم دیا کہ تم اسے حفاظتی تحویل میں رکھو پھر ہمارے سامنے اس مجرم کو پیش کرو ۔رسالت مآبؐ نے کوئی جیل قائم نہیں کی نہ ملزمہ کو جیل بھیجا نہ اس سے شخصی ضمانت یا ذاتی مچلکہ یا کسی فرد کی ضمانت لی کہ یہ فرار نہ ہوجائے۔ آپؐ نے کوئی دارالامان قائم نہیں

کیا جہاں یہ عورت مقیم رہے آپؐ نے اسے رعایت دی کہ وہ اعتراف جرم کے باوجود اپنے گھر لوٹ جائے۔ کیا آج کی عدالت رسالت مآبؐ کی طرح یہ رعایت دے سکتی ہے یا اس طرزِ عمل کا تصور بھی کر سکتی ہے یہ اسلامی ریاست اور سیکولر ریاست کے قوانین کا بنیادی فرق ہے۔

کیونکہ اسلامی ریاست وہ شخصیت، انفرادیت، ماحول تعلیم، تبلیغ، تدریس، تلقین، معاشرت، روحانیت، تزکیہ نفس کا نظام بھی پیدا کرتی ہے جس کی موجودگی میں قوانین کے نفاذ کے لئے جیل خانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اس واقعے سے اسلامی قانون کی لچک کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ روایتی تہذیبوں میں سیدھے سادے قوانین کے باعث جیل خانے نہیں ہوتے تھے اور نہ اتنے بڑے پیمانے پر لوگ مجرم ملزم ہوتے تھے۔ روایتی تہذیبوں میں اور اسلامی تاریخ میں نہ ہوٹل ملیں گے نہ ریسٹورنٹ، نہ ہسپتال، نہ یتیم خانے، نہ پاگل خانے، نہ ڈے کیئر سینٹر، نہ اولڈ ہوم، نہ جیل خانے۔ یہ سب مغرب کی گمراہ کن جدید تہذیب اور آزادی کے عقیدے کے نتائج ہیں۔ اسلام مغرب کی طرح جابر نہیں ہے جہاں آزادی کے نام پر سب سے زیادہ جبر ہے۔ تاریخ انسانی کے سب سے زیادہ مجرم، نفسیاتی مریض، پاگل، قاتل، وحشی مغرب نے پیدا کئے ہیں امریکہ کی جیلوں میں اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ چھبیس لاکھ لوگ قید ہیں —— پوری تاریخ انسانی میں اتنے پاگل نہیں ملیں گے جتنے پاگل آج مغرب کے پاگل خانوں میں موجود ہیں آزادی مساوات ترقی کے عقیدوں نے پاگلوں کی نسلیں پیدا کر دی ہیں اور مغرب مذہبی لوگوں کو پاگل کہہ رہا ہے۔

وائل بی حلاق نے اپنی دو کتابوں میں اسلامی قوانین کی لچک، وسعت، فراخی پر تاریخ اسلام سے نادر معلومات جمع کی ہیں 1- Shariah Theory & Practice (2) An Introduction to Islamic Law

ہماری عدالت کے ججوں اور علماء کو ان کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جاہل لبرل حلقوں کو یہ تک معلوم نہیں کہ سخت ترین اسلامی قوانین بھی نہایت نرم ہیں اور لچک رکھتے ہیں ان قوانین کے اطلاق اور نفاذ میں ریاست کی طاقت کا استعمال بہت کم ہوتا ہے۔ انگریز جب ہندوستان میں آئے تو انھوں نے شروع شروع میں مغلیہ سلطنت کے تحت چلنے والے اسلامی قوانین میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کی لیکن انہیں جلد ہی اندازہ ہو گیا کہ ان قوانین کے ذریعے ریاست کی آہنی گرفت عوام پر قائم نہیں ہو سکتی۔ کیوں کہ یہ اسلامی قوانین بہت نرم ہیں اور ان کے اطلاق میں ریاست وحکومت کا عمل دخل بہت کم اور معاشرے معاشرت، رواج، Customry Law کا عمل دخل بہت زیادہ ہے اگر شرع نافذ رہے گی تو سختی نہیں ہو گی قتل کے معاملے میں معافی کا حق ریاست کے پاس نہیں مقتول کے ولی کے پاس ہے جدید سیکولر ریاست میں یہ حق صدر کو دیا گیا ہے یعنی اختیار کا مرکز فرد سے چھین کر صرف فرد واحد کے ذریعے ریاست کے سپرد کر دیا گیا۔

شرعی قوانین کے تحت ایک ہی طرح کے مقدمات میں کئی طرح کے فیصلے ہو سکتے تھے کیوں کہ قوانین میں لچک تھی لہٰذا فیصلوں میں یکسانیت کے بجائے تنوع تھا اور انصاف کا حصول بہت سہل تھا مغرب نے علم، قانون اداروں سب کو عالمگیر [Universlize] کرنے کی کوشش کی جو یکسانیت Uniformity کی طرف لے جاتی ہے تنوع Diversity کا خاتمہ کرتی ہے اور یک رنگی Homogenity پیدا کرتی ہے اسلام کے عالمگیر قوانین تنوع رکھتے ہیں ان حقائق کی روشنی میں انگریزوں نے ان اسلامی قوانین کو منسوخ کر کے برطانیہ کے سخت ترین قوانین نافذ کرنے کا فیصلہ کیا تا کہ انگریزی اقتدار کی گرفت ہندوستانی عوام پر سخت سے سخت ترین ہو سکے یہ بات Bernard S. Cohn نے اپنی معرکہ آراء کتاب Colonialism & Its Forms of Knowledge میں نہایت شرح وبسط اور حوالوں سے ثابت کی ہے۔ انیسویں صدی کے آغاز میں استعماریت کا مقدمہ یہ تھا کہ شرعی قوانین کے ذریعے معاشرے پر ریاستی جبر قائم نہیں ہو سکتا نہ قائم رہ سکتا ہے شہری قانون کی گرفت سے باہر اور ریاست کے شکنجے سے محفوظ رہتے ہیں لہٰذا شرعی قوانین کی جگہ جدید سیکولر اینگلو سیکشن لاء نے لے لی تا کہ ریاستی جبر معاشرے کی نچلی سطح تک مسلط کر کے لوگوں کو آزادی کے نام پر غلام بنا لیا جائے لیکن صرف تیس سال کے عرصے میں مغرب نے اس حقیقت کو یکسر بدل دیا کہ اسلامی قوانین جبر قائم نہیں کرتے۔

وائل حلاق لکھتا ہے کہ اب مغرب کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ شریعت اور شرعی قوانین کے نفاذ کا مخالف صرف اس لیے ہے کہ ان شرعی قوانین کا اثر معاشرے پر نہایت جابرانہ ہے تمام شرعی قوانین جبریت پیدا کر کے فرد کی آزادی چھین لیتے ہیں لہٰذا معاشرے کو جبر وتسلط سے بچانے کے لیے شریعت کے قانون سے حتی المقدور بچنا ضروری ہے کل تک اسلام کے قوانین بہت نرم تھے اور استعمار ان قوانین کے ذریعے اپنا جبر قائم کرنے میں ناکام رہا اور جب اس کا جبر انگریزی قانون سے قائم ہو گیا تو اس نے شریعت کو بھی جبر کا نظام ثابت کرنے کی کوشش کی۔ جدید ذہن اسی طرح ارتقاء کے نام پر نتائج فکر بدلتا رہتا ہے۔

جدید سیکولر عدالت صرف آئین کی پابند ہے آئین کے مطابق مقننہ پارلیمنٹ قوانین [Laws] بنانے کی پابند ہے جب تک کسی کام سے روکنے کی ممانعت

قانون نہیں کرے گا وہ کام جائز تصور کیا جائے گا لہٰذا قانون کا اطلاق موثر بہ ماضی [Retrospective effect] نہیں ہوسکتا۔ اسلامی تہذیب میں قوانین بہت کم ہوتے ہیں صرف اخلاقی قانون ہوتا ہے جو دینی حمیت وغیرت و معاشرت کی قوت پر چلتا ہے۔ اس لیے کسی با قاعدہ ضابطے قاعدے حکم کی ضرورت نہیں ہوتی مثلاً ماں باپ کی خدمت کرنے ان کو گھر میں رکھنے کا کوئی با قاعدہ قانون شریعت میں موجود نہیں ہے مگر سب اس اخلاقی قانون کی اس طرح پیروی کرتے ہیں جیسے اس پر عمل نہ کرنے کی صورت میں سخت ترین سزا ملے گی حالانکہ ماں باپ کی خدمت اسلامی تہذیب میں اور تمام روایتی تہذیبوں میں آخرت میں کامیابی کے عقیدے کے تحت کی جاتی ہے ریاستی سزاؤں کے خوف اور تعزیر کے ڈر سے نہیں کی جاتی۔ جدید دستوری و آئینی ریاست میں اگر کوئی شخص ماں باپ کی خدمت کرنے سے انکار کردے انھیں گھر سے نکال دے اور ماں باپ جدید سیکولر عدالت سے رجوع کریں تو وہ کہے گی چونکہ قانون میں آپ کی اولاد کا عمل غیر قانونی نہیں قانون ان پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتا ماں باپ کی خدمت کرنا پاکستانی قانون کے تحت لازمی نہیں ہے لہٰذا ہم کچھ نہیں کرسکتے اسی لیے بھارت اور چین میں حکومت کو Parents Protection Act بنانے پڑے اب اگر کوئی گھر سے ماں باپ کو نکالے تو یہ جرم ہے اور جن کو اس قانون بننے سے پہلے اولاد نے نکال دیا ان کا کچھ نہیں ہوسکتا۔ پاکستانی عدالت کے جج بھی یہی بات کہہ رہے ہیں اور جدید سیکولر آئینی اصولوں کی روشنی میں ان کی دلیل درست ہے مگر اسلامی شریعت کی روشنی میں یہ استدلال باطل ہے اگر اسلامی عدالت کے قاضی کے پاس ماں باپ کو گھر سے نکالنے کا مقدمہ جائے تو وہ سخت سے سخت سزا دے سکتا ہے واضح رہے کہ اسلامی تاریخ میں ایسا کوئی مقدمہ عدالت میں کبھی نہیں گیا اسلامی علمیت قانون کے الفاظ پر نہیں قانون کی روح اور اسلامی علمیت کی کلیت اور اس کے جوہر [Totality/ Essence] کے تحت فیصلہ کرتی ہے لہٰذا کسی مختصر سی آیت سے علم کے ہزاروں نئے دائرے نکل آتے ہیں۔ جدید تعلیم کے نتیجے میں ماں باپ اولاد کو ڈے کیئر سینٹر میں رکھتے ہیں لہٰذا اولاد ان کو اولڈ ہوم میں بھیجتی ہے سرسید نے ہندوستان میں جدید تعلیم کا آغاز کیا انتقال سے تین مہینے پہلے سرسید کے بیٹے جسٹس سید محمود نے سرسید کو ان کے گھر سے نکال دیا سرسید کے سامنے ان کی سیکولر تعلیم کا نتیجہ زندگی میں آ گیا۔

اسلامی عدالت کا قاضی سیکولر عدالت کے جج یا غامدی صاحب کی طرح یہ نہیں کہے گا کہ قرآن وسنت میں ماں باپ کو گھر سے نکالنے کے جرم کی دنیا میں سزا متعین نہیں کی گئی البتہ آخرت میں شاید سزا مل سکتی ہے ملکی قانون میں بھی ماں باپ کی خدمت نہ کوئی جرم نہیں ہے نہ اس جرم کی کوئی سزا مقرر کی گئی ہے۔ لہٰذا عدالت کسی کو ماں باپ کی خدمت نہ کرنے پر کوئی سزا نہیں دے سکتی سزاؤں کے بارے میں غامدی صاحب کی یہ اصولی تحقیق میزان کے قانون سیاست میں پڑھ لیجیے اور اس کی تفصیل مقامات میں ملاحظہ کیجیے جہاں وہ لکھتے ہیں کہ اسلامی ریاست صرف اور صرف نماز اور زکوٰۃ کے لئے جبر کرسکتی ہے سزا دے سکتی ہے اس کے سوا ریاست صرف تبلیغ، تعلیم، تلقین کرے۔

امت کا اجماع ہے کہ باپ اگر اولاد کو قتل کردے تو اس سے قصاص نہیں لیا جاسکتا رسول اللہ ﷺ اس دنیا میں دین کا واحد ماخذ ہیں۔ اگر شہید ممتاز قادری نے اس امت کے روحانی باپ رسالت مآب ﷺ کی شان کو بچانے کے لئے علماء کے فتویٰ کی موجودگی میں اور اس امت کی روایت کے مطابق سلمان تاثیر کو قتل کردیا تو انہیں قصاص میں قتل نہیں کیا جاسکتا تمام مکاتب فکر کے علماء کی ذمہ داری تھی کہ وہ عدالت سے کہتے کہ اگر ممتاز قادری کو قتل کرنا ضروری ہے تو ہم سب کو پھانسی منظور ہے صرف ممتاز قادری کو پھانسی نہ دو وہ اس مقدمے میں فریق بنتے جس مقدمے میں پانچ سو لوگ فریق ہوں وہ قتل کا نہیں بلوے کا مقدمہ بن جاتا ہے اور بلوے کے مقدمے میں کسی کو پھانسی نہیں ہوسکتی ہمارے وکلاء قانونی طریقہ بھی نہیں جانتے۔ اگر ہمارے علماء اپنی علمیت کو الحق اور الخیر سمجھتے ہیں اگر ان کا ایمان سلامت ہے تو انہیں اسی طرز عمل کا مظاہرہ کرنا چاہیے وہ ایمان جو اپنے وجود کی شہادت اپنے خون سے تحریر نہ کرے بلکہ ہمیشہ مصلحتوں، مصالحتوں، مذاکرات اور حکمرانوں کے خفیہ دعدوں کے دائرے میں محصور ہے وہ ایمان نہیں نفاق ہے اور نہایت بڑا نفاق دین کی حفاظت، نصرت، کا فریضہ اب علماء کے بجائے عوام نے سنبھال لیا ہے جس کے نتیجے میں معاشرتی قوت کی حرکیات (Dynmics of social Power) میں بنیادی تغیر پیدا ہورہا ہے اور معاشرتی رویوں میں بھی تہلکہ خیز تبدیلی آرہی ہے۔ حرکیات بدلنے کے نتیجے میں قوت کی سمت داخل [Internal] کے بجائے خارج [External] کی طرف ہوگئی ہے ____ دین کی علمیت کی حفاظت جب علماء اپنے لہو سے کرتے ہیں تو عوام کو میدان میں اترنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ نے اپنے لہو سے دینی علمیت کا چراغ روشن رکھا۔ لہٰذا کسی مقتدی کو علماء کا فریضہ ادا کرنے کے لیے جلسہ اور جلوس کرنے کی ضرورت نہیں پڑی لیکن جب علماء خود خوف کی چادر اوڑھ لیں جان دینے سے گریز کریں اور حق کی شہادت دیتے ہوئے ان کے ہونٹ لرز رہے ہوں اور دل کانپ رہے ہوں تو عامی دوسروں کی جان لے کر دین کو زندہ کرتا ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے اپنی پیٹھ کوڑوں کے لیے اور اپنی گردن قتل کے لیے پیش کی اور اپنے شاگردوں کو ریاستی استبداد سے محفوظ رکھ کر دین کے علمی ورثے کی حفاظت کے لیے اپنی علمی سپاہ کو محفوظ رکھا۔ انھوں نے ریاست کے خلاف خروج، بغاوت کی اجازت نہیں دی۔ نہ احتجاجی، ملامتی، علامتی، سیاست کو اختیار کیا۔ امام احمد حنبلؒ نے اپنی پیٹھ

کوڑوں کے لیے پیش کی مگر ریاست کے خلاف بغاوت،خروج کی اجازت نہیں دی۔کسی امام نے اپنے حامیوں کو جلسے،جلوس بیان بازی اور حکومت وقت کو دھمکیاں دینے کے لیے نہیں بلایا۔علماء کے اس کردار اور قربانیوں نے دین کو ہمیشہ زندہ رکھا اس حکمت عملی نے علماء کے علمی وارثوں اور امت کو حکمرانوں کے استبداد سے بھی محفوظ رکھا اس کے نتیجے میں انہی ظالم حکمرانوں کی اولاد نے انہی علماء کے شاگردوں کے ذریعے دین کی نصرت کا عظیم کام انجام دیا۔

اسلامی تاریخ میں قوت کے مظاہرے کا طریقہ جلسہ،جلوس،ہڑتال،فیس بک،پمفلٹ،پوسٹر،تصویری اشتہارات،نعرے بازی،خطابت،دھرنے،فساد،جھگڑے، گھیراؤ جلاؤ،اشتہار بازی،اخباری بیانات،دھمکیاں نہیں ہیں معتزلہ کا مقابلہ امت نے کس طرح کیا؟ فاطمیئن مصر کی حکومت دوسوسال تک رہی۔اہل سنت مکتب فکر کے تمام مدارس بند کر دیے گئے مگر اس صورت حال کا مقابلہ جلسہ جلوس سے نہیں کیا گیا۔علماء اگر فیصلہ کرلیں کہ وہ مصلحت ومصالحت ختم کر کے کلمۂ حق بلند کریں گے اور کسی کو قتل کرنے کے بجائے اپنے آپ کو ریاست کے سامنے قتل کے لیے پیش کریں گے تو پاکستانی ریاست کی تمام اسلام دشمن سرگرمیاں چند لمحوں میں ختم ہو جائیں گی۔اور زمین وآسمان میں زلزلہ برپا ہو جائے گا۔خیرالقرون سے لے کر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی تک،۱۹۵۳ء کی قادیانی تحریک سے لے کر ۱۹۷۷ء کی تحریک نظام مصطفےٰ تک علماء نے آگے بڑھ کر جان کا نذرانہ پیش کر کے عوام کو جان لینے کے عمل سے دور رکھا تھا____ اب علماء نے یہ روایت ترک کر دی ہے لہٰذا عوام نے علماء کی جگہ سنبھال لی ہے عوام کے پاس علمیت نہیں ہوتی ایمان اور جذبہ ہوتا ہے اب صرف جذبہ اور ولولہ اس امت کے ایمان کی حفاظت کر رہا ہے۔

اس امت کی تاریخ یہ ہے کہ جب اس کے علماء،فقہا،بڑے لوگ کفر کی آندھیوں میں ایمان کے چراغ جلا کر خود کھڑے ہوتے ہیں اور خود قتل ہوتے ہیں تو امت کے ایمان کی حفاظت ہوتی ہے جب علماء یہ ذمہ داری پوری نہیں کرتے ان میں امام ابوحنیفہؒ،امام مالکؒ،امام احمد بن حنبلؒ کی طرح کوئی کوڑے کھانے کے لئے اپنی پیٹھ اور شہادت کے لئے اپنا جسم پیش نہیں کرتا تو پھر امت کے عامی دوسرے کی جان لے کر امت کے ایمان کی حفاظت کرتے ہیں____ اگر علماء دین کے لئے جان دینے کی قدیم روایت کا احیاء کریں تو عوام لوگوں کی جان لینے کا عمل ترک کر دیں گے لیکن ایک عمل متروک ہوگا تو اس امت کی روایت کے مطابق دوسرا عمل جاری رہے گا۔امت کے ایمان کی حفاظت اسی طرح سے ہوتی رہے گی۔جب بھی علماء،اسلامی،طاقت،حکومت،طاقت کے مراکز،مصلحت اور مفادات کے باعث دینی فرائض ادا کرنے میں غفلت،تساہل،تامل، تغافل کا مظاہرہ کریں گے تو رسالت مآبؐ کے امتی اپنے سروں کے چراغ لے کر راہ ایمان کو روشن رکھیں گے۔شہید ممتاز قادری امت کی اجتماعی،متفقہ،مشترکہ علمیت پر عمل کی علامت ہے۔انہوں نے اپنے لہو سے اس علمیت کو زندہ کیا ہے جو علماء کی آئینی،قانونی مصلحتوں کے باعث اس امت کے لیے اجنبی ہو گئی تھی۔

دارالاسلام یا دارالحرب میں کسی مسلمان کی جانب سے ریاست کے بغیر حد یا تعزیر جاری کرنے کے اہم ترین سوال پر غامدی صاحب نے فرمایا کہ اس موضوع پر میں میزان ، برہان اور مقامات میں دین کا موقف تفصیل سے لکھ چکا ہوں دارالحرب میں تو کسی مسلمان کیا کسی مسلم ریاست کو بھی یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ وہاں کے شہریوں پر اسلامی قوانین یا حدود و تعزیرات کا اطلاق کرے کیوں کہ دار بدلنے سے احکامات بدل جاتے ہیں یہ امت کا اجماعی اصول ہے۔اسی اصول کی بنیاد پر میں نے اور دیگر علمائے کرام نے امام خمینی کی جانب سے جاری کیے گئے سلمان رشدی کے قتل کے فتوے کی علمی بنیاد پر مذمت کی تھی کہ رشدی دارالحرب کا شہری ہے اور دارالحرب میں اسلامی احکامات کا نفاذ اور اطلاق نہیں ہو سکتا اسلامی احکامات دارالاسلام کے لئے ہیں لہٰذا ممتاز قادری کو سلمان تاثیر کو سزا دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔حدود و تعزیرات کا حکم مسلمانوں کو ان کی انفرادی حیثیت میں نہیں بلکہ پورے مسلمان معاشرے کو دیا گیا ہے اور یہ حکم نظم اجتماعی سے متعلق ہے یہ بدیہی بات ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا حکم ہی قرآن کی ان سورتوں میں بیان ہوا ہے جو اس وقت نازل ہوئیں جب یثرب کا اقتدار رسول اللہؐ کو منتقل ہو چکا تھا اور مسلمانوں کی ایک باقاعدہ حکومت وہاں قائم ہو گئی تھی چنانچہ کوئی شخص یا کوئی جماعت اگر کسی خطۂ ارض میں سیاسی اقتدار نہیں رکھتی تو اسے یہ ہرگز حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ان میں سے کوئی حد،تعزیر یا سزا کسی مجرم پر نافذ کرے حدود و تعزیرات کی آیات کے مخاطب مسلمانوں کے امراء و حکام ہیں عام مسلمانوں سے ان احکام کا کوئی تعلق نہیں یہ بات ابوبکر جصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن کی تیسری جلد میں تفصیل سے بیان کر دی ہے اسلامی شریعت سے واقف ہر صاحب علم جانتا ہے کہ جمعہ،زکواۃ،فے،قتال اور اقامت حدود یہ پانچ حکم ایسے ہیں جن کے لئے سلطان یعنی اقتدار اور صاحب اقتدار کا وجود ایک لازمی شرط کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ احکامات "موکول علی السلطان" کی اصطلاح میں بیان کئے جاتے ہیں حکومت کے بغیر حدود و تعزیرات نہ دارالحرب میں نافذ کی جاسکتی ہیں نہ دارالاسلام میں اگر اسلامی ریاست بھی سزاؤں کا نفاذ نہیں کر رہی تو ایک بندہ مومن کا کام صرف صبر ہے۔ریاست کا فریضہ صرف ریاست ادا کرے گی یہ نہیں ہو سکتا کہ ریاست اپنا فریضہ ادا کرنے میں ناکام ہو جائے تو ایک فرد یا جماعت اس ناکامی کے خلاء کو پر کرنے کے لئے آجائے اور حدود و تعزیرات کا نفاذ شروع کر دے اگر آپ کا پڑوسی اپنی بیوی کے حقوق زوجیت ادا نہیں کر رہا

تو آپ کوکوئی حق نہیں پہنچتا کہ آپ اس کی بیوی کے حقوق زوجیت ادا کرنے کی ذمہ داری قبول کرلیں یہ دین میں غلو ہے تحریف ہے فساد فی الارض ہے جس کی سزا قتل ہے۔

غامدی صاحب کے یہ اجتہادات بھی درست نہیں ہیں۔ پاکستان کو فی الحال دارالحرب کہنا مشکل ہے لہٰذا اس کے احکامات کی بحث بھی بے معنی ہے۔ یہ ایک پیچیدہ ریاست ہے مثلاً یہ دنیا کی واحد ریاست ہے جس نے کسی اقلیت کو پارلیمنٹ کے ذریعے کافر قرار دیا اور جس کے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کے فارم میں یہ درج کرنا ہوتا ہے کہ وہ قادیانی ہے یا نہیں۔ جبکہ جدید ریاست میں پارلیمنٹ کا یہ کام ہی نہیں ہے جدیدیت کے فلسفی اسے Illiberal Democracy کہیں گے۔

انھوں نے فرمایا کہ دار بدلنے سے تمام احکامات بدل جاتے ہیں مگر انھوں نے احکامات کی تخصیص نہیں کی ___ شریعت کا ہر حکم دار بدلنے سے نہیں بدلتا ___ ہاں بہت سے احکام بدل جاتے ہیں۔ امت کے بارے میں بھی ان کا دعویٰ غلط ہے کیوں کہ امت قرآن کے نص کو رد کرکے اجماع منعقد نہیں کرسکتی۔ قرآن نے محارب دارالحرب میں رہنے والے کافر اور مقیم مسلم کو مباح الدم قرار دیا ہے۔ غامدی صاحب کو یہ بھی نہیں معلوم کہ دارالاسلام کے شہری کے لئے حکم کچھ اور ہے اور اس سے باہر رہنے والے مسلم کے لئے دوسرا حکم ___ مثلاً ابو جندل کے اعمال کی ذمہ دار ریاست مدینہ نہ تھی وہ آزاد شہری تھے جنھیں ریاست اسلامی نے معاہدہ کے تحت قبول کرنے سے انکار کردیا تھا۔ اگر مغرب کی ریاستوں میں کچھ ابو جندل رہتے ہیں تو ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ___ اگر مغرب نے کسی مسلم کو اپنی شہریت دی ہے تو اس کی تعلیم تربیت اعمال کی ذمہ داری اسلام پر نہیں کفر پر عائد ہوتی ہے وہی اس کا ذمہ دار ہے۔ اگر مغرب میں مسلم آباد ہورہے ہیں تو وہ اسلامی نصوص کی خلاف ورزی کرکے آباد ہورہے ہیں ان کے اعمال کا اسلام سے اسلامی ریاست سے کوئی تعلق نہیں دیار کفر میں مستقل قیام کو شریعت نے اجماع سے حرام قرار دیا ہے شیخ حسن بصری تو لکھتے ہیں کہ ایسا مسلمان واپس آئے تو اسے قتل کردیا جائے۔ ممانعت کی وجہ یہی ہے کہ مسلم اگر کفار کے علاقے میں رہے گا تو کافر ہی ہوجائے گا اور اگر کافر نہ ہوسکا مسلمان ہی رہا تو اس کی غیرت اسے کفر سے مصالحت کے لئے آمادہ نہ کرسکے گی ___ لہٰذا مغرب میں شہریت حاصل کرنے والے مسلمان اگر توہین رسالت پر کافروں کو قتل کردیتے ہیں تو وہ اصلاً اپنے ایمان کی شہادت دیتے ہیں۔ اسی لئے ایسے ایمان والوں کو شریعت نے کفار کے علاقوں میں مقیم رہنے کی ممانعت کی ہے مگر غامدی صاحب ایک طرف مغرب کو دارالاسلام قرار دے کر مسلمانوں کو وہاں آباد ہونے کی اجازت عام دیتے ہیں۔ اور جب مغرب کے مسلم شہری غیرت ایمانی کے باعث توہین رسالت پر کسی کو قتل کردیں تو غامدی صاحب اسے اسلام کے قانون سے بغاوت کہتے ہیں دارالحرب کا مسلم شہری ایک کافر حکومت کا شہری ہے اور غامدی صاحب اس کے اعمال پر اسلامی احکامات کا نفاذ کررہے ہیں جبکہ دارالحرب میں تو سود بھی حلال ہوجاتا ہے اور مسلمانوں پر حدود و تعزیر کے احکامات بھی نافذ نہیں ہوتے مغرب میں آباد مسلمانوں کے تشدد کا سبب اسلام نہیں جدیدیت کی عالمگیریت کا جبر ہے اس لئے دنیا میں ہر جگہ، ہر ملک، ہر مذہب کے لوگ مغرب کے خلاف بغاوت کررہے ہیں Lutz کی کتاب Global Terrorism کا مطالعہ کرلیا جائے۔

بنیادی سوال یہ ہے کہ جدید سیکولر لبرل سرمایہ دارانہ آئینی ریاست کی مذہبی حیثیت کیا ہے؟ پاکستان کی ریاست خود کیا ہے؟ کیا وہ جدید ریاست سے الگ کوئی منفرد ریاست ہے یا اسی کا عکس ہے؟ کیا یہ ایک اسلامی ریاست ہے یا لبرل ریاست ہے یا یہ دونوں کا آمیزہ ہے؟ پاکستان کا آئین کیا مکمل طور پر اسلامی ہے یا مخلوط ہے؟ کیا ایک اسلامی ریاست کا تحریری آئین بھی ہوسکتا ہے اور وہ آئین فیڈرلسٹ پیپرز کی روشنی میں اور منشور حقوق کے طے شدہ اصولوں کے تحت تحریر کیا جاسکتا ہے؟ کیا اسلامی ریاست کے آئین کو اور شریعت کو صرف اس کے عوامی نمائندے منظور کرتے ہیں تو تب وہ نافذ ہوسکتا ہے اگر وہ مسترد کردیں تو شریعت کا نفاذ ناممکن ہوجائے۔ یعنی اللہ کے حکم کا نفاذ کیا بندوں کی اجازت کے بغیر نہیں ہوسکتا۔

کیا اسلامی تاریخ کے پندرہ سو برس میں کبھی ایسا ہوا ہے کہ کسی ریاست، سلطنت، خلافت نے پہلے عوامی نمائندے منتخب کیے پھر ان کی اجازت سے شریعت کا آئین نافذ کیا؟۔ کیا عصر حاضر کی جدید آئینی ریاست ایک مذہبی ریاست بھی ہوسکتی ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے جس کا جواب پاکستان کے سب سے پڑھے لکھے لبرل چیف جسٹس سپریم کورٹ جسٹس منیر نے **منیر کمیشن تحقیقاتی رپورٹ** میں آج سے پینسٹھ سال پہلے خود دے دیا ہے یہ سپریم کورٹ کی شہادت ہے ہماری شہادت نہیں ہے اور اس شہادت کے سامنے جاوید غامدی صاحب کے اجتہاد کی کوئی حیثیت نہیں ہے جسٹس منیر نے صاف صاف لکھا ہے مگر کیا لکھا ہے: منیر کمیشن کی رپورٹ عزیز احمد کے عالمانہ تبصروں کے ساتھ پیش خدمت ہے:

If it is an Islamic state as defined by the "Ulama" or the fundamentalists, it cannot be democratic in the modern sense. Technically it cannot be sovereign either, if sovereignty is vested in God.

"***Absolute restriction on the legislative power of a state is a restriction on the sovereignty of the people of that state and if the origin of this restriction lies elsewhere than in the will of the people, then to the extent***

***of that restriction the sovereignty of the state and its people is necessarily taken away*".[(MR) Munir Report (1954) , P-210]**

The dilemma in terms of general politics of Pakistan originated from the fact that through polotical slogans, as through religious persuasion, the common man had been led to believe that Pakistan was an Islamic state. The messianistic idea of an Islamic state had haunted Muslims, especially in India, for centuries during the phase of economic and political decadence of Islam. The Pakistani Muslim found himself ***standing on the crossroads, wrapped in the mental of the past and with the dead weights of the centuries on his back, frustrated and bewildered and hesitant to turn one corner or the other…. It is the lack of bold and clear thinkings, the inability to understand and take decisions which has brought about in paskistan a confusion which will persist and reputedly create situations of the kind we have been inquiring into until our leaders have a clear concept of the goal and of the means to reach it….*(MR page 229)**

On the question of attempts to bring about a compromise between modernisms and orthodoxy in law and constitution, the report commented:

Opposing principles, if left to themselves, can produce confusion and disorder, and the application of a neutralizing agency to them can only produce a dead result… And as long as we rely on the hammer when a file is needed and press Islam into service to solve situation it was never intended to solve, frustration and disappointment must dog our steps. The sublime faith called Islam will live even if our leaders are not there to enforce it. It lives in the individual, in his soul and outlook, in all his relation with God and men, from the cradle to grave, and our politicians should understand that if Divine command cannot make or keep a man a Musalman, their statutes will not. (MR page 229)

Sayyid Ahmed khan is alone in his total denunciation of ijma as a source of law. He was conscious of it only in the classical sense, i.e., that of the ijma of the ulama. Outside india ' Abduh was perhaps the first to see in an extended concept of ijma, as applicable to all Muslims, the seeds of something like modern democracy when he observed that government and legislation by the chosen representatives of the people was entirely in harmony with the spirit of Islam. In the subcontinent the theory of popular ijma as the basis of democracy was developed by Iqbal. Soon it seems to have gained general currency in the entire world of islam, in most cases developed locally. An Afghan writer, Niyaz Ahmad Zikriya, regards the role ijma of the Ulama in classical islam as a manifestation of delegated power, proving the sovereignty of the people whom the direct right of ijma has reverted in modern times.

However liberal or radical the modernist interpretation of the basic classical sources of law may be, as long as the divine word rather than human reason, experience and requirement is regarded as the ultimate source of law, an Islamic state cannot be sovereign in the modern sense of the world.

Absolute restriction on the legislative power of a state is a restriction on the sovereignty of the people of that state and of the origin of this restriction lies elsewhere than in the will of the people, then to extent of that restriction the sovereignty of the state and its people is necessarily taken away. In an Islamic state sovereignty, in its essential juristic sense, can only rest with Allah. (MR page 210)

No in the circumstances can that state be democratic or even ' theo- democrtaic', however broad a meaning may be given to the term ijma.

The crux of the problem is humanistic. In its larger sense humanism is defined by pierre Mesnard as ' toute conception theorique, toute attitude pratique quiaffirment la valeur exceptionelle de l'homme. Its starting point in the west is an " anthroprocentrism reflechi', an attitude unknown to the classical Islam. In Classical islam, in the totality of the traditionalist and fundamentalist current attitudes and in all Indo-Muslim modernist thought except in that of Iqbal, God and not man remains the key figure of the universe dominating man's political, social, economic, and cultural life.[Aziz Ahmed, Islamic Modernism ibid, p. 241, 242 & p. 270, 271]

پاکستان کے چیف جسٹس نے صاف صاف لفظوں میں لکھ دیا تھا کہ جدید ریاست اسلامی نہیں ہوسکتی اسلام ہر فرد کا ذاتی مسئلہ ہے یہ اندرونی روشنی ہے اسے ریاستی قوت سے نافذ نہیں کیا جاسکتا یہ فرد کی صواب دید پر منحصر ہے کہ وہ کتنا مسلمان بننا اور رہنا چاہتا ہے قوانین قاعدے ضابطے کسی کو مسلمان نہیں بنا سکتے لہٰذا فیصلہ کرلیا جائے کہ پاکستان لبرل اسٹیٹ بنے گی یا اسلامی اسٹیٹ۔ یہ بہت بنیادی بات ہے اس کا مابعد الطبیعیاتی اور فلسفیانہ پس منظر ہے اس کے پیچھے تحریک نشاۃ ثانیہ، انسانیت اور روشن خیالی کی فلسفیانہ علمی تحریکوں کی علمیت ہے جو کسی مذہبی علمیت کو علمیت تسلیم نہیں کرتیں اور تعقل مذہبی کی بنیاد پر معاشرے ریاست حکومت کی تعمیر تشکیل ترتیب کو حرام سمجھتی ہے سیکولرازم کوئی طریقہ نہیں طرز فکر اور فلسفہ زندگی ہے کہ زندگی کے کسی دائرے میں تعقل مذہبی کی بنیاد پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جائے گا صرف فرد اپنی ذاتی زندگی میں جس سے مراد صرف اور صرف فرد کی ذاتی زندگی ہے باقی سب اس کے لئے Other ہیں حتیٰ کہ اس کا خاندان بھی ___ وہ تنہا فرد صرف اپنی ذات کی حد تک مذہبی آزادی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اس کے سوا مذہب کسی سطح پر جدید ریاست کو قبول ہی نہیں ہے اس سلسلے میں فیڈرلسٹ پیپرز کو ایک نظر دیکھ لیا جائے۔

منیر کمیشن رپورٹ کی حقیقی واقعی فلسفیانہ بنیادوں پر غور کرنے، مستقبل کا لائحہ عمل طے کرنے اور جدید لبرل ریاست کو رد کرنے کے بجائے علماء نے صرف سادہ طریقے سے اس رپورٹ کو مسترد کردیا اور ان تمام مباحث کو نظر انداز کردیا جو اس رپورٹ میں اٹھائے گئے تھے علماء کے دباؤ کے تحت سیکولر لبرل حلقے پسپا ہوگئے انھوں نے مصالحت کرلی صرف بیس سال بعد علماء کا دباؤ بہت زیادہ بڑھا تو ریاست نے انھیں خوش کرنے کے لیے ۱۹۷۴ء میں قادیانیوں کو اقلیت قرار دے دیا مگر ۱۹۷۳ء کا لبرل سیکولر آئین بھی چند اسلامی دفعات شامل کرکے علماء سے تسلیم کروالیا مگر اب لبرل حلقے اس رپورٹ کے مطابق پاکستان کو اسلامی ریاست کے بجائے سیکولر ریاست بنانے کے عمل کو مہمیز دے رہے ہیں۔ رپورٹ جب آئی تب علماء سب سے بڑی قوت تھے اس قوت کی تاریخ حسن جعفر زیدی کی کتاب ''ملائیت اور فرقہ واریت کا آغاز''میں پڑھی جاسکتی ہے۔ مسلم لیگ، قائداعظم اور لیاقت علی خان بھی علماء کی قوت کو تسلیم کرتے تھے اور ان کی رائے کو فیصلوں میں بنیادی اہمیت دیتے تھے مسلم لیگ کی رکنیت غیر مسلموں کے لئے کھولنے کا فیصلہ مسلم لیگ کو علماء کے دباؤ کے باعث واپس لینا پڑا تھا بعض اوقات قائداعظم بھی علماء کے سامنے اپنی محکم رائے تبدیل کرلیتے تھے یہ علماء کا احترام بھی تھا اور ان کی بے مثال قوت وشوکت کا اعتراف بھی۔

اس وقت پاکستان میں مدارس کی تعداد برائے نام تھی اور اب مدرسے کئی ہزار ہیں علماء لاکھوں ___ مگر اسلام اب ریاست کے ایوانوں اور محرابوں سے نکل کر صرف مدرسے کی چاردیواری میں محصور ہوگیا ہے جس طرح پوپ کو جدید ریاست نے ویٹی کن کی سرحدوں میں قید کردیا ہے۔

مدارس کی کثرت نے علماء کی قوت میں زبردست اضافہ کے بجائے ان کی طاقت کو مکمل تحلیل کردیا ہے وہ اسلامی ریاست کے بجائے اپنی ریاست کے تحفظ میں مصروف ہیں۔ بڑے بڑے ادارے بنانے کا انجام یہی ہوتا ہے اسی لئے مغرب ادارے بنانے پر زور دیتا ہے ادارے پاؤں کی زنجیریں بن جاتے ہیں جب آپ صرف مسجد کے صحن میں ادارہ بناتے ہیں تو اسے کوئی ختم نہیں کرسکتا، روسی کمیونسٹ حکومت بھی مساجد کو ختم نہیں کرسکی۔ ۲۰۱۶ء کے آتے آتے علماء کی یہ قوت مصلحتوں کے باعث بالکل تحلیل ہوکر رہ گئی۔

اصولی طور پر پاکستان ایک اسلامی ریاست ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور یہ بات دعوے کی حد تک سو فی صد صحیح ہے، آئین اسلامی بھی ہے اور سیکولر لبرل بھی یعنی مخلوط ہے۔ جنرل ضیاء الحق نے قرارداد مقاصد کو آئین کے دیباچے میں شامل کرکے اسے آئین سے برتر دستاویز Supra Constitutional کی حیثیت دی تھی یہ وہی قرارداد ہے جس کے بارے میں ایک بہت بڑے عالم نے یہ کہا تھا کہ آج پاکستانی ریاست نے کلمہ پڑھ لیا ہے۔ حالانکہ ریاست کلمہ نہیں پڑھتی فرد کلمہ پڑھتا ہے ریاست نہ قبر میں جاتی ہے نہ میدان حشر میں جواب دہ ہوتی ہے یہ صرف فرد ہوتا ہے جو قبر اور حشر میں سوالات کا سامنا کرتا ہے۔ اسی لیے مذہبی ریاستیں آئینی نہیں شخصی ہوتی ہیں وہاں اداروں کی نہیں فرد کی حکومت ہوتی ہے یہی فرد زمین پر خدا کی نیابت خلافت کے ذریعے انجام دیتا ہے یہی خلیفۃ الارض خدا کی عدالت میں جواب دہ ہوتا ہے۔ قرارداد مقاصد کی برتر و بالا حیثیت کو حاکم خان کیس میں جسٹس نسیم حسن شاہ نے منسوخ کردیا اور یہ فیصلہ کیا کہ آئین کی تمام شقیں برابر ہیں کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں لہٰذا آئین کی اسلامی شقیں اور غیر اسلامی شقیں برابر ہوگئی ہیں کسی کو کسی پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ دین جب بھی جدید آئین کی شق [Article of Constitution] کے طور پر شامل ہوگا وہ دین نہیں رہے گا بلکہ آئین کی محض ایک دفعہ یا شق یا حصہ ہوگا جس کا وجود صرف اور صرف اکثریت کی حمایت سے اس وقت تک قائم رہے گا جب تک اس کی مخالف اقلیت یا حزب اختلاف کو اس ایوان میں اکثریت حاصل نہیں ہوجاتی کیونکہ منشور انسانی حقوق کے تحت صرف منشور مقدس ہے اور آئین ایک غیر مقدس دستاویز ہے کیونکہ آئین کی ہر شق پر تنقید ہوسکتی ہے اس میں ترمیم، تصحیح، تبدیلی، اضافہ کمی کی جاسکتی ہے، بلکہ اسے مسترد، منسوخ، معطل، کالعدم اور خارج بھی کیا جاسکتا ہے لہٰذا دین کے مقدس احکام، شریعت کے قطعی، منصوص فیصلے بھی جب اس غیر مقدس آئین کا حصہ بنتے ہیں تو وہ خود ہی اپنے تقدس سے دستبردار ہوجاتے اور خود کو تنقید تمسخر اعتراض کے لیے پیش کردیتے ہیں۔ پیپلز

پارٹی کے سابقہ دور حکومت میں قومی اسمبلی کی ایک کمیٹی میں ایک علاقائی لسانی سیاسی جماعت نے ایک قرارداد پیش کی کہ پاکستان کے آئین میں خدا کی حاکمیتِ اعلیٰ کی شق خارج کر دی جائے کمیٹی میں یہ قرارداد رائے شماری کے لئے پیش ہوئی تو اس موقع پر پی پی پی کے اراکین نے اس تجویز کے خلاف ووٹ دیے اور خدا کی حاکمیت کے خاتمے کی مجوزہ قرارداد مسترد ہوگئی روزنامہ جسارت نے بڑی عجیب اور معنی خیز خبر لگائی'' آئین میں خدا کی حاکمیت دو ووٹوں کی اکثریت سے برقرار رہی'' آئین اسی دستاویز کو کہتے ہیں اسی اصول کے تحت صدر محمد مرسی نے جب مصر میں اقتدار سنبھالا تو اپنی اکثریت کے زعم میں آئین میں توہین رسالت کی شق شامل کر دی جب ان کی حکومت برطرف کر دی گئی اور انتخابات میں ان کی مخالف جماعت کو ایوان میں اکثریت حاصل ہوئی تو کثرت رائے سے توہین رسالت کی شق آئین سے خارج کر دی گئی جن اصولوں، اقدار، قوانین ،شقوں کا دارومدار صرف اور صرف اکثریت کی رائے پر منحصر ہو اور آراء تبدیل کرنے کی ہمیشہ اجازت ہو تو وہ دین نہیں ہوسکتی کیونکہ دین مطلق، دائمی، ناقابل تغیر، قطعی ہے جس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جاسکتا جو تنقید سے بالاتر ہے۔ لہٰذا کسی ملک کے آئین کو اسلامی کہنا اصلاً اسلام کے نصوص کو تنقید کے لیے پیش کرنے کے مترادف ہے۔ جب اسلام پر تنقید ہو تو شور مچا دینا مسئلے کا حل نہیں ہے۔

بنیادی بات یہ ہے کہ کسی بھی جدید ریاست کا آئین منشور انسانی حقوق [Human rights Declartion] کی بنیاد پر تیار کیا جاتا ہے اور تمام قوانین اس آئین کی روشنی میں بنائے جاتے ہیں منشور بنیادی حقوق مقدس دستاویز ہے اس کی تیس شقوں [Thirty Articles] میں سے کسی ایک شق پر بھی تنقید نہیں کی جاسکتی ان تیس عقائد کو من وعن قبول کرنا ہوتا ہے یہ take fo granted ہیں ان کی عقلی توجیہہ پیش نہیں کی جاتی یہ ہر آئین کا مذہب ہے اس مذہب کے مطابق آئین بنایا جاسکتا ہے آئین غیر مقدس دستاویز ہے اس پر تنقید ترمیم تبدیلی کے لیے ہمیشہ پارلیمنٹ میں بحث مباحثے ہوتے رہتے ہیں۔

اسلام مقدس ہے اس کی شریعت مقدس ہے مگر جب وہ اس غیر مقدس غیر مطلق متغیر آئین کا حصہ بنتی ہے تو اس پر بھی تنقید کی جاسکتی ہے اس میں ترمیم ہوسکتی ہے اس کا مضحکہ اڑایا جاسکتا ہے کیونکہ جمہوری معاشرہ ایک غیر مقدس معاشرہ [Profan Society] ہوتا ہے جہاں سوائے منشور انسانی حقوق کے کوئی چیز مقدس [Sacred] نہیں۔توہین رسالت کا مقدس قانون جب غیر مقدس آئین کے تحت قانون بنایا گیا اور اسمبلی نے اسے منظور کرلیا تو منشور انسانی حقوق کے تحت اس قانون پر ہر شخص کو تنقید کی اجازت ہے سوائے ان لوگوں کے جنھوں نے اس آئین وقانون کا حلف اٹھایا ہے مگر وہ بھی اس کو آئینی قانونی طریقوں سے تبدیل کرنے کا پورا حق رکھتے ہیں کیونکہ یہ مطلق آئین Absolute Constitution نہیں ہے۔

عدالت عظمی نے اسی تناظر میں فیصلے کے اندر یہ لکھا ہے کہ کسی قانون پر تنقید کرنا توہین رسالت نہیں ہے کیونکہ آئین قانون پر تنقید کی لامتناہی آزادی حاصل ہے عدالت کا یہ فیصلہ انسانی حقوق کے منشور کے منہاج میں درست فیصلہ ہے مگر اسلام اس منہاج علمی کو تسلیم ہی نہیں کرتا لہٰذا اسلامی شریعت کی روشنی میں یہ بالکل غلط فیصلہ ہے آئین اور اسلام کو مخلوط نہیں کیا جاسکتا مذہبی علیت اس اختلاط کو غیر علمی سمجھتی ہے فلسفے اور سائنس میں بھی دو مختلف مناہج علمی [Paradigms] کو مخلوط نہیں کیا جاسکتا کیونکہ دو مخالف مناہج علم کو ملانا ممکن نہیں علم کی دنیا میں یہ غیر علمی رویہ ہے کیونکہ دونوں مناہج کے اصول مبادیات، ایمانیات ،عقائد، طریقے سب مختلف ہوتے ہیں دو متضاد مناہج کو ملانے مخلوط کرنے کا یہ طریقہ تصور اور نظریہ [Idea] ہی علم کی دنیا میں incommensurable یعنی نظریہ عدم توافق کہلاتا ہے جدید علم سائنس کی دنیا میں بھی علم سائنس کے مختلف مناہج Paradigms کو بھی مخلوط نہیں کیا جاسکتا۔یعنی آپ نیوٹن کے منہاج علمی میں کھڑے ہوکر آئن اسٹائن کے منہاج علمی کو استعمال نہیں کر سکتے۔ یہ دو مختلف مناہج سائنس ہیں۔

فلسفہ سائنس کا مفکر کوہن Thomas Kuhan اپنی کتاب The Structure of Scientific Revolutions میں لکھتا ہے Rival Paradigms are incommensurable۔کوہن لکھتا ہے کہ ایک منہاج سائنس سے دوسرے منہاج سائنس میں کسی سائنس دان کی منتقلی ایک ایسا عمل ہے جیسے کوئی شخص ایک مذہب ترک کر کے دوسرا مذہب اختیار کرلے کوہن کے الفاظ میں It is a gestalt switch or a religious conversion.۔

جب سائنس اس بارے میں اتنی متشدد ہے تو آئین اور قانون میں مذہبی اصطلاح اور مغربی اصطلاح آزادی اور بندگی کو کیسے اکٹھا کیا جاسکتا ہے ایک منہاج علمی میں دوسرے باطل منہاج کی اصطلاح کیسے سموئی جاسکتی ہے۔اصولاً ایک منہاج علمی کے اصول دوسرے منہاج علمی میں غلط نظر آتے ہیں مثال کے طور پر

The statement that a straight line is the shortest distance between two points or that Paralled line

لیکن کیا اس اصول کا اطلاق only meet at infinity is true if and only if we are situated in Euclidean space
Curved and elliptical space پر کیا جاسکتا ہے؟ ظاہر ہے ایک منہاج کے اصول ایک منہاج کی دلیل دوسرے منہاج میں نہیں سموئی جاسکتی۔ کوہن نے اس صورت حال کو عدم توافق سے تعبیر کیا ہے۔

فلسفے کے دائرے میں دو متضاد متخالف مناہج فلسفہ کو مخلوط کرنے کا عمل اصطفائیت کہلاتا ہے۔ مختلف مناہج فلسفہ کے اختلاط و آمیزے سے تخلیق پانے والا فلسفہ [Eclecticism] کہلاتا ہے یعنی مختلف فلسفیانہ یا دینیاتی مسائل کو مرکب کرنے کا اصول عمل یا رجحان عملی صورت میں اصطفائیت [Eclecticism] فلسفیانہ نظاموں میں وحدت تلاش کرنے کا نام ہے لیکن عام طور پر یہ رجحان ایسے مفکرین کے یہاں پایا جاتا ہے جن میں ذہنی اپج کی کمی ہو [قاضی قادر کشاف اصطلاحات فلسفہ کراچی یونیورسٹی، ص ۵۷] اصطفائیت کی ایک اور تعریف درج ذیل ہے:

Eclectic position in philosophy and religion seeks to combine the best elements of other views[Simon Blackburn Oxford Dictionary of Philosophy p. 109, 2005]

افسوس یہ ہے کہ ۱۹۷۳ء سے پاکستانی آئین اسی غیر علمی طریقے سے دو مناہج کو مخلوط کر کے عمر بسر کر رہا ہے اور یہی رویہ پاکستانی معاشرے کو تصادم اور تشدد کے راستے پر لے جا رہا ہے۔

جسٹس نسیم حسن شاہ نے جب آئین کی تمام اسلامی و غیر اسلامی دفعات کو ایک دوسرے کے مساوی قرار دے دیا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کا قانون اور انسانوں کا بنایا ہوا قانون برابر ہیں A=B دوسرے معنوں میں B=A اور جب دونوں برابر ہیں تو فیصلہ چاہے شریعت کے مطابق ہو یا شریعت کے خلاف ہو کوئی فرق نہیں پڑتا سوال یہ ہے کہ حق و باطل کیسے برابر ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے اس اصول کے مطابق صرف اور صرف جدید سیکولر قوانین کے تحت ہی فیصلے کیے جاسکیں گے۔ اصولی طور پر پاکستانی ریاست اسلامی ہونے کے باوجود مسلسل لبرل سیکولر قالب اختیار کرتی جا رہی ہے ریاست نے میڈیا کو قرآن کی نصوص کے خلاف عریانی فحاشی پھیلانے کی مکمل آزادی دے رکھی ہے جب کہ قرآن نے فحش پھیلانے والوں کے لیے واضح طور پر حکم دیا کہ انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کر دیا جائے۔ لَئِنۡ لَّمۡ يَنۡتَهِ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَ الَّذِيۡنَ فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ وَّ الۡمُرۡجِفُوۡنَ فِى الۡمَدِيۡنَةِ لَنُغۡرِيَنَّكَ بِهِمۡ ثُمَّ لَا يُجَاوِرُوۡنَكَ فِيۡهَاۤ اِلَّا قَلِيۡلًا مَّلۡعُوۡنِيۡنَ اَيۡنَمَا ثُقِفُوۡۤا اُخِذُوۡا وَ قُتِّلُوۡا تَقۡتِيۡلًا [۳۳: ۶۰، ۶۱] لہٰذا پاکستانی ریاست کو اصولاً دار الحرب کہنا بھی بالکل غلط ہے اور عملاً پاکستانی ریاست کو دار الاسلام کہنا بھی بالکل غلط ہے کیوں کہ پہلا دار الاسلام مدینۃ النبی تھا جہاں فحش کی اشاعت کی سزا نص قرآنی سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کر دینا ہے جب کہ پاکستان کے دار الاسلام میں اس سزا کا اطلاق بھی نہیں ہو رہا اور اسلامی ریاست تمام چینلوں کو عریانی فحاشی پھیلانے کے اجازت نامے پیسے لے کر خود جاری کر رہی ہے لہٰذا پاکستان کا معاملہ فی الحال مخدوش ہے۔ ویسے بھی سپریم کورٹ کے چیف جسٹس منیر احمد کے فیصلے کے مطابق لبرل ریاست اسلامی نہیں ہو سکتی۔ ۱۹۷۳ء کے دستور کے تحت یہ مخلوط ریاست ہے لہٰذا غامدی صاحب کا یہ اجتہاد کہ پاکستان دار الاسلام ہے۔ سپریم کورٹ کے فیصلے کی روشنی میں درست نہیں۔

بلا شک و شبہ اصولی، لفظی، حرفی، قانونی، کاغذی، آئینی، دستوری طور پر اپنے بیان، اقرار اور عقیدے کی سطح تک پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے۔ تمام مذہبی سیاسی جماعتیں یہی نقطۂ نظر رکھتی ہیں اور تمام مکاتب فکر کی متفقہ رائے یہی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ غیر مذہبی سیکولر لوگ پاکستانی ریاست کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں ان سب کی متفقہ رائے چیف جسٹس منیر احمد سے لے کر جسٹس شائق عثمانی، چیف جسٹس نسیم حسن شاہ، چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی اور جسٹس سرمد جلال عثمانی تک ایک ہی ہے کہ پاکستان ایک سیکولر لبرل ریاست ہے اِسے مذہبی ریاست تسلیم ہی نہیں کیا جاسکتا۔ عدالت اس ملک میں قانون کی شارح ہے عدالت کی قوت یہ ہے کہ اس نے ایک وزیر اعظم نواز شریف کے خلاف کارروائی شروع کی تو نواز شریف نے عدالت کے چیف جسٹس سجاد علی شاہ کے خلاف عدالت کے ججوں سے بغاوت کرا کے چیف جسٹس کو برطرف کرا دیا اس عدالت نے دوسرے وزیر اعظم کو توہین عدالت کی کارروائی میں اس کے منصب سے برطرف کر دیا۔

چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی نے اپنی ملازمت کے خاتمے سے چند دن پہلے جسٹس منیر کی رپورٹ کی روح کے عین مطابق تاریخی فیصلہ دیا جس میں انھوں نے منشور انسانی حقوق کی بنیاد پر ہر فرد کو ارتداد کی آزادی عطا فرمائی یعنی ارتداد ہر انسان کا حق ہے۔ اس فیصلے میں انھوں نے لکھا ہے کہ ہر شخص اپنا مذہب تبدیل کر سکتا ہے

اس فیصلے کا انگریزی متن اور اردو ترجمہ سپریم کورٹ کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔تصدق حسین جیلانی ایک مخلص، بے باک اور راسخ العقیدہ لبرل چیف جسٹس تھے انھوں نے عدلیہ کے دیگر ججوں کی طرح انسانی حقوق کے منشور کے کفر کی اسلام کاری کرنے اور لیپا پوتی کرنے کے بجائے صاف صاف لفظوں میں انسانی حقوق کے منشور کی روح کے مطابق یہ تاریخی فیصلہ صادر فرمایا۔حیرت ہے کہ اعلیٰ عدالتوں کے بڑے بڑے مذہبی وکلاء، مذہبی مفکرین اور سپریم کورٹ کے بہت سے جج بھی منشور انسانی حقوق کی مابعد الطبیعیاتی اساسات سے ناواقف ہیں اور اسے خطبہ حجۃ الوداع سے ماخوذ سمجھتے ہیں لیکن مغربی فلسفے اور فکر پر گہری نظر رکھنے والے لبرل مفکر اور جج جن کی تعداد پاکستان میں رائی کے برابر بھی نہیں منشور انسانی حقوق کی اصل روح، ایک آئینی دستوری ریاست کے اصل مقاصد، جوہر [Essence] اس کے ماخذات قانون [Sources of Law] اس کی مابعد الطبیعیاتی اساسات [Meta Physical foundations] اس کے مقاصد اہداف [Aims and Goals] اور اس کے فلسفہ سیاست [Political Philosophy] سے بخوبی واقف ہیں اور اسی کے مطابق فیصلے کر رہے ہیں اور پاکستانی ریاست انھیں قبول بھی کر رہی ہے ان کے خلاف اپیل نہیں کر رہی۔سود کے حوالے سے مقدمہ اس کی بہترین مثال ہے۔لیکن اس کے باوجود مذہبی مکاتب فکر میں سے کسی ایک مکتب فکر کو ان مباحث سے دلچسپی نہیں۔

منشور انسانی حقوق کی بنیاد پر جو تصور انسان، تصور کائنات اور تصور خیر پیش کیا گیا اس کا ماخذ فیڈرلسٹ پیپرز [Fedralist Papers] ہے اس میں خدا، رسول اور آخرت کی کوئی گنجائش نہیں وہ صرف آزادی کا تصور الحق [Suprem Good of Freedom] پیش کرتا ہے جس کے تحت انسان کسی مقصد کا ذریعہ [Mean to an end] نہیں بلکہ خود اصل ہدف اور مقصد [End in himself] ہے یہ منشور انسان کو تخلیق خیر [Creation of Good] کا اختیار دیتا ہے بشرطیکہ وہ آزادی کے عقیدے کے تابع خیر تخلیق کرے [The Good be created under the suprem Good of Freedom] ــــــ یہ منشور ہر شخص کو اپنے اپنے مذہب پر قائم رہنے اور جب چاہے اپنا مذہب بدلنے بلکہ کوئی نیا مذہب تخلیق کرنے یا کسی بھی مذہب میں اپنی خواہش نفس کے مطابق ترمیم و تنسیخ، اضافے کمی کا کلی اختیار دیتا ہے کیوں کہ آزادی کے عقیدے کے تحت ہر شخص کو صرف اپنا انفرادی خیر خلق کرنے کی آزادی ہے کیوں کہ مذہب کوئی علم نہیں کوئی علمی "عقلی" حقیقت نہیں۔لہٰذا انسان مذہب کے ضمن میں جو چاہے تصور عقیدہ عمل اختیار کرے یہ اس کا ذاتی مسئلہ ہے کیوں کہ مذہب کی کوئی حقیقت اور کوئی حیثیت نہیں۔جب منشور یہ کہتا ہے کہ تمام مذاہب عالم برابر ہیں تو اصلاً اس کا دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ الحق اور الخیر کی بحث بے معنیٰ ہے یہ جہالت و جاہلیت خالصہ ہے۔اصل بات یہ ہے کہ ہر شخص کو کوئی بھی مذہب اختیار کرنے کی آزادی صرف اور صرف اس کی انفرادی زندگی کے دائرے میں حاصل ہے۔ بشرطیکہ یہ مذہب آزادی کے عقیدے کے منافی [Against the faith of freedom] نہ ہو ــــ اصل الحق آزادی مساوات ترقی کے تین عقیدے اور ان کا حصول فلسفہ حقوق، حقوق کی سیاست اور منشور انسانی حقوق [Philosophy of Right/ Politics of Rights/ Human Rights Decleration] کے ذریعے ہی ممکن ہے یعنی فرد کی آزادی، لذت، آمدنی، معیار زندگی میں مسلسل اور مستقل اضافہ عصر حاضر میں جان رالس کسی شخص کے قابل عزت ہونے کے چار پیمانے بتاتا ہے (1) Income (2) Wealth (3) Power (4) Authority ـــــ رالس لکھتا ہے کہ جس انسان کو یہ چار بنیادی خیر [Prime Goods] حاصل نہ ہوں وہ اپنی نظروں میں بھی عزت حاصل نہیں کر سکتا۔

مذاہب عالم اور اسلام جدیدیت اور پس جدیدیت کے ان تین باطل عقیدوں کو تسلیم ہی نہیں کر سکتے۔جدید مغربی فلسفے، سوشل سائنس، اور جدید فلسفہ سیاسیات سے واقف ہر شخص ان مباحث سے واقف ہے کہ جدید آئینی دستوری ریاست میں مذہب کی حاکمیت قائم ہی نہیں ہو سکتی کیوں کہ یہ ریاست منشور انسانی حقوق کی بنیاد پر اپنا آئین تیار کرتی ہے جو صرف ارادۂ عامہ [General will] کے تابع حاکمیت عوام کو تسلیم کرتی ہے ارادہ عامہ اور آزادی [General Will & Freedom] کی فلسفیانہ اصطلاحات کو سمجھے بغیر جدید ریاست کی حقیقت کو سمجھنا ناممکن ہے یہاں موقع بھی نہیں ہے۔جدید ریاست ہماری خواہشوں اور آرزوؤں کے مطابق کام نہیں کر سکتی خواہشات اگر متبادل علمیت اور قوت کے نئے دائروں کے ساتھ ظہور کریں تو ریاست کو یقیناً اسلامی بنایا جا سکتا ہے۔مگر اس کے لیے بہت جدوجہد، محنت، کوشش اور منصوبہ بندی کی ضرورت ہے نیک خواہشات سے کبھی انقلاب برپا نہیں ہو سکتا یہ بات بھی واضح رہے کہ منشور انسانی حقوق کی کتنی ہی تاویل کر لی جائے یہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔جسٹس تصدق حسین جیلانی کا فیصلہ پڑھنے کے بعد بھی اگر علماء کرام منشور انسانی حقوق کی اصلیت، ماہیت، حقیقت، سمجھنے سے قاصر ہیں تو اس پر افسوس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

جہاں تک غامدی صاحب کے اس اجتہاد کا تعلق ہے کہ دار غیر میں اسلامی شریعت کے کسی حکم، نص، اصول کا اطلاق نہیں کیا جا سکتا اس پر نقد ہم پہلے کر چکے

ہیں۔ یہ اجتہاد بھی قرآن کے نصوص کے خلاف ہے سورہ بنی اسرائیل مکی سورت ہے جب مسلمان دارالحرب مکہ میں مقیم تھے اسلامی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی نہ نظم اجتماعی موجود تھا تب قرآن نے حکم دیا کہ مظلوم مقتول کا بدلہ ریاست حکومت، اور نظم اجتماعی کے بغیر ایک فرد دارالحرب میں لینے کا مجاز ہے۔ ثابت ہوا کہ دارالحرب میں نظم اجتماعی کے بغیر ایک فرد اپنی صواب دید پر ایک مسلمان کے خون کا بدلہ خود لے سکتا ہے وَ لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَ مَنْ قُتِلَ مَظْلُوْمًا فَقَدْ جَعَلْنَا لِوَلِيِّهٖ سُلْطٰنًا فَلَا يُسْرِفْ فِّي الْقَتْلِ اِنَّهٗ كَانَ مَنْصُوْرًا [۱۷:۳۳] انسانی زندگی اللہ کے نزدیک اتنی اہمیت کی حامل ہے کہ اس کے لیے دارالحرب میں ایک کافر کو بھی قصاص میں قتل کیا جاسکتا ہے۔ خود غامدی صاحب کا مؤقف بھی اس آیت کی تفسیر میں یہی ہے اس کی تفصیل کے لیے میزان لاہور المورد طبع ہفتم ۲۰۱۳ء کا صفحہ ۶۱۸ ملاحظہ کیجیے۔ جہاں غامدی صاحب نے یہی موقف اختیار کیا مگر اب ارتقاء کے تحت دوسرا موقف اختیار کرلیا ان کے دونوں اصول Oxymoron ہیں۔

سورہ شوریٰ مکی سورت ہے اس میں بھی قرآن نے دارالکفر دارالحرب میں کفار کے ظلم و جبر زیادتی اور ستم کا اتنا ہی بدلہ لینے کی اجازت دی ہے وَ جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَ اَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ وَ لَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَ يَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ [۴۲:۴۲،۴۱،۴۰] لہٰذا غامدی صاحب کا یہ استدلال بھی غلط ہے کہ بعض حالات میں سزا کے لیے یا بدلے اور انتقام کے لئے نظم اجتماعی اور دارالاسلام کا ہونا ضروری ہے اور ان کا یہ دعویٰ بھی ان کے پچھلے دعوے سے مختلف ہے کہ ''حدود تعزیرات کا حکم ہی قرآن کی ان سورتوں میں بیان ہوا ہے جو اس وقت نازل ہوئیں تھی جب یثرب کا اقتدار رسول اللہ کو منتقل ہوچکا تھا'' [غامدی میزان لاہور المورد طبع ہفتم ۲۰۱۳ء ص ۶۰۹]

امین احسن اصلاحی اور غامدی صاحب سورہ حج کو مکی سورت قرار دیتے ہیں۔ اس سورت میں بھی دونوں کی تحقیق کے مطابق قتال اور جہاد کے اولین احکامات دیئے گئے ظاہر ہے اس وقت ریاست مدینہ موجود نہ تھی۔ اس کے بعد مدنی سورت سورہ بقرہ کی آیات ۱۹۰ تا ۱۹۳ اور ۲۱۶ تا ۲۲۴ میں با قاعدہ جنگ کا حکم دیا گیا جہاد کی اجازت ہجرت سے پہلے اور جہاد کا حکم ہجرت کے بعد کا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر ''موکول علی السلطان'' کے دائرے کے احکامات نظم اجماعی اور ریاست سے مشروط ہیں تو یہ احکامات مکی سورتوں میں کیوں دیئے گئے؟ سورہ حج میں آتا ہے کہ ان لوگوں سے تمہیں جنگ کی اجازت دی گئی جنھوں نے تم پر ظلم کیا ہے اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۨ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَ لَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَ بِيَعٌ وَّ صَلَوٰتٌ وَّ مَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَ لَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ [۲۲:۴۰،۳۹] وَ جَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ [۲۲:۷۷] سورہ حج میں کفار سے دارالحرب میں ظلم کا بدلہ لینے کی بھی اجازت دی گئی ذٰلِكَ وَ مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ [۲۲:۶۰]

غامدی صاحب کے تمام اجتہادات oxymoron ہیں یہ قرآن کے نصوص کے بھی منافی ہیں اور امت کی اجماعی علمیت سے بھی انحراف رکھتے ہیں۔

علماء کی خدمت میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ صرف یہی عرض کرنا ہے کہ چٹکی بھر مٹی کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی مگر وہ چٹکی بھر مٹی ہوا کا رخ بتا دیتی ہے ــــ ممتاز قادریؒ کی شہادت نے ہوا کا رخ بتا دیا ہے مگر علماء ابھی تک اس رخ کو پہچان نہیں سکے۔ ۱۹۷۳ء میں تحریک ختم نبوت کے دوران ایک خطیب نے تین عجیب و غریب شعر پڑھے تھے ہم اس وقت طالب علم تھے اور ان اشعار کو حقیقت سمجھتے تھے آج ہم عمر کی آخری منزلوں میں ہیں تو ہمیں ان اشعار کی حقیقت صرف خطابت نظر آئی وہ عجیب و غریب اشعار جنھوں نے میرے دل میں کئی مہینوں تک آگ دہکائے رکھی جو آج بھی میری رگوں میں خون کی رفتار تیز کردیتے ہیں شہید ممتاز قادریؒ کے حضور نذرانہ عقیدت کے طور پر پیش کرتا ہوں۔

اپنی اس تحریک میں ایسے اٹھاؤں گا شہید	جن کے مدفن کو زمین کربلا دینی پڑے
اتنا کردوں گا میں ماؤں کی محبت کو بلند	دل کے ٹکڑوں کو شہادت کی دعا دینی پڑے
میرے ہم راہی کریں گے اس طرح جانیں نثار	ذرے ذرے کو دعائے مغفرت کرنی پڑے

خالد جامعی

جہاد اور مسلک پرستی

غلبۂ اسلامی کے لئے ضروری ہے کہ اس کے نفاذ اور توسیع کی چومکھی جنگ صالحین کے ذریعہ سے لڑی جائے جو تزکیۂ نفس کے مراحل سے گزر چکے ہوں اور اپنی ذات کو مٹا چکے ہوں۔ وہ لوگ جو مومن کا مقام حاصل کرنے کے بجائے ایک فرقہ پسند گروہ بن کر گروہی عصبیت کے حامل ہوں اور مشرکین، کفار، اہل کتاب اور اسلامی گروہوں کے مابین فرق کرنے سے معذور ہوں وہ جہاد کے اہل نہیں۔ جہاد میں اگر کافر چمکتی تلوار دیکھ کر اسلام قبول کرلے تو اس کا اسلام قابل یقین ہوجاتا ہے اور رسالت مآب ﷺ اپنے ایک صحابی سے فرماتے ہیں کہ جب اس کافر نے کلمہ پڑھ لیا تو تم نے اسے کیوں قتل کیا؟ وہ جواب دیتے ہیں کہ تلوار دیکھ کر کلمہ پڑھ رہا تھا۔ گمان یہ تھا کہ دھوکہ دے رہا ہے تو فرمایا کیا تم نے اس کا سینہ کھول کر دیکھ لیا تھا؟ حضرت علیؓ مرحب پہلوان کو گراتے ہیں لیکن اس کے تھوکنے پر اٹھ کر الگ ہوجاتے ہیں کہ پہلے میں اللہ کے لئے لڑ رہا تھا اب گمان ہوا کہ کہیں اپنے نفس کے لئے یہ کوشش نہ ہو۔ میدان جہاد میں ایک صحابی نے جن کا وقت شہادت قریب تھا پیاس کی شدت سے پانی طلب کیا۔ پانی پیش کیا گیا اتنے میں دور سے آواز آئی کہ پانی تو پانی چھوڑ دیا اور اشارہ کیا کہ انہیں پہلے پانی پلا دو۔ وہ دوسرے صحابی کے پاس پہنچے تو تیسرے کی آواز آئی۔ انہوں نے اشارہ کیا کہ انہیں پانی پلاؤ۔ ادھر گئے تو وہ شہید ہوچکے تھے۔ لوٹے تو پہلے اور دوسرے صحابی بھی شہید ہوچکے تھے۔ جو لوگ قربانی و ایثار کے اس درجے پر فائز ہوں کہ موت کی سختی اور پیاس کی طلب بھی انہیں اپنے بھائی کی محبت سے غافل نہیں کرتی وہی مجاہد کے مرتبے پر فائز کیے جانے کے لائق ہیں۔ سورہ حشر کی آیت وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ [۹:۵۹] انہی نفوس کی شان میں اتری ہے۔ یہ وہ مجاہد ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے اپنے قلم سے ایمان ثبت کردیا ہے۔ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ

فِیۡ قُلُوۡبِهِمُ الۡاِیۡمَانَ وَاَیَّدَهُمۡ بِرُوۡحٍ مِّنۡهُ [۲۲:۵۸] جہاد کے لئے اس ایمان، یقین اور کردار کی ضرورت ہے اگر کوئی اس سے محروم ہے تو اپنے آپ پر اور اس امت پر رحم فرمائے اور میدان جہاد کی بجائے اپنے گھروں میں آرام کرے۔ جو لوگ تزکیہ نفس کے اس مقام پر ہوں وہی جہاد کے اہل ہیں اور جو لوگ انتقام اور ردعمل کی سطح سے اوپر ہی نہیں اٹھے وہ لشکر جہاد میں شامل ہونے کے اہل ہی نہیں ہیں۔

جہاد ایک نورانی و روحانی عمل ہے۔ یہ زمین پر قبضہ کرنے، سروں کے مینار کھڑے کرنے اور تسخیر فی الارض کے لئے نہیں یہ تسخیر قلوب انسانی کے لئے آیا ہے۔ اسی لئے دعوت اور جہاد کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جہاد سے دعوت میں توسیع اسی وقت ممکن ہے جب مجاہد کمال ضبط کے مقام پر کھڑا ہو اور میدانِ جنگ میں بھی غیض وغضب سے مغلوب نہ ہو۔ کسی کو قتل کرنا اور فناء کے گھاٹ اتارنا اس کے اختیار میں ہو لیکن اللہ کی خاطر وہ اس اختیار کو ترک کر دے۔ ضبط نفس کا یہ مقام اگر آ جائے تب یہ جہاد اور چمکتی ہوئی تلواریں میدان دعوت بھی بن جاتی ہیں۔ اسی لئے دین کا مقصد قتال فی سبیل اللہ کے ذریعے دعوت کا فروغ اور توسیع ہے۔ اسی لئے دین صلح کو جنگ پر ترجیح دیتا ہے لیکن اگر اہل دین پر جنگ مسلط کی جائے تو وہ بھرپور مقابلے کا حکم دیتا ہے کہ کفر کی قوت اور شان وشوکت کو توڑ دیا جائے اور زمین کو فتنہ وفساد سے پاک کر دیا جائے۔

....

مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَی الۡكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ (الفتح ۴۸:۲۹)

محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھی ہیں وہ کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔

سرقہ

تشکیل فہرست و تہذیب مقالہ: محمد علی جنید

سرقے کی روایت تاریخ وتحقیق کی روشنی میں

فارسی، عربی، اردو اور یورپی زبانوں میں سرقوں کی مختصر تاریخ

سید خالد جامعی

سرقہ، تصرف، افادہ، استفادہ، استفاضہ، اخذ، تقلید، نقل، توارد، یکسانیت، مشابہت، مطابقت، متحد الخیالی، متوازیات [Parallelism] اثر اور امثال سرقہ [نثر ونظم] سے متعلق مباحث علمی وادبی تواریخ کے خصوصی موضوع رہے ہیں۔ لیکن ان مباحث پر کوئی جامع کتاب کم از کم اردو زبان میں ابھی تک نہیں لکھی گئی، مولوی نجم الغنی خان کی بحر الفصاحت [۱]، رسالہ الناظر میں شائع شدہ دستاویز ''سرقہ کا دور مجیرہ'' [۲]، ناطق لکھنوی کا مضمون ''سرقہ و توارد'' [۳]، یگانہ کی ''غالب شکن'' [۴]، پنڈت برج موہن کیفی کا خطبہ ''نظر اور خوشنظری'' اور منشورات میں ''پہلے ایڈیشن پر نوٹ'' [۵]، عندلیب شادانی کے مضامین سرقہ اور توارد [۶] اور سرقہ یا چوری [۷] ممتاز لیاقت کی بکف چراغ دارد [۸] ان مباحث، اصطلاحات اور موضوعات کا جزوی احاطہ کرتے ہیں لیکن ان الفاظ کے مابین بال سے زیادہ باریک فرق کی تفصیلی وضاحت نہیں کرتے، ترجمہ سرقے میں شامل نہیں اگر ترجمے کا اعتراف کرلیا جائے مگر متقدمین متوسطین اور اکابرین کسی نے بھی ترجمے کا اعتراف نہیں کیا اگر اخذ و استفادہ یا استفاضہ کا اعتراف کرلیا جائے جیسے اقبال کی بیشتر نظموں کے آغاز میں ملتا ہے۔ تو

نوٹ: فارسی اشعار اور جملوں کی تصحیح جدید ایرانی فارسی کے املا کے اصولوں کے مطابق انجام پائی ہے۔

سرقہ کا داغ دھل سکتا ہے مگر یہ اسی وقت ممکن ہے جب داغ کو داغ سمجھا جائے، داغ اور اجلا پن مترادف ہو جائیں تو اعتراف گناہ بدتر از گناہ ہو جاتا ہے۔

توارد کم سرقہ بیشتر:

شاعری میں سرقہ اور توارد بالعموم مترادف الفاظ سمجھے جاتے ہیں حالانکہ ''شاعری میں توارد کم اور سرقہ بیشتر ہے''۔ عموماً قدماء نے شاعری میں سرقے کا داغ توارد کے لفظ سے مٹانے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ سرقے اور توارد میں زمین آسمان کا فاصلہ ہے۔ یہ فاصلہ سارق کی نظر میں بہت کم اور ناقد کی نظر میں بہت زیادہ ہوتا ہے۔ سارقین اور ان کے حاشیہ برداروں نے اپنے دفاع میں ہمیشہ سرقے کو توارد قرار دیا لیکن عامۃ الناس نے توارد کو سرقے کا مترادف یا متبادل کبھی تسلیم نہ کیا۔

اردو زبان نے شاعری کا رنگ ڈھنگ، سانچہ، ڈھانچہ طور اطوار، طریقے سلیقے، اصطلاحات تراکیب، حتیٰ کہ مضامین بھی فارسی سے لیے لہٰذا فارسی کی تمام خوبیاں اور خامیاں بھی اردو شاعری کے ضمیر اور خمیر میں داخل ہو گئیں۔ فارسی کے اثرات سے سرقے اور کثرت توارد کی روایت بھی اردو شاعری کا مزاج بن گئی۔ ہمارے متقدمین، متاخرین اور اکابرین میں کوئی ایسا نہیں جس کے کلام سے مال مسروقہ برآمد نہ کیا جا سکے۔

سرقے کے دفاع میں:

سارقین کے دفاع میں بعض نادر نکتے بھی پیدا کیے گئے۔ مثلاً

''دنیا میں ہر شاعر کم و بیش سرقہ کے الزام سے متہم ہو چکا ہے کیوں کہ وہی انتقال علم و خیال ہے جو مختلف پہلوؤں سے مختلف نام رکھتا ہے۔ سرقہ اخذ، نقل، تقلید، ترجمہ، اخذ میں اگر مضمون بہتر نظم ہو جائے یا اس میں بہترین اضافہ ہو جائے یا کوئی اور خوبی ایسی پیدا کر دی جائے جو اصل میں نہ ہو تو ایسا اخذ قابل تعریف ہے۔ اردو زبان کی ابتداء میں بکثرت اشعار و مضامین ترجمہ اور نقل کیے گئے ہیں اس کا سلسلہ ولی گجراتی سے غالب تا حال تک رہا۔[۹]

پنڈت کیفی کے مطابق ''نقد ونظر کی جو درگت اردو میں دیکھی جاتی ہے نقد ونظر کی محتاج نہیں یہ عام کیفیت ہے جو صرف معدودے چند کی مستثنیات ہستی تسلیم کرنے کی اجازت دیتی ہے۔

اسی ضمن میں سرقہ اور اس کے ملحقات کا الزام بھی آ جاتا ہے جن کا قلم یہ فردِ قرارداد ہمارے بہترین شعراء کے خلاف مرتب کرتا ہے۔ وہ حضرات علم نفسیات اور تاریخ سے بے بہرہ ہیں۔ وہ نہیں جانتے کہ جب تہذیب اور کلچر ایک ہو شاعری کا میدان اپنی تنگی یا وسعت میں ایک سا ہو۔ جب تحسینِ کلام کا معیار اور طرز ادا نہ صرف یکساں بلکہ ایک دوسرے سے ماخوذ ہو اور ان مسلمہ عوارض میں شاعری کی بنیاد محض تخیل ہو تو تخیل اور مضامین میں مساوات کا ہونا لابد ہے۔ اب اسے چاہے کوئی سرقہ کہے یا ترجمہ، تصرف کہے یا توارد۔''

پریوی کونسل میں سرقہ کا مقدمہ:

پنڈت کیفی اپنے موقف کی وضاحت میں لکھتے ہیں ''اس مقام میں ایک خاص نظیر پیش کیے بغیر نہیں رہ سکتا وہ ہے ایک دیوانی کا مقدمہ کاپی رائٹ [حقوق تصنیف] سے متعلق جو لندن کی پریوی کونسل تک پہنچا۔ مقدمہ کے کوائف آل انڈیا رپورٹر فروری ۱۹۳۲ء مطبوعہ ناگپور میں ملاحظہ ہوں۔ یہاں صرف اس قدر بتایا جائے گا کہ مدعی کا دعویٰ یہ تھا کہ نامور مصنف ایچ جی ولز نے اپنی مشہور عالم کتاب '' آوٹ لائنز آف دی ہسٹری آف دی ورلڈ'' میں مدعی کے مسودہ کتاب سے سرقہ بالجبر کیا ہے۔ پریوی کونسل نے دعویٰ خارج کرتے ہوئے یہ قرار دیا کہ جب دو شخص ایک ہی موضوع پر لکھنے بیٹھیں تو تصنیف وتالیف کا مسالہ، سند، جستجو یعنی ریسرچ کے ذرائع اور طرز بیان یکساں اور ایک ہی ہوں گے۔ اس فیصلہ کا بغور مطالعہ اور اس کے استدلال کا تجزیہ ہمارے بہت سے تنقید کے شیدائیوں کی آنکھیں کھولے گا۔ اور سلف وعہد حاضر کے کئی اچھے شاعروں کے نام پر سے سرقہ کا داغ دھو ڈالے گا۔[۱۰]

سرقہ وتوارد:

سرقے اور توارد میں فرق کرنے کے لیے پنڈت کیفی نے ''پریوی کونسل'' کے فیصلے کو سند کے طور پر پیش کیا ہے جو وزنی دلیل نہیں۔ پریوی کونسل کی یہ دلیل کہ طرز بیان یکساں ہوگی سراسر غلط نامعقول اور نا قابل قبول دلیل ہے۔ ہر فرد کا طرز بیان الگ الگ ہوتا ہے خواہ ان تمام افراد کے ماخذات اور طریقہ تحقیق یکساں ہو۔ تاریخ اسلام سے اقبالؔ، شبلیؔ، حالیؔ اور حفیظؔ جالندھری نے بے شمار مضامین و واقعات نظم کیے ہیں۔ لیکن چاروں کے منظومات بغیر نام کے رکھ دیے جائیں تو پڑھنے والا خود بول اٹھے گا کہ یہ نظم کس شاعر کی ہے۔ ہر شاعر اپنی آواز سے پہچانا جاتا ہے یہ آواز اس کی انفرادیت قائم کرتی ہے۔ یہ انفرادیت ختم ہو جائے تو ادب و شاعری کا چمن سونا ہو جائے۔ علامہ کیفی یہ بھول گئے کہ درحقیقت اردو شاعری میں توارد کمتر اور سرقہ بیشتر واقع ہوا ہے۔[۱۱]

سرقہ اور توارد کے درمیان اگر قطعی فیصلہ دشوار ہے لیکن یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ نفس خیال میں تو توارد کا بہت امکان ہے لیکن مضمون کے علاوہ دونوں شاعروں کا پیرایہ بیان بھی یکساں ہو اور تشبیہ، واستعارہ بھی جوں کا توں ہے۔ یہ بات تقریباً ناممکن ہے ایسی صورت میں توارد کی بہ نسبت سرقے کا امکان زیادہ ہے،[۱۲]

پنڈت کیفی کے خیال میں ''یہ صحیح ہے کہ محض نقالی یا سرقہ یا توارد یا فرسودگی کا خطرہ غزل میں بہ نسبت نظم کے زیادہ ہوتا ہے لیکن میں پوچھتا ہوں کہ ملتے جلتے مضامین یا متوازیات کس ادب اور کس زبان کی شاعری میں نہیں۔ مضمون میں مشابہت ہونا اور چیز ہے اور فرسودگی پامالی یا سرقہ بالکل دوسری چیز ہے۔''[۱۳]

سرقے کا دفاع کرتے ہوئے مطابقت خیال، یکسانیت مضمون، یا متوازیات [Parallelism] کی خوبصورت اصطلاحات سے سرقے کو توارد ثابت کرنے کی کوشش کی گئی۔ لیکن سرقہ بہر حال سرقہ ہے توارد نہیں۔

شعرائے اردو میں شاید ہی کوئی شاعر ایسا نکلے جس نے بہ قدر استعداد فارسی شعراء کے کلام سے استفادہ نہ کیا، ہو استفادہ بجائے خود کوئی بری چیز نہیں لیکن بدقسمتی سے حضرات شعراء دوسروں کے افکار و مضامین کو اپنا زادۂ طبیعت بنا کر پیش کر رہے ہیں۔[۱۴]

علامہ تفتازانی نے مطول میں لکھا ہے کہ سرقے کا حکم اسی حالت میں لگایا جا سکتا ہے جب یہ امر یقینی ہو کہ ایک شخص نے دوسرے کا مضمون لیا ہے ورنہ اسے توارد کہنا چاہیے۔[۱۵]

علامہ غلام علی آزاد بلگرامی ''مآثر الکرام'' میں ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر تحقیق کی جائے تو شاید ہی کوئی ایسا شاعر ملے جو توارد مضامین سے بچ گیا ہو اور وجہ اس کی یہ ہے کہ تمام معلومات کا احاطہ فقط ذات باری کے لیے مخصوص ہے۔شاعر تو اندھیرے میں تیر چلاتا ہے۔ اسے کیا خبر کہ جو مضمون اس نے باندھا ہے وہ بالکل اچھوتا ہے یا پہلے کہیں بندھ چکا ہے۔[۱۶]

ابو طالب کلیم نے خوب کہا ہے کہ:

منم کلیم بہ طور بلندی ہمت

کہ استفادۂ معنی جز از خدا نکنم

ترجمہ: میں بلندی ہمت کے طور پر کلیم ہوں۔خدا کے سوا اور کسی سے استفادۂ معنی نہیں کرتا۔

بہ خوان فیض الٰہی چو دست رس دارم

نظر بہ کاسۂ دریوزۂ گدا نکنم

ترجمہ: چوں کہ فیض الٰہی کے خوان تک میری رسائی ہے اس لیے میں فقیر کے کشکول پر نظر نہیں ڈالتا۔

ولی علاج توارد نمی توانم کرد

مگر زبان بہ سخن گفتن آشنا نکنم

ترجمہ: لیکن توارد کا میرے پاس کوئی علاج نہیں اس کے سوا کہ میں شعر ہی نہ کہوں۔[۱۷]

سرقے کے دفاع میں غالب کا سرقہ:

غالباً مرزا غالب پر بھی لوگ سرقے کا الزام لگاتے تھے اور چوں کہ وہ کوئی قطعی ثبوت اس امر کا پیش نہیں کر سکتے تھے کہ ان کے یہاں سرقہ نہیں بلکہ توارد ہے۔اس لیے انھوں نے اپنے مخصوص فکاہی انداز میں ایک ایسی بات کہی جس نے سرقے اور توارد کا جھگڑا ہی مٹا دیا۔بلکہ الٹا متقدمین کو سرقے کا مجرم بنا دیا۔چناں چہ فرماتے ہیں:

هزار معنی سر خوش، خاص نطق من است

کز اهل ذوق دل و گوی از عسل برده است

ترجمہ: ہزاروں بلند معانی، خاص میرا حصہ ہیں جنھوں نے اہل ذوق کا دل چھین لیا ہے اور جو شیرینی میں شہد سے بھی بڑھ گئے ہیں۔

زرفتگان به یکی گر توارد م رو داد

مدان که خوبی آرایش غزل برده است

ترجمہ: اگر اگلے لوگوں میں سے کسی کے ساتھ مجھے توارد ہو گیا تو یہ نہ سمجھو کہ اس سے غزل کے حسن میں بٹا لگ گیا۔

مراست ننگ ولی فخر اوست کان به سخن

به سعی فکر رسا جا بدان محل برده است

ترجمہ: یہ بات میرے لیے باعث ننگ ہے لیکن اس کے لیے باعث فخر ہے کہ وہ اپنی فکر رسا کی کوشش سے اس مقام تک پہنچ گیا جہاں میری رسائی ہوئی ہے۔

مبر گمان توارد یقین شناس که دزد

متاع من ز نهان خانهٔ ازل برد است

[تو اروکا گمان نہ کرو بلکہ یقین جانو کہ چور میرا مال خزانہ ازل سے چرا لے گیا][۱۸]

متقدمین نے غالب کے مضامین چرا لیے:

یعنی متقدمین کے بعض مضامین اگر غالب کے یہاں پائے جائیں تو یہ سمجھنا چاہیے کہ درحقیقت یہ مضامین ازل میں غالب ہی کے حصے میں آئے تھے۔ وہ لوگ [یعنی متقدمین] وہیں سے چرا لے گئے۔ اب اگر غالب نے مضامین کو اپنے نام سے پیش کیا تو کیا گناہ کیا کیوں کہ دراصل وہ غالب ہی کا مال تھے۔ چوری اور سینہ زوری کی ایسی مثالیں ادبیات میں بہت کم ملیں گی لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ غالب کے تینوں شعروں کے مضامین بھی ان کے تخیل کا کمال نہیں بلکہ ملا حسن واعظ کاشفی کی ایک کتاب "لطائف الطوائف" میں بیان کردہ ایک واقعہ کا سرقہ ہیں۔ ملا کاشفی نویں صدی ہجری کے ایرانی مصنفین میں ایک ممتاز درجہ رکھتے ہیں اور "انوار سہیلی" کی بدولت عالم گیر شہرت کے مالک ہیں۔ غالب نے مُلا کی اس حکایت کو شعر کے سانچے میں کفنا دیا ہے۔ ملا کاشفی لکھتے ہیں:

مولانا مظفر در زمان ملکان هرات قصیده گوی زبردست بوده و در اشعار تتبع خاقانی می کرد. در مدح ملک معزالدین حسین قصیدهٔ غرّا گفته. روزی قصیده بر ملک می خواند چون بدین بیت رسید:	شاہان ہرات کے عہد میں مولانا مظفر ایک زبردست قصیدہ گو تھے اور اشعار میں وہ خاقانی کا تتبع کرتے تھے۔ انھوں نے معز الدین حسین، بادشاہ ہرات کی مدح میں ایک شاندار قصیدہ لکھا۔
زیر قدر قدر او نه قبهٔ خضرا و خور	ایک دن وہ قصیدہ بادشاہ کو سنا رہے تھے۔
تو دهٔ ای چند از رماد است و	جب اس شعر پر پہنچے،
درخشان اخگری	"یہ آسمان کے نو گنبد اور آفتاب ممدوح کے
ملک بوی تعرض کرده و گفت این	مرتبے کے سامنے ایسے ہیں جیسے راکھ کے
را خاقانی در قصیده گفت. خاقانی:	

چیست مهر و سپهر با قدرش	چند ڈھیر اور ان میں ایک دہکتی ہوئی
اخگری درمیان خاکستر	چنگاری"۔ بادشاہ نے ٹوکا کہ یہ مضمون تو
مولانا بهم برآمد و منفعل شد و	خاقانی نے ایک قصیدے میں باندھا ہے"
گفت "این معنی از من برده" ملک	ممدوح کے مرتبے کے مقابلے میں آسمان
حسین گفت "ایں سخن چون	اور سورج ایسے ہیں جیسے راکھ کے اندر
راست آید و حال آن که خاقانی	چنگاری" مولانا مظفر چڑھ اور جھینپ کر
عمر ها پیش از تو وفات یافته"	بولے کہ "خاقانی نے یہ مضمون میرا چرایا
مولانا گفت "ای ملک معانی را که	ہے" بادشاہ نے کہا یہ کیوں کر ممکن ہے۔
در ازل از مبدا فیاض متوجه روح من	خاقانی تو آپ سے پہلے گزرا ہے"۔ مولانا
بود خاقانی آن را دزدیده بنام خود	نے کہا حضور والا! بات یہ ہے کہ جو مضامین
کرده. ملک بخندید و بران قصیده	ازل میں خدا کی طرف سے میرے لیے
مولانا را صله لایق داد	مخصوص ہوئے تھے خاقانی نے
	انھیں چرا لیا اور اپنے نام سے منسوب کر
	دیا" بادشاہ ہنس پڑا اور اس قصیدے پر
	مولانا کو معقول انعام دیا۔[۱۹]

غالب کا سرقہ ثابت شدہ ہے:

غالب نے سرقہ کیا اور سرقے کی توجیہہ پیش کرنے کے لیے خیال آفرینی فرمائی تو اس کے لیے بھی مولانا مظفر کے دلائل کا سرقہ کر کے شعروں میں سمو دیا۔

غالب کی یہ دیدہ دلیری کہ ان کے مضامین ان سے پہلے آنے والوں نے چرا لیے ہیں محض شاعرانہ تعلّی کے سوا کچھ نہیں، اس تعلّی کے باوجود ان کا سرقہ ثابت شدہ سرقہ ہے۔ اسے توارد سمجھنا محض غالب پرستی ہے۔ مشفق خواجہ کی روایت کے مطابق ماہنامہ اردو زبان

میں شمیم احمد نے غالب کے پانچ سو سرقہ شدہ اشعار پر مضمون لکھا۔ یہ مضمون سردست سامنے نہیں ہے لیکن مولانا حسن مثنیٰ ندوی کی بیاض ہماری تحویل میں ہے جس میں غالب کے تین سو اردو و فارسی اشعار کا بیدل سے سرقہ ثابت کیا گیا ہے۔ یہ بیاض جلد شائع ہوگی۔

ناطق کی عجیب وغریب دلیل:

سرقے کے دفاع میں ایک زبردست دلیل ناطق لکھنوی نے پیش کی ہے۔

''اگر چہ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شاعر تمام دنیا کے شعراء کا کلام دیکھے اور یاد رکھے مگر چوں کہ یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ جب کوئی شعر شائع اور مشہور رہے تو اس سے سرقہ کیا گیا ہوگا۔ اس لیے صفائی ممکن نہیں اور یہی وجہ ہے کہ کوئی شاعر اس اتہام سے بری نہ ہوسکا...... اردو زبان میں شاعری کی ابتداء بھی اسی طرح ہوئی کہ فارسی اشعار کے بکثرت ترجمے کیے گئے لہٰذا اگلے زمانے کے شعراء اس امر میں قابل اعتراض نہیں ہیں اور جس طرح اُس زمانے کی بہت سی باتیں متروک ہوگئی ہیں یہ بات بھی ترک کر دی گئی ہے اور اب عیوب میں داخل ہے۔ [۴۰]

میں سرقہ یا توارد یا اخذ یا تقلید یا نقل و ترجمہ کے تنوعات دکھا کر ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ عیب جس طرح غیر مادی ہیں الزام بھی غیر مادی اور غیر مدلل ہے لہٰذا چند وجوہ سے اس قصور کو عیوب شعر سے خارج کر دینا چاہیے اور ان مختلف الاثر صورتوں کو سرقہ کے تحت میں لا کر کسی کی تشہیر کرنا زیبا نہیں جیسا کہ آج کل اس قسم کے مضامین بہ کثرت شائع ہو رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس عیب سے دنیا میں کوئی شاعر خصوصاً متاخرین میں سے ایک بھی نہیں بچ سکتا اس کو عیب ہی نہ کہنا چاہیے۔ جس عیب سے دنیا میں کوئی شاعر خصوصاً متاخرین میں سے ایک بھی بچ نہیں سکتا اس کو عیب ہی نہ کہنا چاہیے۔ اکثر مذاہب میں یہ عقیدہ ہے کہ گو ہر انسان گناہ گار ضرور ہوتا ہے، مگر نیکی و بدی کا توازن اور اندازہ بھی ہوگا جس کی برائیاں وزن میں زیادہ ہوں گی وہی قابل سزا و ملامت ٹھہرے گا۔ یہاں یہ ہے کہ الزام سرقہ ہر شاعر پر عائد ہو سکتا ہے اور اس کی تمام خوبیوں پر پانی پھر جاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو شاعری میں اتنے قیود ہیں کہ دنیا کی کسی شاعری میں اتنی جکڑ بندیاں نہیں، اس لیے عیوب و اغلاط اور نقائص کا کچھ شمار ہی نہیں۔ ان سب پر طرہ یہ کہ اور عیبوں سے اگر بچ گیا تو سرقہ کے الزام سے بری نہیں ہو سکتا تو شعر کہنا کیا ہوا کہ اٹھارہ ہزار عالموں کا عذاب میں گرفتار ہونا ہوا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جس قدر مادہ نکتہ چینی اور تنگ دلی کا ہے کسی اور ملک میں نہیں۔ یہاں ایسے نقادوں کے لیے اسلحہ کی فراوانی پیدا کرنا مظالم کا ایک مینہ برسانا ہے۔ چوتھی وجہ یہ ہے کہ جب سرقہ کا ملزم مشتبہ ہے اور توارد کا امکان کئی صورتوں سے ہے۔ مثلاً شعر نہیں دیکھا یا دیکھا اور سنا تو مگر یاد نہیں رہا تو اس شبہ کا فائدہ ملزم کو ملنا چاہیے۔

پانچویں وجہ ان سب سے بڑی یہ ہے کہ تمام دنیا کے اشعار کا علم ہونا اور پھر سب کو یاد رکھنا خصوصاً شعر کہنے کے وقت جب کہ شاعر ایک ایسے وجدان کی حالت میں ہوتا ہے جس کو انتہائی ہوشیاری اور انتہائی بے ہوشی کا بین بین کہنا چاہیے۔ ناممکن اور قوتِ انسانی سے باہر ہے اور شاعری جب کہ ایک ہی اصول پر اور ایک ہی منزل پر پہنچتی ہے تو پھر توارد نہ ہونا امر فطری کے خلاف ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ لاکھوں آدمی ایک ہدف پر اپنے اپنے تیر مختلف مقامات سے پھینکیں اور کوئی تیر بھی ایک نقطے پر نہ بیٹھیں۔ میرے خیال میں ناوک خیال کا متحد الوقوع ہو جانا ایک اقعہ نا گزیر ہے۔[۲۱]

اس دلیل کو ''مدلل مداحی'' کے سوا کوئی نام نہیں دیا جا سکتا، ناطق یہاں سخن فہم بننے کے بجائے سارقین کے طرف دار بن گئے ہیں۔ ناقد فریق بن جائے تو اس کا نقد عقیدہ بن کر ایک خاص طبقے کی ترجمانی بن جاتا ہے۔ ان دلائل کی روشنی میں ناطق نے ہر شاعر کو سرقہ کی اجازت عام عطا کر دی ہے۔ کثرت گناہ، گناہ کو گناہ کے زمرے سے خارج نہیں کر سکتا۔ یہ فلسفہ تو مغرب کا ہے جس کی بنیاد جمہوریت اور جمہور کے اکثریتی فیصلے پر رکھی گئی ہے کہ کثرت رائے سے حق و باطل کا تعین خود کیا جا سکتا ہے اصلاً کوئی چیز خیر یا حق نہیں ہے انسانوں کی

اکثریت جس نقطہ نظر کو قبول کرے وہی خیر یا حق ہے۔ یہ خیر اور حق ہر زمانے میں حالات و زمانہ کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے، خیر مطلق یا مطلق حق کوئی چیز نہیں ہے۔ مگر شاعری میں مغربی جمہوری رویہ تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔

اعلیٰ درجے کا چور یا با کمال شاعر:

دنیا بھر کے شعراء، محققین اور ناقدین کا اجماع ہے کہ چوری میں کمال شاعر کو سارق کے اسفل ترین درجے سے اٹھا کر باکمال شاعر کے اعلیٰ ترین درجے تک پہنچا دیتا ہے۔

ارباب فن کا اس امر پہ اتفاق ہے کہ اگر کوئی شاعر دوسرے کا مضمون لے کر ایسا شعر کہے کہ پہلے شعر سے بڑھ جائے تو پھر یہ سرقہ مورد ملامت نہیں بلکہ سزاوار تحسین ہے [۲۲] چناں چہ مولانا جامی نے بہارستان میں سلمان ساوجی کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"سلمان ساوجی نے دوسرے اساتذہ خصوصاً کمال اسماعیل کے اکثر مضامین کو اپنے اشعار میں باندھا ہے۔ چوں کہ سلمان کے اشعار حسن وخوبی میں اپنے اصل سے بڑھ گئے ہیں اس لیے وہ قابل ملامت نہیں۔ قطعہ:

معنی نیک بود شاهد پاکیزه بدن

که به هر چند درو جامه دگر گون پوشند

ترجمہ: خوبصورت مضمون ایک پاکیزہ بدن شاہد کے مانند ہے۔ چاہے اسے کیسا ہی لباس پہنا دیں۔

کسوت عار بود، باز پسین خلعت او

گر نه در خویش از پیشتر افزون پوشند

ترجمہ: اب اگر دوسرا لباس پہلے لباس سے بہتر نہیں ہے تو یہ دوسرا لباس اس کے

لیے باعث ننگ و عار ہے۔

ھنر است این کہ کھن خرقۂ پشمین زیرش

بدر آرند و درو اطلس و اکسون پوشند

[یہ بھی ایک ہنر ہے کہ اس کی کمبل کی گدڑی اتار کے، اسے ریشم واطلس کے کپڑے پہنادیں] ۔[۲۳]

اسی خیال کو علامہ آزاد بلگرامی نے ایک شعر میں نظم کردیا ہے اور وہ یہ ہے:

شاھد معنی کہ باشد جامۂ لفظش کھن

نکتہ دانی گر حریر تازہ پوشاند خوش است

[شاھد معنی جس کا جامۂ الفاظ پرانا ہو، اگر کوئی نکتہ سنج اسے ریشم کا نیا لباس پہنا دے تو کیا کہنا:

لہٰذا اگر یہ امر تحقیق بھی ہوجائے کہ ایک شخص نے دوسرے کا مضمون لیا ہے تب بھی ملامت میں عجلت خوب نہیں ۔[۲۴]

خوبصورت چوری عیب نہیں:

پہلے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ زیر بحث شعر حسن وخوبی میں اپنی اصل سے بڑھ گیا یا نہیں ۔اگر بڑھ گیا تو یقیناً قابل تعریف ہے۔ مستحق ملامت نہیں ۔آخر اس نے کچھ تو اضافہ کیا۔ دنیا کی ہر چیز میں ترقی کا یہی اصول کارفرما ہے اور شعر بھی اس کلیے سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا ۔[۲۵]

سرقہ صنعت شعری ہے:

عبدالوسع ہانسوی نے اپنے رسالے میں سرقے کے عیب کو صنعت سرقۂ شعری لکھا ہے،سبحان اللہ یہ کیا عمدہ صنعت ہے کہ دوسرے کا شعر یا مضمون یا الفاظ چرالیں ۔[۲۶]

سرقے کے جواز میں پیش کیے گئے دلائل نے شاعروں کا خون بڑھایا اور سرقے

کی رسم، اردو شاعری اور نثر سے آکاس بیل کی طرح چمٹ گئی۔

اعلیٰ درجے کا چور با کمالوں میں شامل ہو جاتا ہے لیکن اگر سارق درجہ کمال تک پہنچنے میں دو چار ہاتھ رہ جائے تو وہ اول درجے کا سارق نقال اور قابل گردن زدنی بن جاتا ہے۔شعر و شاعری کی دنیا ایک الگ دنیا ہے۔اس کا دستور بھی سب سے نرالا ہے۔سرقے کی بہ حسن و خوبی تکمیل پر اعزاز فضیلت عطا ہوتی ہے۔یہ کام احسن طریقے پر تکمیل پذیر نہ ہو سکے تو خلعت واپس لے لیا جاتا ہے اور اسے بدترین چور اور اس کی شاعری کو بدترین سرقہ قرار دیا جاتا ہے۔[۲۶]

سرقے کی اقسام

سرقے کی دو اقسام ہیں سرقہ ظاہر اور سرقہ غیر ظاہر ان کی ذیلی اقسام بھی ہیں۔ حکیم نجم الغنی خان نے بحرالفصاحت میں ان اقسام کی تفصیل تحریر کی ہے جو ذیل میں درج ہے:

سرقہ ظاہر

۱۔ سرقہ ظاہر وہ ہے کہ اگر دونوں شعروں کو کسی عاقل کو سنایا جائے تو وہ حکم لگا دے کہ ان میں سے ایک اصل دوسرا بشرطیکہ اس لفظ کو جو غرض و وصف پر دلالت کرتا ہو تمام آدمی نہ جانتے ہوں ایک انتحال و نسخ یعنی کسی کے کلام کو بغیر اختلاف و معانی کے اپنا کر لیں غالب کے یہاں ایسی مثالیں بہت ہیں۔[۲۷] پروفیسر شمیم احمد مرحوم نے غالب کے ایسے سو مصرعوں کی نشاندہی قومی زبان کے "غالب نمبر" میں کی ہے جو غالب سے سو برس پہلے کے شاعر فغاں دہلوی کے یہاں من و عن ملتے ہیں۔قومی زبان غالب نمبر دو، جلد سر دست حوالہ میسر نہیں۔

۲۔ دوسری قسم سرقے کی مسخ اور اغارہ ہے یہ اسے کہتے ہیں کہ کسی شخص کے کلام کے تمام لفظ و معنی لے کر صورت کلام کی بدل دیں یعنی ترکیب الفاظ میں تغیر و تبدل کر دیں یا بعض الفاظ لیں تمام الفاظ نہ لیں۔[۲۸]

۳۔ تیسری قسم سرقے کی سلخ اور المام ہے یعنی پرائے مضمون ومطلب کو اور الفاظ میں باندھنا اس کے الفاظ چھوڑ دینا۔[۲۹]

سرقہ غیر ظاہر:

ڈاکٹر عندلیب شادانی کی تحقیق کے مطابق سرقۂ غیر ظاہر اسے کہتے ہیں کہ اگر دو شاعروں کے شعر کسی عاقل کو سنائے جائیں تو وہ ان کے سننے کے بعد اس بات کا حکم کرنے میں کہ ایک کی اصل دوسرا ہے تامل وغور کی طرف محتاج ہو اگرچہ سرقۂ غیر ظاہر میں بھی پہلے شاعر کے معنی دوسرا شاعر لیتا ہے لیکن اس میں یہ بات مخفی ہوتی ہے کہ دوسرے نے پہلے سے معنی لیے ہیں، بخلاف سرقۂ ظاہر کے اس میں یہ امر خوب ظاہر ہوتا ہے کہ پہلے معنی سے دوسرے معنی لیے گئے ہیں اور اس کی پانچ قسمیں ہیں۔[۳۰]

ایک قسم یہ ہے کہ کوئی شاعر ایسا شعر لکھے کہ اس کا مضمون دوسرے شاعر کے شعر سے مشابہت رکھتا ہو اور شاعر ماہر وہ ہے کہ مشابہت کے اخفا میں کوشش کرے اس طرح کہ شعر کی زمین بدل دے اور مضمون بھی بدل دے اس طرح کہ اگر پہلے کا شعر مدح میں ہو تو ہجو میں لکھے اور اگر پہلے کا شعر مرثیے میں ہو تو تہنیت کے موقع پر لائے۔

تیسری قسم سرقہ غیر ظاہر کی یہ ہے کہ کسی خاص مضمون کو ایک محل سے دوسرے محل میں نقل کریں یعنی وہ خاص مضمون ایک شاعر نے کسی اور موقع پر لکھا تھا دوسرا اس کو کسی اور موقع پر لائے۔

چوتھی قسم سرقہ غیر ظاہر کی یہ ہے کہ ایک شاعر کا کلام دوسرے شاعر کے کلام کی ضد ہو۔

سرقہ غیر ظاہر کی قسمیں بلغا کے نزدیک مقبول ہیں بلکہ سرقے کا اطلاق ان پر ناروا ہے۔[۳۱]

سرقہ وتوارد:

''یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جب تک پورا پورا حال معلوم نہ ہو جائے تب تک سرقہ

نہ کہیں اور یہی حال ہماری مثالوں کا ہے چناں چہ علامہ تفتازانی نے مطول میں لکھا ہے کہ سرقے کا حکم اس وقت کرنا چاہیے جب کہ ثانی کا اخذ اول سے یقینی ہو ورنہ سرقے کے احکام مترتب نہیں ہو سکتے۔ توارد کے قبیل سے ہوگا اور جس صورت میں کہ ثانی کا اخذ اول سے معلوم نہ ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ فلاں شاعر نے یوں کہا ہے اور دوسرے نے سبقت کر کے اس طرح پایا ہے کیوں کہ اس حسن تعبیر سے فضیلت صدق کی ہاتھ سے نہ جائے گی اور علم غیب کے دعوے اور غیر کی طرف نقص کی نسبت کرنے سے بھی محفوظ رہے گا۔ اگر نظر تفتیش سے ملاحظہ کیا جائے تو توارد مضامین سے خالی کم شاعر پائے جائیں گے اس لیے کہ احاطہ جمیع معلومات کا علم الٰہی کا خاصہ ہے۔ معنی نگار کا خامہ اندھیرے میں تیر چلاتا ہے کیا جانے کہ صید وارستہ ہے یا بال و پر بستہ ہے۔ کلیم نے خوب گوہر انصاف پروئے ہیں۔

منم کلیم بہ طور بلندی ہمت　　　که استفادهٔ معنی جز از خدا نه نکنم

بخوان فیض الٰهی چو دسترس دارم　　　نظر بکاسۂ دریوزنه گدا نه نکنم

ولی علاج توارد نمی توانم کرد

مگر زبان به سخن گفتن آشنا نکنم

ملحقات سرقہ:

بحث سرقہ کے ملحقات میں سے تضمین اور اقتباس اور عقد وحل ہوا اوران کے سرقہ کے ملحق ہونے کی یہ وجہ ہے کہ ان میں بھی کلام سابق کے معنی کو کلام لاحق میں داخل کیا جاتا ہے۔

تضمین اور سرقہ:

تضمین اسے کہتے ہیں کہ ایک شاعر دوسرے شاعر کا پورا شعر یا مصرع کا ٹکڑا لے کر اپنے کلام میں باندھے اور اس کا نام بھی لکھ دے اور اس طرح نام لے دینے سے کوئی سرقے کا گمان نہیں کرتا، کبھی پورے شعر اور اس سے زائد کی تضمین کو استعانت کہتے ہیں اور مصرع

اور مصرع سے کم کی تضمین کو ایداع اور رفو بولتے ہیں اور اگر تضمین میں تھوڑا سا تصرف بھی کر دیا جائے تو مضائقہ نہیں مگر تغیر کثیر مضر ہے کیوں کہ تضمین سے نکل کر حد سرقہ میں داخل ہو جائے گا۔ [بحر الفصاحت ص ۱۲۸۲ تا ۱۱۵۴]

سرقے کی بدترین قسم:

سب سے بدترین صورت سرقہ کی یہ ہے کہ مضمون یا کوئی چیز لینے کے بعد بھی شعر اس کے برابر نہ ہو سکے بلکہ ترجمہ اگر ناقص ہے تو سرقہ کے برابر ہے۔ آتش نے ایک شعر میں سرقۂ شعری کی برائی کی ہے اور شاید روئے سخن ناسخ کی طرف ہے کیوں کہ ناسخ سرترجمے کیا کرتے تھے اور آتش کا یہ رنگ نہ تھا۔

مضموں کا چور ہوتا ہے رسوا جہان میں چکھی خراب کرتی ہے مال حرام کی آتش [۲۸]

چوروں کے ضمن میں نقادانِ سخن کے رویے اس نادان کی یاد دلاتے ہیں جو خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کامیاب ہو جائے تو بامراد ہوتا ہے اور اگر کوشش ناکام ہو جائے تو تعزیرات پاکستان کے تحت گرفتار کر کے فوجداری مقدمہ میں ماخوذ کر لیا جاتا ہے۔ اسے مرنے کی صورت میں کوئی سزا غالباً اس لیے نہیں دی جاتی کہ موت خود سب سے بڑی سزا ہے۔ زندہ بچنے کی صورت میں سزا شاید اس لیے دی جاتی ہے کہ مرنے کی تیاری بھرپور طریقے سے کیوں نہیں کی تھی لہٰذا سزا بھگتو۔ ادب اور ضابطہ فوجداری کے قواعد و قوانین مرتب کرنے والوں کی ذہنی مطابقت اور یکسانیت حیران کن ہے۔ [۲۹]

فارسی میں سرقے کی روایت:

مغلیہ سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی اردو شاعری فارسی کے غلبے سے آزاد ہونے لگی اور انگڑائی لے کر اپنی ادائیں دکھانے لگی، لیکن بنیادی طور پر اس کا سانچہ اور ڈھانچہ فارسی سے مستعار تھا لہٰذا سرقے کی روایت جو فارسی میں بہت مستحکم تھی اردو شاعری اور شعراء کے مزاج میں خود بخود دخیل ہو گئی۔

جامی اور انوری، علی حزین اور مولانا روم، تشبیہی کاشی اور مولانا جامی، حزین اور حیرتی خواجہ عزیز الدین کشمیری اور اثر شفیعائی شیرازی، بابا فغانی اور خسرو، نظیری نیشا پوری اور نصیر الدین چراغ دہلوی کے اشعار میں سرقے کی وارداتیں صاف نظر آتی ہیں۔ یہ مثالیں ایک دو نہیں ہزاروں ہیں اور صرف مضامین میں ہی نہیں بلکہ پورے پورے اشعار اور تمام و کمال غزلیں متوارد موجود ہیں۔[۳۰]

مکمل غزل کا سرقہ:

مثلاً ایک غزل جو خواجہ حافظ شیرازی کے بھی دیوان میں ہے اور سلمان ساؤجی کے کلیات میں بھی لفظ بلفظ جلوہ فرما ہے جس کا مطلع یہ ہے کہ:

زباغ وصل تویابد ریاضِ رضواں آب　　نہ تاب ہجر تو وارد شرارِ دوزخ تاب

فارسی شعراء کے سرقے:

مولانا جامی کا یہ شعر مشہور ہے:

جانِ تنِ فرسودہ را با غمِ ھجران گذاشت
طاقتِ مھمان نداشت خانہ بہ مھمان گذاشت

اور اب انوری کا شعر پڑھیے

مرا خدنگِ تو مھمان خانۂ بدن است
کسی کہ خانہ بہ مھمان گذاشت جانِ من است

علی حزین کا یہ مصرع مشہور ہے ”بہ پستاں آمدن خونِ جگر را شیر می سازد“
اور مولانا روم کا یہ مصرع کس کو یاد نہیں ہے ”مدتے بایست تا خوں شیر شد“
تشبیہی کاشی ایک لاجواب شاعر تھا اس کا شعر ہے:

کفِ پا بہ ھر زمینی کہ رسد تو نازنین را
بہ لبِ خیال بوسم ھمہ عمر آن زمین را

اور اسی مضمون کا شعر جو اس کا ماخوذ ہو سکتا ہے۔ مولانا جامی آج سے چار سو برس پہلے کہہ چکے ہیں:

چو نتوانم کہ بوسم لعلِ رخشش　　بہ ھر جا بگذرد بوسم زمین را

حزیں کا ایک ہم عصر حیرتی تھا دونوں کے شعر ملاحظہ ہوں:

حزیں:

ای وای بر اسیری، صیاد رفتہ باشد		دردام ماندہ باشد صیاد رفتہ باشد

حیرتی:

ماند در زلفِ تو دل وای بر آن صیدِ اسیر		کہ بدام افتد و از خاطرِ صیاد رود

خواجہ عزیز الدین کشمیری ثم لکھنوی کو کون نہیں جانتا، فارسی زبان اور قادر الکلامی میں ہر ایرانی ان کو جواب نہیں دے سکتا، ان کا ایک شعر نعت میں ضرب المثل ہے۔

دھد حق عشق احمد بندگانِ چیدۂ خود را

بہ خاصان شاہ می بخشدمی نوشیدۂ خود را

مگر ان سے دو سو سال پہلے آثر شفیعائی شیرازی جو کچھ کہہ گیا ہے وہ بھی سنیئے

دوستان راکسوتِ تجرید پوشاند خدا		شاہ می بخشد بہ خاصان خلعتِ پوشیدہ را

بابا فغانی کی بابت تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ وحشی، حکیم ثنائی، رکن مسیح، عرفی اور شفائی ایسے شعرا اس کے متبع اور مقلد تھے ان کا ایک مطلع ملاحظہ ہو:

خوبی ھمین کرشمہ و ناز و خرام نیست		بسیار شیوہ ھاست بتان را کہ نام نیست

اور اب خسرو کا بھی یہ شعر پڑھیے معلوم ہوتا ہے کہ اسی تخم کا وہ درخت ہے:

ورایِ حسن، بربروی تو چیزیست		کہ آن را کس نمی دا ندچہ نام است

نظیری نیشاپوری کے تعارف کی ضرورت نہیں، ایک شعر ملاحظہ ہو:

می گریم و از گریہ چو طفلم خبری نیست		دردل ھوسی ھست ندانم کہ کدام است

حضرت نصیر الدین چراغ دہلی جو کہ نظیری سے تقریباً دو سو برس پہلے تھے ان کا یہ شعر ہے:

گہ شادم و گہ غمگین از حال خودم غافل

گہ گریم و گہ خندم چون طفل بہ خواب اندر

ایسی ہزاروں مثالیں ہیں اور صرف مضامین ہی نہیں بلکہ پورے پورے اشعار اور

تمام و کمال غزلیں متوارد موجود ہیں ۔[۳۱]

تاریخ سے یہ بات بارہا ثابت ہے کہ توارد شاذ و نادر اور سرقہ اکثر و بیشتر واقع ہوتا ہے ۔اگر چہ سرقہ کرنے والا اپنی چوری کھل جانے کے بعد ہمیشہ اسے توارد ہی سے تعبیر کرتا ہے ۔

میر صاحب نے ولی دکنی کا ذکر کرتے ہوئے ''نکات الشعرا'' میں لکھا ہے کہ ''ولی دہلی بھی آئے تھے ۔جب وہ میاں گلشن صاحب سے ملنے گئے اور اپنے کچھ اشعار انھیں سنائے تو میاں صاحب نے فرمایا کہ فارسی کے یہ تمام مضامین بے کار پڑے ہوئے ہیں ۔انھیں اپنے ریختے میں نظم کرلو ۔کون تم سے باز پرس کرے گا''۔

ولی نے میاں گلشن صاحب کے اس مشورے پر کس حد تک عمل کیا ہمیں معلوم نہیں لیکن شعرائے اردو میں شاید ہی کوئی ایسا نکلے جس نے بقدر استعداد فارسی شعراء کے کلام سے استفادہ نہ کیا ہو حتیٰ کہ ہمارے مشاہیر اساتذہ بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ۔استفادہ بجائے خود کوئی بری چیز نہیں ۔[۳۲]

شعرائے اردو میں فارسی زبان سے طبعی مناسبت اور ادبیات فارسی کا گہرا مطالعہ مرزا غالب کی طرح شاید کسی دوسرے کا نہ تھا ۔ہندوستانیوں میں بیدلؔ اور ایرانیوں میں نظیری وظہوری وغیرہ کا رنگ ان کے کلام میں صاف طور پر جھلکتا ہے اور ان کے یہاں ایسے متعدد اشعار پائے جاتے ہیں جو کلیتاً یا کسی حد تک فارسی اشعار سے ماخوذ معلوم ہوتے ہیں ۔

امیر خسرو نے محمد سلطان بن غیاث الدین بلبن کے شہید ہونے پر جو مرثیہ لکھا تھا اور جو ان کی شہرت کا پہلا سبب ہوا اس میں ایک شعر یہ ہے :

بسکه آبِ چشمِ خلقی شد روان در چار سو　　　پنج آبی دیگر اندر مولتان آمد پلید

ناسخ کہتے ہیں :

ایک تر تھی ہے دو آنکھیں مری　　　اب الہ آباد بھی پنجاب ہے

بیدلؔ:

مسی آلوده بر لب رنگِ پان است　　تماشا کن تہِ آتش دخان است

ناسخؔ:

مسی آلودہ لب پر رنگِ پان ہے　　تماشا ہے نہ آتش دھواں ہے

ناصر علیؔ:

گویند که شب برسرِ بیمار گران است　　گر سرمه به چشمِ تو گران است ازان است

علی حزیںؔ:

بوریا جای من وجای تو نگر قالین　　شیرِ قالین دگر و شیرِ نیستان دگر است

ناسخؔ:

فرق ہے شاہ وگدا میں قولِ شاعر ہے یہی　　شیرِ قالیں اور ہے شیرِ نیستاں اور ہے

اصلی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ ناسخ وغالب دونوں یہ چاہتے تھے کہ فارسی کی روح کو اردو قالب میں ڈھالیں، چناں چہ غالب کے اردو دیوان میں بکثرت ایسے اشعار ہیں جن میں فارسی اشعار سے مضامین لیے گئے ہیں اور جس شعر کا کوئی حصہ ہندوستان کے مذاق سے علیحدہ ہے اس حصے کو بدل دیا ہے۔ اس رد وبدل نے غالب کی اردو شاعری میں اردو کی ادبیت کے لحاظ سے ایک بدرنگی پیدا کردی ہے اور صدہا شعر ایسے ہیں جن میں خیال وتخئیل تو بہت بلند ونازک ہے مگر کیفیت شعری سے معرا ہیں۔ اس عیب کو غالبؔ نے خود بھی محسوس کیا ہے اور کہا ہے:

بگذر از مجموعۂ اردو که بیرنگِ من است [۴۲]

اساتذہ کے سرقے:

مضمون کی چوری ہمارے اساتذہ کی ایک پرانی عادت ہے۔ مرزا غالبؔ رئیس المتغزلین حسرتؔ موہانی، اصغر گونڈوی، میر تقی میرؔ، امیرؔ، سراجؔ دکنی، جگر مرادآبادی کے

سرقے پیش کیے جاتے ہیں ۔[۳۴]

میر کے اس شعر کو:

کہیو قاصد جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں   جان و ایمان و محبت کو دعا کرتے ہیں

امیؔر نے اس طرح ''مسخ'' کیا ہے:

جو وہ پوچھے ہمیں کیا کرتے ہیں   کہیو قاصد کہ دعا کرتے ہیں

یا مثلاً میر کے اس شعر کو:

اے بتو اس قدر جفا ہم پہ   عاقبت بندۂ خدا ہیں ہم

شیریںؔ [بیگم صاحبہ بھوپال] نے اس طرح اپنا بنا لیا ہے:

نہ کرو اتنی ہم پہ جو رو جفا   اے بتو بندۂ خدا ہیں ہم

میرؔ کا ایک مشہور شعر:

یہ کہتے وہ کہتے ہم یہ کہتے جو یار آتا   سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

مگر دراصل یہ امیر خسرو کا مال ہے:

بدل گویم که اینها خواهشی گفت   چو او پیش نظر آید زبان کو

سراج دکنی فرماتے ہیں:

پی بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی   جس رات چاند نہیں ہے ستاروں کی کیا کمی

دراصل یہ مضمون قاسم ہی کا زادۂ طبیعت ہے:

بروز هجر مرا دیده بس گهر بار است   شبی که ماه نبا شد ستاره بسیار است

انعام اللہ خاں یقین کا ایک شعر ہے:

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند

برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہوگیا

ان بزرگوار نے بھی فارسی کے ایک شعر کو ''غارت'' کیا ہے۔

اصل یہ ہے:

ناخن تمام گشت معطر چو برگِ گل　　　بندِ قبای کیست کہ وا می کنیم ما

مرزا غالبؔ کا ایک مشہور شعر ہے:

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا　　　کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

مگر یہ بھی پرایا مال ہے۔ جلالؔ یزدی کہتا ہے:

از شوق تو صد بوسہ زنم بردہنِ خویش　　　ھر گاہ کہ نامِ تو بر آید ز زبانم

میر حسن نے اپنے تذکرۂ شعرائے اردو میں کرم اللہ خان درد کے جو اشعار نقل کیے

ہیں ان میں سے ایک یہ ہے:

کنارے سے کنارہ کب ملا ہے بحر کا یارو

پلک لگنے کی لذت دیدۂ پر آب کیا جانے

تحقیق سے پتہ چلا کہ دردؔ صاحب یہ ''دیدۂ پر آب'' کا سمندر فرقتی جوشقانی کی آنکھ

بچا کر اڑا لائے ہیں۔

فرقتی:

چہ شد اگر مژہ برھم نمی توانم زد　　　کہ لب بہ لب نہ رسید است ھیچ دریا

ابوالحسن تانا شاہ، بادشاہ دکن کے مقربین میں سے ایک بزرگ گزرے ہیں۔

ابوالاقاسم نام مرزا تخلص، ان کا یہ مقطع ہے:

مرزاؔ وہ نونہال چمن مٹ گئے کدھر　　　لگتا تھا جن کے ہاتھ پہ گل ڈال سوں اچھا

اب اس کا ماخذ دیکھیے

زغارتِ چمنت بر بہار مِنّت یاست　　　کہ گُل بدست تواز شاخ تازہ تر ماند

غرض یہ حضرات فارسی اشعار کو اپنی ملکِ موروث سمجھتے تھے اور جو شعر پسند آتا تھا

بڑے اطمینان کے ساتھ اس پر متصرف ہو جاتے تھے۔

نسیم نے اس مضمون کو لے کر اپنے الفاظ میں اس طرح باندھا ہے:

مقرر بلا آنے والی ہے کوئی　　نہیں بے سبب مہربانی تمہاری

سرقاتِ حسرت:

حسرت:

ہمیں اب یاں سے دیکھیں اٹھاتا ہے کون　　درِ جاناں پہ دھونی رما بیٹھے

غالب:

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد　　اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

حسرت:

وہ جفا کار اور وفا حسرت　　تیرے ابتک نہیں مزاق میں فرق

حسرت:

مل چکی ہم کو ان سے دادِ وفا　　جو نہیں جانتے لگی دل کی

غالب:

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید　　جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

حسرت:

کافی تھی مجھے دُردِ تہہ جام بھی حسرت　　کاسہ جو مرا مے سے وہ لبریز نہ کرتے

غالب:

کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ　　ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہہ جام بہت ہے

حسرت:

مل گیا اچھا سہارا عذر ہستی کا ہمیں　　لے لیا آغوش میں اس گل کو بے باکانہ آج

غالب:

ہم سے کھل جاؤ بوقتِ مے پرستی ایک دن　　ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذرِ مستی ایک دن

حسرتؔ:

چھیڑ ناحق نہ اے نسیمِ بہار سیرِ گل کا یہاں کسے ہے دماغ

غالبؔ:

فراقِ یار میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو کسے دماغ یہاں خندہ ہائے بے جا کا

حسرتؔ:

شرحِ بے مہریِ احباب کروں کیا حسرتؔ رنج ایسا دلِ مایوس کو کم پہنچا تھا

غالبؔ:

کرتے کس منہ سے ہو غربت کی شکایت غالبؔ

تم کو بے مہریٔ یارانِ وطن یاد نہیں

حسرتؔ:

جان کر مجھ پہ ستم بھی ہو تو ہے منظورِ شوق

لطفِ بے پرواہ کی میں کیا قدر کیوں پروا کروں

غالبؔ:

جان کر کیجیے تغافل کہ کچھ امید بھی ہو یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے ہم کو

حسرتؔ:

ہے غضب اس شہسوارِ حسن کا فتراک ناز دل ہے جس میں اک شکارِ نیم جانِ اضطراب

غالبؔ:

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلا دوں کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

حسرتؔ:

مانا کہ یقینی ہے اثر جذبۂ دل کا کیا ہوگا مگر ہجر میں تائیدِ اثر تک

غالبؔ:

آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

پچیس XXV

حسرتؔ:

نہ چھپتا مجھ سے تو کا ہے کو رازِ عاشقی کھلتا

انھیں باتوں سے میں رسوا ہوں ظالم تو بھی رسوا ہے

غالبؔ:

دوستی کا پردہ ہے بے گانگی   منہ چھپانا ہم سے چھوڑا چاہیے

حسرتؔ:

ٹھہرا ہے اک نگاہِ کرم پر معاملہ   اے لطفِ یار مفت ہے جنسِ گرانِ دل

قلقؔ:

ادا سے دیکھو لو تار ہے گلہ دل کا   بس ایک نگاہ پہ ٹھہرا ہے فیصلہ دل کا

حسرتؔ:

پہلے اک ذرۂ ذلیل تھا میں   تیری نسبت سے آفتاب ہوا

لاعلم

گرچہ خردیم نسبتی است بزرگ   ذرۂ آفتاب تابانیم

حسرتؔ:

ہو گیا راہِ عشق میں جو شہید   وہ فنا ہو کے بھی فنا نہ ہوا

حافظؔ:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدئہ عالم دوامِ ما

حسرتؔ:

عذرِ ستم ضرور نہ تھا آپ کے لیے   حسرت کو شرمسارِ ندامت نہ کیجیے

لاعلم

شرمندہ ام کر دی مگو عذر جفازین بیشتر   من ازتو این مقدار ھم آزردہ خاطر نیستم

XXVI چھبیس

حسرتؔ:

اس غم طلبی کی کوئی حد بھی ہے کہ حسرتؔ — بے چین ہوئے ہم جو ہوا دردِ جگر بند

حسرتؔ:

زندگی درد پہ موقوف ہے اے چارہ گرو — یہ مری موت کے ساماں ہیں کہ درماں کی صلاح

نواب صفدر علی خان رامپوری

میرا مدار زیست ہی صفدرؔ تڑپ پہ ہے — مر جاؤں ایک دم جو نہ ہو بے قرار دل

حسرتؔ:

بیٹھے ہوئے ہیں ہم بھی سر راہ — گزرے ادھر سے شاید وہ ذیجاہ

خواجہ غلام غوث بے خبر:

بخت کجاست بی خبر تا برکابِ او دوم — بر سرِرہ نشستہ ام نیم نگاھم آرزوست

حسرتؔ:

کیا ہی شرمندہ چلے ہیں دلِ مجبور سے ہم — آئے تھے ان کی زیارت کو بڑی دور سے ہم

حسرتؔ:

آئے تھے محفل میں تیری با ہزاراں آرزو — یا چلے ہیں ایک لے کر خاطرِ با شاد و ہم

عرفیؔ:

از در دوست چه گویم به چه عنوان رفتم — همه شوق آمده بودم همه حرمان رفتم

حسرتؔ:

اہل نظر کی جان ہے جس چیز پہ نثار — اک بات ان میں اور بھی ہے کچھ ورائے ناز

حافظؔ:

خوبی همین کرشمه و ناز و خرام نیست — بسیار شیوه هاست بتان را که نام نیست

حسرتؔ:

آئی جو ترے روئے منور کے قریں شمع ہم لوگ یہی سمجھے کہ محفل میں نہیں شمع

خواجہ میر دردؔ:

رات محفل میں ترے حسن کے شعلے کے حضور شمع کے منہ پہ جو دیکھا تو کہیں نور نہ تھا

حسرتؔ:

دیکھئے شوقِ شہادت کہ جھکی ہے گردن آپ اس وقت ذرا پاس ہمارا نہ کریں

مشتریؔ:

ہم جھکائے ہوئے ہیں دیر سے سر آپ خنجر لگائیے تو سہی

حسرتؔ:

دور ہم ان کی بزم سے جیتے رہے تو کیا رہے

آہ وہ زندگی جسے غم نے وبال کر دیا

لااعلم

چھوٹ جائیں غم کے ہاتھوں سے جو نکلے دم کہیں

خاک ایسی زندگی پر ہم کہیں اور تم کہیں

حسرتؔ:

ارادے تھے کہ ان سے حالِ دل سب ملکے کہدیں گے

مگر ملنے پہ ہم سب آج ہوتا ہے نہ کل کہنا

میرؔ:

یہ کہتے وہ کہتے ہم یہ کہتے جو یار آتا سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

حسرتؔ:

میری خطا پہ آپ کو لازم نہیں نظر یہ دیکھئے مناسب شانِ عطا ہے کیا

خیام:

من بدکنم و تو بد مکافات دھی   پس فرق میانِ من و تو چیست بگو

حسرتؔ:

مجبور مجھ کو جان کے عہدِ وفا کے بعد   بے مہریاں وہ کرنے لگے اعتنا کے بعد

حسرتؔ:

وہ اب یہ کہتے ہیں دیکھا کرے نہ تو مجھ کو   سمجھ لیا ہے جو مجبور آرزو مجھ کو

حسرتؔ:

مجبور وفا کر کے محرومِ کرم کرنا   بھولیں گی نہ یہ باتیں اے عہد شکن تیری

شہیدیؔ:

وہ کب خاطر میں لاتا ہے مرے آزردہ ہونے کو

یہ سن رکھا ہے ظالم نے پھنسا دل کم نکلتا ہے

حسرتؔ:

ضبطِ رازِ عشق نے رخصت نہ دی فریاد کی

آ کے لب تک رہ گئے شکوے تری بیداد کے

داغؔ:

کہنے دیتی نہیں کچھ منہ سے محبت تیری   لب پہ رہ جاتی ہے آ آ کے شکایت تیری

حسرتؔ:

یہ آج ہم سے جو چاہت جتائی جاتی ہے   عدو سے ملنے کی خفت مٹائی جاتی ہے

مومنؔ:

آج وہ غیر سے ملنے کی قسم کھاتے ہیں   خود بخود منفعلِ جور ہیں شرماتے ہیں

حسرتؔ:

تقاضا کر رہا ہے اب یہ حسنِ تازہ کاران کا — کہ جس نے دل دیا تھا جان بھی ہم پر فدا کر دے

داغؔ:

دل لے کے وہ اب جان طلب کرتے ہیں ہم سے — یہ ایسی دھری ہے کہ اٹھائی نہیں جاتی

حسرتؔ:

قُرب میں ہے نہ بُعدِ یار میں تھا — جو مزہ اس کے انتظار میں تھا

لاعلم:

نہ کبھی وصل یار میں دیکھا — جو مزہ انتظار میں دیکھا

حسرتؔ:

اپنی ہستی سے بھی آخر ہوگیا بیگانہ میں — ان سے جب جا کر ہوئی حاصل شناسائی مجھے

منسوب بہ سلطان ابو سعید ابو الخیر:

هر کس بتوره یافت زخود گم گردید — آنکس که ترا شناخت خود را نشناخت

حسرتؔ:

ہر پھول چمن میں زر بکف ہے — بانٹے ہیں بہار نے خزانے

آتشؔ:

زیرِ زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف — قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا

حسرتؔ:

پھرتی رہتی ہے آدمی کو لیے — خوار دنیا میں آدمی کی ہوس

خواجہ میر دردؔ

حرص کرواتی ہے روبہ بازیاں سب ورنہ یاں

اپنے اپنے بورئے پر جو گدا تھا شیر تھا

حسرتؔ:

ناواقفِ بے ثباتی گل بلبل ہیں کہ محو رنگ و بو ہیں

لااعلم:

غنچہ و گل میں دھرا کیا ہے بتا اے بلبل جمع ہیں چند ورق وہ بھی بکھرنے والے

حسرتؔ:

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگین یا عکس مے شیشہ گلابی

حافظؔ:

تنت در جامہ چون در جام بادہ دلت در سینہ چون در سیم آھن

حسرتؔ:

کچھ محبت بھی عجب شے ہے کہ حسرتؔ سا غیور

اور اسے آپ نے خود کردہ دشنام کیا

نواب یوسف علی خاں ناظم:

الفت میں کیا بلا ہے کہ ناظم سا آدمی منت کش عدو سر بازار ہوگیا

اس میں داغؔ کا یہ مصرعہ بھی شامل کر لیجیے ''معشوق کی گالی سے تو عزت نہیں جاتی'' تو ماخذ کی حقیقت اور زیادہ واضح ہو جائے گی۔

حسرتؔ:

غم سے نہیں اک دل بھی آزاد فریاد زدستِ عشق فریاد

منسوب بہ سلطان ابوسعید ابوالخیر:

وافریاد از عشق وافریادا

حسرتؔ:

دیکھیے کوئی نیرنگ محبت کے کرشمے کرتے ہیں جفا آپ تو دیتا ہوں دعا میں

اکتیس XXXI

حافظ:

بدم گفتی و خورسندم عفاک الله نکو گفتی
جوابِ تلخ می زیبد لبِ لعل شکر خا را

حسرت:

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں   مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں

ندیم [مرزا علی بیگ]

از تو دل مہر و وفا می خواھد   سادگی بین کہ چھا می خواھد

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا   جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

سرِقات اصغر گونڈوی:

اصغر:

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا   جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

ملکِ قمی:

خواب دیدم کہ ترا دست بدامن زدہ ام   در گریبانِ خودم بود چو بیدار شدم

ترجمہ: میں نے خواب میں دیکھا کہ تیرا دامن میرے ہاتھ میں ہے مگر جب آنکھ کھلی تو دیکھا کہ خود اپنا گریبان پکڑے ہوئے ہوں۔

اصغر:

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریقِ عشق میں   آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

ملک قمی:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہان شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ را ھم دور شد

اصغر:

ہے تلوں سے ترے جلوۂ نیرنگِ حیات   میں تو مر جاؤں جو امید وفا ہو جائے

اب تو غالب کا یہ مشہور شعر آپ کو خود ہی یاد آگیا ہوگا یعنی:

ترے وعدہ پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا　　کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

اصغرؔ:

اک شور انا لیلیٰ خلقت نے سنا لیکن　　پھر نجد کے صحرا سے کوئی نہ صدا آئی

غالبؔ:

جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار　　صحرا مگر بتنگی چشمِ حسود تھا

اصغرؔ:

نہیں معلوم یہاں دار و رسن ہے کہ نہیں　　خون میں گرمی ہنگامۂ منصور ہے آج

عمریست کہ آوازۂ منصور کہن شد　　من از سرِ نو جلوہ دھم دار و رسن را

اصغرؔ:

ماورائے سخن بھی ہے اک بات　　بات یہ ہے کہ گفتگو نہ کرے

فارسی اور اردو کے یہ دو مشہور مصرعے یاد کیجیے:

خموشی معنی ای دارد کہ در گفتن نمی آید

خاموشی ھی سے نکلے ھے جو بات چاھیے

اصغرؔ:

یہ زندگی ہے یہی اصل علم و حکمت ہے　　جمالِ دوست و شب ماہ و بادۂ گلفام

خیامؔ:

ساقی عیش سر برافروختہ است　　می دہ کہ فلک نکتہ ای آموختہ است

دانی کہ اجل چو برق خرمن سوز است　　تا در نگری خرمنِ ما سوختہ است

می نوش بنورِ ماہ ای ماہ کہ ماہ　　بسیار بتابد و نیابد ما را

مھتاب بنورِ دامن شب بشگافت　　می خور کہ دمی خوشترازین نتوان یافت

اصغرؔ:

پھر یہ سب شورش و ہنگامۂ عالم کیا ہے — اسی پردہ میں اگر حسن جنوں ساز نہیں

غالبؔ:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

سرقات فانی:

فانیؔ:

دل ہی نگاہِ ناز کا ایک ادا شناس تھا — جلوۂ برق طور نے طور کو کیوں جلا دیا

غالبؔ:

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

فانیؔ:

آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت — احباب سے غمخوار ہوا بھی نہیں جاتا

غالبؔ:

یہ کہاں کی دوستی ہے کہ بنے ہیں دوست ناصح — کوئی چارہ ساز ہوتا کوئی غمگسار ہوتا

فانیؔ:

جتنے غم چاہے دیے جا مجھے یارب لیکن — ہر نئے غم کے لیے تازہ جگر پیدا کر

غالبؔ:

میری قسمت میں غم گر اتنا تھا — دل بھی یارب کئی دیے ہوتے

فانیؔ:

نہیں یہ مردنِ دشوار بے سبب یعنی — یقین وعدۂ پیغام بر نہیں ہے مجھے

غالبؔ:

ترے وعدے پہ جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا — کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

چونتیس XXXIV

فانیؔ:

فانی کی ذات سے غمِ ہستی کی تھی نمود — شیرازہ آج دفترِ غم کا بکھر گیا

غالبؔ:

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالبؔ — کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد

جگرؔ:

اس تبسم کے تصدق اس تجاہل کے نثار — خود مجھی سے پوچھتے ہیں کون یہ دیوانہ ہے

غالبؔ:

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے — کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

جگرؔ:

تصویر امیدوں کی آئینہ ملا لوں گا — انساں جسے کہتے ہیں محشر ہے خیالوں کا

غالبؔ:

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

جگرؔ:

سر رکھ ہی دیا سنگِ دریار پہ میں نے — اب حشر بھی اٹھے تو مجھے کچھ نہ خبر ہو

غالبؔ:

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسدؔ — اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

جگرؔ:

میں وہاں ہوں نہیں جہاں میں بھی — عالم و ماورائے عالم کیا

غالبؔ:

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی — کچھ ہماری خبر نہیں آتی

جگر:

تو سامنے ہے پھر بھی بتلا کہ تو کہاں ہے　　کس طرح تجھ کو دیکھوں نظارہ درمیاں ہے

غالب:　　نظارہ نے بھی کام کیا واں نقاب کا

جگر:

صبح تک یہ یادگارِ عشق بھی افسانہ تھی　　شمع اب ہے دفن جس جا تربت پروانہ تھی

سرورؔ جہاں آبادی:

صبح تک وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا　　یادگارِ رونق محفل تھی پروانے کی خاک

جگر:

لاکھوں میں جگر اس نے پہچان لیا تم کو　　چھپتی ہے چھپائے سے کب آنکھ محبت کی

داغؔ:

عشق منہ پر مرے لکھا ہو تو کیا اس کا علاج　　جان پہچان نہ تھی اور وہ پہچان گئے

جگر:

محشر میں بات بھی نہ زباں سے نکل سکی　　کیا جھک کے اس نگاہ نے سمجھا دیا مجھے

عالیجاہ فضاؔ لکھنوی:

محشر میں مسکرا کے گلے سے لگا لیا　　کشتوں سے اپنے چال قیامت کی چل گئے

جگر:

بعد مرنے کے بھی قرار نہیں　　مرگ ناکام اس کو کہتے ہیں

ذوقؔ:

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

جگر:

وہ ہنس رہے ہیں مرے حال پر ہنسا کرتے　　یہ بہہ رہے ہیں جو آنسو یونہی بہا کرتے

میرؔ:

مجھ کو روتا دیکھ اس نے ہنس دیا برق چمکی ابر باراں تھم رہا [۳۵]

اکابرین کے سرقے فارسی سے:

۱۔وقوعی تبریزی:

مـی نـمـایـد کـه سر عهد شـکستـن داری

خشـم این بـار تو چون رنجش هر بار تو نیست

ترجمہ:ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم وعدہ شکنی کا ارادہ رکھتے ہو کیوں کہ اس مرتبہ تمہاری خفگی ہمیشہ جیسی نہیں ہے۔

غالب:

بار ھا دیکھی ہیں ان کی رنجشیں

لیکن اب کے سر گرانی اور ہے

۲۔مرزا مظہر جان جاناں:

حیف در دی که به خود ننگ مداوا برداشت

بهـر جـانـی نتـوان نـاز مسیـحا بـرداشت

ترجمہ: وائے ھو اس درد پہ جس نے علاج کی شرمندگی سہی۔ایک جان کے لیے مسیحا کا احسان نہیں اٹھایا جا سکتا۔

مومن:

منت حضرت عیسٰی نہ اٹھائیں گے کبھی

زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے؟

۳۔ظفر خان، احسن:

این سخن از پیر کنعانم به خاطر مانده است

دیدن روی عزیزان چشم روشن می کند

ترجمہ: پیر کنعاں کی یہ بات مجھے یاد رہ گئی ہے کہ عزیزوں کے دیدار سے آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔

شہیدی:

سپیدی چشم کی زائل ہو دیدار عزیزاں سے

اڑایا ہم نے یہ نسخہ بیاض پیر کنعاں سے

۴۔عرفی:

چشمم نه بهر خویش دم نزع تر شود

ترسم که من بمیرم و غم در بدر شود

ترجمہ: مرتے وقت میں اپنے لیے نہیں روتا بلکہ اس ڈر سے روتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد غم در در کی ٹھوکریں کھاتا پھرے گا۔

غالب:

آئے ہے بیکسی عشق پہ رونا غالب

کس کے گھر جائے گا سیلاب بلا میرے بعد

۵۔ملک قمی:

ز شوق سیر گلزار آن قدر فرصت نمی یابم

که در پای گلی بنشینم و خاری برون آرم

ترجمہ: سیر گلزار کا شوق اتنی مہلت نہیں دیتا کہ کسی پھول کے نیچے بیٹھ کر کانٹا نکالوں۔

مظفر خاں گرم:

فرصت کہاں ہے اتنی جنوں میں کہ بیٹھ کر
تلووں سے اپنے خار مغیلاں نکالیے

۲۔نعمت خاں عالی:

نخواهد گفت ترک بت پرستی های دل زارم
که چون سنگ سلیمانی است زنّاری که من دارم

ترجمہ: میرا دل زار کسی حال میں بت پرستی چھوڑنے والا نہیں۔میرا زنار سنگ سلیمانی کی لکیروں کی طرح ہے۔کہ جب تک وہ پتھر باقی ہے لکیریں بھی باقی ہیں۔

سوداؔ:

ہوا جب کفر ثابت ہے وہ تمغاے مسلمانی
نہ ٹوٹی شیخ سے زُنارِ تسبیح سلیمانی

۷۔کمال اسماعیل اصفہانی:

زخضر عمر فزون است عشق بازان را
اگر زعمر شمارند روز هجران را

ترجمہ:اگر روز ہجر کو بھی عمر میں شمار کرلیں تو عاشقوں کی عمر خضر سے بھی زیادہ ہے۔

غالب:

بتلاؤں کیا، ہوں کب سے جہانِ خراب میں
شب ہاے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

۸۔آنند رام مخلص:

ازان هر لحظه در بر می کشم سرو گلستان را
که این رعنا جوان بسیار می ماند به یار من

ترجمہ: ہر لحظہ میں سروِ چمن کو اس لیے آغوش میں لیتا ہوں کہ وہ میرے محبوب سے بہت ملتا جلتا ہے۔

ذوق:

تیرے تصور قد رعنا میں آج ہم!
کیا کیا لپٹ کے روئے ہیں سروِ چمن کے ساتھ

۹۔میر والٰہی قمی:

آمدی بر سر خاک من و شرمنده شدم
کین زمان از پی قربان تو جان می بایست

ترجمہ: تم میری قبر پر آئے اور میں شرمندہ ہو گیا کیوں کہ اس وقت مجھے تم پر سے جان نچھاور کرنی چاہیے تھی اور جان میرے پاس موجود نہیں۔

میر تقی میر:

ہمیں تو نزع میں شرمندہ آ کے اس نے کیا
رہا ہے ایک رمق جی سو کیا نثار کریں

۱۰۔جلال یزدی:

از شوق تو صد بوسہ زنم بر دھن خویش
ھر گاہ کہ نام تو بر آید ز زبانم

ترجمہ: جس وقت تیرا نام میری زباں سے نکلتا ہے تو میں تیرے شوق میں سینکڑوں مرتبہ اپنا منہ آپ چومتا ہوں۔

غالب:

زباں پہ بارِ خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زبان کے لیے

چالیس XL

طالب آملی:

چو نام او برم از ذوق ملتی کارم

بجز لب و دهن خویشتن مکیدن نیست

ترجمہ: جب میں اس کا نام لیتا ہوں تو ایسی لذت حاصل ہوتی ہے کہ مدت تک اپنے لب ودہن کو چوستا رہتا ہوں۔

حزیں:

تا نام شب وصل تو آمد بہ زبانم

چوں شمع لبم می مکد از ذوق دھن را

ترجمہ: جب سے تیری شب وصال کا نام میری زبان پر آیا ہے تب سے شمع کی مانند میرے لب میرے دہن کو چوستے ہیں۔

لااعلم:

زیں نام چو تر کنم زبان را

جان بوسہ دھد سر زبان را

ترجمہ: جس وقت میں زبان سے اس نام کو ادا کرتا ہوں تو میری روح میری زبان کو چوم لیتی ہے۔

۱۱۔حزیں:

قیامت است دران دم کہ بھر زندہ شدن

اگر زکوی تو خاک مرا جدا سازند

ترجمہ: جس وقت میری خاک زندہ ہونے کے لیے تیرے کوچے سے جدا کی جائے گی وہی ساعت قیامت ہوگی۔''اگر زائد، بلکہ مخل ہے۔

سودا:

قیامت آئے گی اس دم کہ بھر جینے کے
تری گلی سے مری لاش کو اٹھائیں گے

۱۲۔میر مومن:

بہ گوش پنبہ نهم از صدای خندهٔ گل
دماغ نالهٔ بلبل درین بهار کجاست

ترجمہ: اس بہار میں نالۂ بلبل کے سننے کا دماغ کسے یہاں تو خندۂ گل کی صدا بھی ناگوار ہے۔چناں چہ میں تو کان میں روئی رکھ لیتا ہوں۔

لااعلم:

مارا دماغ گلشن و باغی نمانده است
ای بوی گل برو که دماغی نمانده است

ترجمہ: ہمیں سیر چمن کی برداشت نہیں۔اے بوئے گل! چلی جا کہ یہاں دماغ ہی نہیں رہا۔

غالب:

فراق یار میں تکلیف سیر باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

۱۳۔میوجی چغتائی:

کبوتر نامه ام برد و نه شد معلوم حال او
مگر در ره ز سوز نامهٔ من سوخت بال او

ترجمہ: کبوتر میرا خط لے گیا اور پھر اس کا کچھ حال معلوم نہ ہوا۔شاید میرے خط کے سوز سے راستے میں اس کے پر جل گئے۔

تعشق لکھنوی:

لکھا تھا خط میں انھیں حال آہ سوزاں کا
سنا ہے راہ میں بجلی گری کبوتر پر

۱۴۔حامدی قمی:

ز دل رشک آیدم گر بگذرد در دل خیال تو
چسان بینم که افتد چشم غیری بر جمال تو

ترجمہ:اگر دل میں تیرا خیال گزرے تو مجھے اپنے دل پر بھی رشک آنے لگتا ہے۔
پھر بھلا میں اس بات کو کیوں کر برداشت کرسکتا ہوں کہ غیر تجھے دیکھے۔

غالب:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

۱۵۔قاسم کاہی:

بروز هجر مرا دیده بس گهر بار است
شبی که ماه نباشد ستاره بسیار است

ترجمہ:ہجر کے دن میری آنکھوں سے موتی برس رہے ہیں۔جس رات چاند نہیں
نکلتا ستارے بکثرت ہوتے ہیں۔

سراج دکنی:

پی بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی
جس رات چاند نہیں ہے ستاروں کی کیا کمی

۱۶۔لاادری:

ناخن تمام گشت معطر چو برگ گل
بند قبای کیست که وا می کنیم ما

ترجمہ: پھول کی پنکھڑی کی طرح ناخن معطر ہوگیا۔ یہ میں کس کا بند قبا کھول رہا

ہوں۔

انعام اللہ خاں یقین:

کیا بدن ہوگا کہ جس کے کھولتے جامے کے بند

برگ گل کی طرح ہر ناخن معطر ہوگیا

۱۷۔ جامی:

آسمان جام نگون دان کز می عشرت تهی است

جستن می از تهی ساغر نشان ابلهی است

ترجمہ: آسماں کو ایک اوندھا جام سمجھو جو شراب عیش سے خالی ہے۔ خالی جام سے شراب چاہنا حماقت کی نشانی ہے۔ اسی مضمون کو ہمارے تین مسلم الثبوت استادوں نے باندھا ہے اور تینوں کا اپنا اپنا مخصوص رنگ نمایاں ہے:

سودا:

نہیں ہوں طالب رزق آسماں سے کہ مجھے

یقین ہے کاسۂ واژوں میں کچھ نہیں ہوتا

ذوق:

مے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم

کہ آخر جب اسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا

غالب

مے عشرت کی خواہش ساقیٔ گردوں سے کیا کیجیے

لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

۱۸۔ فرقتی جوشقانی:

چه شد اگر مژه برهم نمی توانم زد

که لب به لب نرسیده است هیچ دریا را

[اگر میری پلک سے پلک نہیں لگتی تو کیا ہوا، کسی دریا کے کنارے آپس میں کبھی نہیں ملے]

کرم اللہ خاں درد:

کنارے سے کنارہ کب ملا ہے بحر کا یارو
پلک لگنے کی لذت دیدۂ پر آب کیا جانے

۱۹۔ لااعلم:

زغارت چمنت بر بهار منت هاست
کہ گل بدست تو از شاخ تازه تر ماند

ترجمہ: چمن کو لوٹ کے تو نے بہار پر احسان کیا ہے کیوں کہ پھول تیرے ہاتھ میں شاخ سے کہیں زیادہ تر و تازہ معلوم ہوتا ہے۔

ابوالقاسم، مرزا تخلص، ندیم ابوالحسن تانا شاہ، بادشاہ دکن:

مرزا وہ نونہال چمن مٹ گئے کدھر
لگتا تھا جن کے ہاتھ پہ گل ڈال سوں اچھا

۲۰۔ ظہوری:

گرچہ خردیم نسبتی است بزرگ
ذرۂ آفتـــاب تـــابـــانیـــم!

ترجمہ: اگر چہ ہم چھوٹے ہیں مگر نسبت بڑی ہے۔ ہم آفتاب تاباں کا ذرہ ہیں۔

حسرت موہانی:

پہلے اک ذرۂ ذلیل تھا میں
تیری نسبت سے آفتاب ہوا

۲۱۔ ملک قمی:

رفتم کہ خار از پا کشم، محمل نہان شد از نظر
یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راهم دور شد

اصغر گونڈوی:

قہر ہے تھوڑی سی غفلت بھی طریق عشق میں
آنکھ جھپکی قیس کی اور سامنے محمل نہ تھا

۲۶۔غنیمت:

بگفتا قیمتش؟ گفتم نگاهی
بگفتا کمترک؟ گفتم که گاهی

اس نے کہا۔اس کی قیمت؟ میں نے کہا ایک نگاہ،اس نے کہا کچھ کم؟ میں نے کہا [وہی نگاہ] کبھی کبھی [سہی]۔لطیفہ اس میں یہ ہے کہ "نگاہ" پہلے قیمت بتائی تھی۔خریدار نے کہا کچھ کم کرو، بیچنے والے نے "نگاہ" میں سے "نون" کم کردیا،صرف "گاہ" رہ گیا۔

جگر مرادآبادی:

ایک تجلی، ایک تبسم، ایک نگاہ بندہ نواز
اس سے زیادہ اے غم جاناں دل کی قیمت کیا کہیے

۲۳۔مرزا علی بیگ ندیم:

از تو دل مهر و وفا می خواهد
سادگی بین که چها می خواهد

ترجمہ: دل تجھ سے مہرووفا چاہتا ہے۔ذرا اس کی سادگی تو دیکھ کہ کس چیز کا طالب ہے۔

حسرت موہانی:

وفا تجھ سے اے بے وفا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ کیا چاہتا ہوں!

حسرت کا شعر ندیم کے شعر کا ترجمہ ہے اور بہت اچھا ترجمہ ہے۔

۲۴۔ملک قمی:

خواب دیدم که ترا دست بدامن زده ام

در گریبان خودم بود چو بیدار شدم

ترجمہ: میں نے خواب میں دیکھا تیرا دامن میرے ہاتھ میں ہے مگر جب میں جاگا

تو دیکھا کہ اپنا ہی گریبان پکڑے ہوئے ہوں۔

اصغر گونڈوی:

سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا

جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں ہے

۲۵۔لا اعلم:

خوبرویان کشادہ رو باشند

تو کہ روبستہ ای مگر زشتی؟

ترجمہ: حسین تو بے پردہ رہتے ہیں، تم نے جو اپنا منہ ڈھانکا ہے تو کیا تم بدصورت

ہو۔

جگر مرادآبادی:

موسیٰ کی طرح کون سنے لن ترانیاں

بے عیب ہے جو حسن تو پردہ نہ کیجیے

۲۶۔لا اعلم:

شرمندہ ام کردی مگو عذر جفا زین بیشتر

من از تو این مقدار هم آزردہ خاطر نیستم

ترجمہ: تم نے تو مجھے شرمندہ کر دیا۔بس اب اور زیادہ عذر جفا نہ کرو۔میں تم سے

اس درجہ آزردہ بھی نہیں ہوں۔

حسرت موہانی:

عذر ستم ضرور نہ تھا آپ کے لیے
حسرت کو شرمسار ندامت نہ کیجیے

۲۷۔نظیری:

ز فرق تا بہ قدم ھر کجا کہ می نگرم
کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

ترجمہ: سر سے پاؤں تک جس جگہ نظر ڈالتا ہوں دل اسی کی طرف کھچنے لگتا ہے کہ سب سے بہتر یہی ہے۔

جگر مرادآبادی:

کس ادا پر جان دوں، تو ہی بتا اے حسن یار
جس ادا کو دیکھتا ہوں حسن کی تصویر ہے

۲۸۔عرفی:

از در دوست چہ گویم بہ چہ عنوان رفتم
ھمہ شوق آمدہ بودم ھمہ حرمان رفتم

ترجمہ: کیا بتاؤں کہ در دوست سے میں کس حال میں واپس ہوا۔سراپا شوق بن کر آیا تھا یکسر محرومی بن کر چلا۔

حسرت موہانی:

آئے تھے محفل میں تیری با ہزاراں آرزو
یا چلے ہیں ایک لے کر خاطر ناشاد ہم

۲۹۔بابافغانی:

خوبی ھمین کرشمہ و ناز و خرام نیست
بسیار شیوہ ھاست بتان را کہ نام نیست

حسرت موہانی:

اہل نظر کی جان ہے جس چیز پہ نثار
اک بات ان میں اور بھی ہے کچھ ورائے ناز

حافظؔ کا یہ شعر بھی ساتھ ساتھ پڑھنا چاہیے۔

شاهد آن نیست که مویی و میانی دارد
بندهٔ طلعت آن باش که آنی دارد

۳۰۔حافظؔ:

تنت در جامه چون در جام باده
دلت در سینه چون در سیم آهن

ترجمہ: لباس کے اندر تیرا جسم ایسا ہے جیسے جام میں شراب اور سینے کے اندر تیرا دل ایسا ہے جیسے چاندی میں لوہا۔

حسرت موہانی:

پیراہن اس کا ہے سادہ رنگیں
یا عکس مے سے شیشہ گلابی

۳۱۔حافظؔ:

هرگز نمیرد آن که دلش زنده شد به عشق
ثبت است بر جریدهٔ عالم دوام ما

ترجمہ: جس کا دل عشق سے زندہ ہو گیا وہ کبھی نہیں مرتا۔ ہماری ابدیت تو دفتر عالم میں درج ہے۔

حسرت موہانی:

تجھ پہ مٹے تو زندۂ جاوید ہو گئے
ہم کو بقا نصیب ہوئی ہے فنا کے بعد

۴۲۔خواجہ غلام غوث بے خبر:

بخت کجاست بی خبر تابه رکاب او دوم

بر سر ره نشسته ام، نیم نگاهم آرزوست

ترجمہ: اے بے خبر! ایسی قسمت کہاں کہ اس کے ہم رکاب دوڑوں۔راستے کے کنارے بیٹھا ہوا ہوں۔بس اتنی آرزو ہے کہ وہ مجھ پر ایک اچٹتی سی نظر ڈال لے۔

حسرتؔ موہانی:

بیٹھے ہوے ہیں ہم بھی سر راہ

گزرے ادھر سے شاید وہ ذی جاہ

بیامیؔ:

بیم از وفا مدار بده وعده ای که من

از ذوق وعدۂ تو به فردا نمی رسم

ترجمہ: تو مجھ سے وعدہ کر لے۔اس کی فکر نہ کر کہ وعدہ پورا کرنا بھی پڑے گا کیوں کہ تیرے وعدے کی خوشی سے میں آج ہی شادی مرگ ہو جاؤں گا۔کل تک زندہ ہی نہ رہوں گا جو ایفاے وعدہ کی نوبت آئے۔

غالبؔ:

ترے وعدے پر جیے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا

کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

لالہ خاتونؔ:

من اگر توبه زمی کرده ام ای سرو سهی

تو خود این توبه فکر دی که مرا می ندهی

ترجمہ: اے سرو سہی، اگر میں نے مے خواری سے توبہ کی ہے تو تو نے تو مجھے شراب پلانے سے توبہ نہیں کی۔پھر تو کیوں نہیں پلاتا۔

غالبؔ:

میں اور بزم مے سے یوں تشنہ کام آؤں
گر میں نے کی تھی توبہ ساقی کو کیا ہوا تھا

جلالؔ:

از شوق تو صد بوسہ زنم بر دھن خویش
ھر گاہ کہ نام تو بر آید ز زبانم

لا اعلمؔ:

زین نام چو تر کنم زبان را
جان بوسہ دھد سر زبان را

ترجمہ: جس وقت میں زبان سے اس نام کو ادا کرتا ہوں تو میری روح زبان کو چوم لیتی ہے۔

غالبؔ:

زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

حامدیؔ:

ز دل رشک آیدم گر بگذرد در دل خیال تو
چسان بینم کہ افتد چشم غیری بر جمال تو

ترجمہ: اگر تیرا خیال میرے دل میں گزرے تو مجھے اپنے دل پر رشک آنے لگتا ہے۔ پھر بھلا میں کیوں کر دیکھ سکتا ہوں کہ کسی غیر کی تجھ پر نظر پڑے۔

غالبؔ:

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے

خیامؔ:

گر میل تو با بی خرد و نااهل است

من نیز چنان اهل و خرد مند نیم

ترجمہ: اے آسماں اگر تو احمقوں اور نالائقوں کی طرف مائل ہے تو میں بھی تو کچھ ایسا دانش منداور لائق نہیں ہوں۔

غالبؔ:

ہم کہاں کے دانا تھے کس ہنر میں یکتا تھے

کس لیے ہوا غالب دشمن آسماں اپنا

لاعلمؔ:

زخضر عمر فزونست عشق بازان را

اگر زعمر شمارند روز هجران را

ترجمہ: اگر فراق کے دن بھی عمر میں شمار کیے جائیں تو عاشقوں کی عمر خضر سے بھی زیادہ ہے۔

غالبؔ:

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہان خراب میں

شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

جامیؔ:

آسمان جام نگون دان کز می عشرت تهی است

جستن می از تهی ساغر نشان ابلهی است

ترجمہ: آسمان کو ایک اوندھا جام سمجھو جو شراب عیش سے خالی ہے۔خالی جام سے شراب چاہنا بے وقوفی کی علامت ہے۔

غالبؔ:

مے عشرت کی خواہش ساقیِ گردوں سے کیا کیجے
لیے بیٹھا ہے اک دو چار جامِ واژگوں وہ بھی

نظیریؔ:

راز دیرینه ز رخ پرده بر انداخت دریغ
حال ما شهره به انشای غزل ساخت دریغ

ترجمہ: ھائے پرانا راز افشا ہوگیا۔ غزل نگاری کی بدولت ھمارا حال سارے شہر
میں مشہور ہوگیا۔

غالبؔ:

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

معز فطرتؔ:

هر عضو من ز دست تو دارد شکایتی
چون ارغنون لبالبم از ناله های زار

ترجمہ: میرا ھر ھر عضو تم سے گلہ مند ہے۔ ارگن کی طرح میں نالہ ھائے زار سے پر ہوں۔

غالبؔ:

پر ہوں میں شکوے سے یوں راگ سے جیسے باجا
اک ذرا چھیڑیے پھر دیکھیے کیا ہوتا ہے

لا اعلمؔ:

سرت گردم بزن تیغ و دری بر روی دل بکشا
دم تنگ است و کار از زخم پیکان بر نمی آید

ترجمہ: تیرے قربان، تلوار لگا اور دل کے سامنے ایک دروازہ کھول دے۔ میرا
دل بہت تنگ ہے پیکان کے زخم سے کام نہیں چلے گا۔

غالب:

نہیں ذریعۂ راحت جراحت پیکاں
وہ زخم تیغ ہے جس کو کہ دل کشا کہیے

صیدی طرانی:

چہ بہرہ از گل رویش ہوس گداختہ را
بہار فیض نبخشد جنون ساختہ را

ترجمہ: ہوس کے مارے ہوئے کو اس کے گل عارض سے کیا ملے گا۔ مصنوعی دیوانگی
کو بہار سے کچھ فیض حاصل نہیں ہوسکتا۔

غالب:

وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد
جنوں ساختہ و فصل گل قیامت ہے

یاس [تذکرہ شمیم سخن]

یاد آیا مجھے گھر دیکھ کے دشت
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

غالب:

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا[۳۱]

غالب کے یہاں سرقہ کی امثال درج ذیل ہیں:

حیدر تبریزی:

چو ریزم اشک از دل آہ درد آلود می خیزد
بلی چون آب بر آتش بریزد دود می خیزد

غالبؔ:

آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھی ہے صدا　　ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے

ذوقیؔ سمرقندی:

مکن تغافل ازین بیشتر که می ترسم　　گمان برند که این بنده بی خدا وندا ست

غالبؔ:

زندگی اپنی جب اس طرح سے گزرے غالب　　ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

بیدلؔ:

میرو داز خویش و در اندیشۂ باز آمدن　　همچو عمر رفته یارب بر نگردانی مرا

غالبؔ:

مستانہ طے کروں ہوں رہِ وادیِ خیال　　تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

خواجہ دردؔ:

به هیچ کار کتب خوانیت نمی آید　　زجمعِ خاطرِ خود نسخه ای فراهم کن

غالبؔ:

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں　　مجموعۂ خیال ابھی فرو فرو تھا

فیاض لاہجی:

هر کس که زخم کاری مارا نظاره کرد　　تا حشر دست و بازوی اورا دعا کند

غالبؔ:

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

راقمؔ مشہدی:

میکند وعدۂ دیدار به فردا، امروز　　یار دانسته که امروزِ مرا فردا نیست

غالبؔ:

جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے　　کیا خوب، قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

زلالیؔ خوارزمی:

تنها نصیبِ من غم و دردِ حبیب نیست　　از هیچ درد و غم دلِ ما بی نصیب نیست

غالبؔ:

تیری وفا سے کیا ہو تلافی کہ دہر میں　　تیرے سوا بھی ہم پہ بہت سے ستم ہوئے

شمس تبریزؔ:

در شـــرابـــم چیـز دیـگـر ریـخـتـی　　بـــاده تـنـهـــا نیســت، این آمیختی

غالبؔ:

مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام　　ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

طالب آملیؔ:

ای گوش رغبتم احول شدی چوچشم　　تـا هـرچـه گـفـتـی از تو مکرر شینلمی

غالبؔ:

بہرا ہوں میں تو چاہیے دونا ہو التفات　　سنتا نہیں ہوں بات مکرر کہے بغیر

فریدونؔ خراسانی:

از ضـعـفِ دل مـنـال فریدون ز بیکسی　　میلدار دل قوی که کسِ بیکسان خداست

غالبؔ:

بے دل نہ ہو بیگانگی خلق سے غالبؔ　　کوئی نہیں تیرا تو مری جان خدا ہے

کلیم کوشمیری:

زخضر عمر فزون است عشق بازان را　　اگـر زعـمـر شـمـــارند روز هجران را

غالب:

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں　　　شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

رضی سمرقندی:

ستاره ایست دُرِ گوش آن هلال ابرو　　　زروی حسن به خورشید میزند پهلو

غالب:

گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا　　　کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے

آرزو [سراج علی خاں] کے ایک شاگرد نجات کا شعر ہے:

با آنکه همه عمر نرفتم زدرِ او　　　پرسند زمن از ناز ترا خانه کدام است

مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے گھر بار کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا اور اسی کے در پر پڑا رہتا ہوں مگر از راہ ناز مجھ سے یہ پوچھتا ہے کہ "آپ کا دولت خانہ؟"

غالب:

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے　　　یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

آصفی شیرازی:

تو هم در آئینه حیران ز حسنِ خویشتنی　　　زمانه ایست که هر کس به خود گرفتار است

غالب:

شکوہ سنجِ رشکِ ہمدیگر نہ رہنا چاہیے　　　میرا زانو مونس، آئینہ تیرا آشنا

آذری طوسی اسفرائنی:

جانی که داشت کو فدای تو آذری　　　شرمنده از تو گشت که جانِ دگر نداشت

غالب:

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی　　　حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

غالبؔ:

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو ہمیں دماغ کہاں خندہ ہائے بے جا کا

ابوترابؔ:

نکہت گل رساند پیغامی بی دماغی نداد هیچ جواب

یا خضریؔ لاری کا یہ مصرع

در بزم او کسی به بدی هم نه برد نام

اور غالب کا یہ مصرع

ذکر میرا بہ بدی بھی اسے منظور نہیں

یا شیدائی دیوانہؔ کا یہ مصرع

باخضر کس نگفت که عمرت دراز باد

اور غالب کا یہ مصرع

دعا قبول ہو یا رب کہ عمرِ خضر دراز[۳۷]

فارسی محاروں کے سرقے:

حسرت نے ''نکاتِ سخن'' کے باب ''محاسنِ سخن'' میں اساتذہ کے مصرع اور شعر ''ترجمہ محاورہ فارسی'' کے ذیل میں نقل کیے ہیں ۔یہ اشعار اور مصرعے اردو شعراء، آبروؔ، شاہ حاتمؔ، میرؔ، سوداؔ، جعفر حسرتؔ، میر حسنؔ، راسخؔ عظیم آبادی، قائمؔ چاندپوری، مصحفیؔ، جراتؔ، سعادت ناصرؔ، ہوسؔ، تنہاؔ، شاہ نصیرؔ، عیشیؔ، میر ممنونؔ، زکی مرادآبادیؔ، صابرؔ دہلوی، غالبؔ، شیفتہؔ، رشک لکھنویؔ، قلقؔ، میر تقی میرؔ، بحرؔ لکھنوی، اسماعیل میرٹھی، حسرتؔ موہانی شامل ہیں۔ فارسی محاوروں کا کثرت سے ترجمہ میر تقی میرؔ نے کیا ہے۔متقدمین نے فارسی محاورے ترجمہ کر کے سرقہ کر لیے ہیں لیکن اس کا اعتراف نہیں کیا اور اب اسے سرقہ نہیں سمجھا جاتا۔[۳۸]

حسرت نے ترجمہ محاورہ فارسی کی جو مثالیں دی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ متقدمین اور متوسطین کے یہاں کثرت سے شعر کے بعض اجزاء یا پورا مصرع ترجمہ کر لیا گیا ہے حسرتؔ موہانی نے ان سرقوں کو اپنی کتاب نکاتِ سخن کے باب ''محاسنِ سخن'' میں شامل کیا ہے ۔لیکن اسے لائقِ مذمت قرار دینے کے بجائے اسے محاسنِ سخن قرار دیا ہے ۔حسرت اگر یہ مثالیں اگر ''معائبِ سخن'' کے باب میں شامل کر دیتے تو زیادہ بہتر تھا۔

فارسی شعراء کے اشعار سے مضامین لے کر انھیں اردو میں ترجمہ کرنا متقدمین کا دل پسند مشغلہ تھا۔اس مشغلے کی کچھ جھلکیاں علامہ منیر لکھنوی نے ''معیار البیان فی تحقیق اللسان'' میں جمع کر دی ہیں۔ان امثال کوتوافق،توارد، استفادہ،اخذ،ترجمہ،استقاضہ،افادہ اثر متوازیات نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سراسر سرقہ ہے۔ان اشعار کی تعداد ۱۹ ہے۔ یہ اشعار ضمیمہ میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔منیر لکھنوی نے میر،جلیل بلگرامی، ذوق،معروف، ناسخ، سودا، فغان کے اشعار نقل کیے ہیں جو اشرفؔ، ناصرعلیؔ، بیدلؔ، جلالؔ، خسروؔ، سعدیؔ، سلیمؔ، غنیؔ، قدسیؔ وغیرہ کا چربہ ہیں۔[۳۹]

سرقوں کی صدی انیسویں صدی:

شاعری میں سرقوں کا راز انیسویں صدی کے شروع میں بے نقاب ہوگیا تھا اور مختلف رسائل وجرائد میں کثرت سے مضامین اور امثال کی اشاعت کے ذریعے شعراء کی سرقہ بازی کو افشاء کرنے کی روایت تیزی سے مقبول ہو رہی تھی۔ ان حوالوں کی تفصیلات دستیاب نہیں۔حکیم ابوالعلاء ناطق لکھنوی کا مضمون جو ۱۹۳۰ء میں زمانہ کانپور میں شائع ہوا اس کے مطالعے سے اس دور میں سرقے سے متعلق غلغلے اور ہنگامے کا تھوڑا بہت اندازہ ہوتا ہے۔اس مضمون میں ناطق لکھنوی نے سرقوں کے وقوع پذیر ہونے کی عجیب دلیل دی ہے۔ فرماتے ہیں:

سرقہ کیوں ہوتا ہے؟

''سرقہ یا اخذ یا نقل یا ترجمہ یا تقلید زیادہ تر ان اشعار میں ممکن و آسان ہے جن میں کوئی مضمون معمولی الفاظ میں نظم کر دیا گیا ہو،اور جس کی خوبی کسی ایسی لطافت پر مبنی نہ ہو جس کا ذکر مذکورہ بالا دس صورتوں میں کیا گیا ہے۔مضمون کے علاوہ انتقال کی دوسری صورت یہ ہے کہ مضمون سے مضمون پیدا کر لیا جائے۔اس کو اخذ کہتے ہیں۔تیسری صورت یہ ہے کہ صرف تخیل شعری منتقل کر لی جائے۔ چوتھی صورت یہ ہے کہ اندازِ بیان لے لیا جائے،

پانچویں صورت یہ ہے کہ اسلوب نظم سے ایک خاص رخ جس شعر میں پیدا ہو کر شعر کو پر کیف و پر لطف بنا دے وہ رخ لے لیا جائے، چھٹی صورت یہ ہے کہ لفظ بہ لفظ ترجمہ کر لیا جائے، ساتویں صورت یہ ہے کہ شعر کے اجزائے معنوی و لفظی میں سے کوئی جز ومنتقل کر لیا جائے اور باقی اجزا خود اضافہ کر کے شعر مکمل کر لے کہ جس قسم کی تشبیہہ یا استعارے سے شعر میں محاکات یا ندرت پیدا کی جائے اس قسم کی چیز لے کر اسی طرح کی لطافت شعر میں پیدا کرے۔[۴۰]

یعنی سرقے کا اصل سبب سارق نہیں بلکہ وہ شاعر ہے جس نے اتنا کمزور، پھسپھسا، ہلکا کلام پیش کیا جس کے باعث اس کا سرقہ کر لیا گیا۔اس کا کلام محاسن، شاعری کا جامع ہوتا تو چور کو چوری کی جرأت نہ ہوتی۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ناطق نے فقہ کے ان اصولوں کا یہاں انطباق کیا ہے جو سارق کی سزا سے متعلق ہیں۔مثلاً اگر مال مسروقہ کھلا رکھا گیا تھا، اس کی حفاظت کا کوئی انتظام نہیں تھا اور مالک نے اسے مناسب طریقے سے محفوظ نہیں کیا تو اس صورت میں چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جائے گی۔ناطق نے اس کلام کی دس صفات بیان کی ہیں جو ہمیشہ سرقے سے محفوظ رہے گا اور مثال کے طور پر انھوں نے ''حافظ'' کا حوالہ دیا ہے کہ حافظ اور ان کے ہم رنگ شعراء کے کلام سے چوری بہت کم ہوئی ہے۔کیوں کہ حافظ کے کلام کی چوری ممکن ہی نہیں۔[۴۱]

ناطق کی بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعراء کو اعلیٰ درجے کی شاعری کرنی چاہیے تا کہ سرقے کا امکان نہ ہونے کے برابر ہو ورنہ سارق کو سرقے سے روکنا ناممکن ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ:

شاعری کا سرقہ روکنے کی دس ترکیبیں:

عموماً نثر میں اور خصوصاً نظم میں چند صورتیں ایسی ہیں کہ سرقہ وترجمہ ناممکن ہے۔مثال میں صرف فارسی و اردو کے شعر پیش کرتا ہوں، اسی پر دوسری زبانوں کا بھی قیاس کر لینا چاہیے۔

[۱] حروف والفاظ کی آواز تلفظ سے اگر کوئی کیفیت یا محاکات پیدا ہو تو اس کا ترجمہ نہیں ہوسکتا اور اگر ہو تو بے کار ہے۔ مثلاً فردوسی کا یہ شعر:

زنــقـــاره آواز آمــد بـــرون که گردون دون است دون ودون

اس شعر کا مقصود اصلی یہ ہے کہ نقارے کی آواز منقوش کی جائے اور مفہوم شعر یہ ہے کہ نقارے کو آسمان سے تشبیہ دے کر آسمان کو ہیچ و ناچیز بتایا جائے۔ گو کہ تشبیہ کے لیے علامہ دوانی اور محقق طوسی نے یہ شرط لگائی ہے کہ مشبہ سے مشبہ بہ کو افضل ہونا چاہیے اور درحقیقت نقارے سے آسمان کا افضل و اعلیٰ ہونا ظاہر و اظہر من الشمس ہے۔ مگر فردوسی کے خدائے سخن ہونے کے یہی اسباب ہوئے کہ ترکیب تشبیہ کو پنہاں کر کے نقارے کو گردوں سے بہتر دکھاتا اور نقارے کی آواز پیدا کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس کا ترجمہ کرے خواہ کوئی زبان کیوں نہ ہو تو نہ یہ تخئیل آسکتی ہے نہ یہ محاکات ہوسکتی ہے یا یہ کہ امیر خسرو کا مقصد تھا کہ ایک صاحب [جوان کے مرشد کے پاس بیٹھے ہوئے گویا مکان کا قبالہ لکھوانا چاہتے تھے اور کھانا کھا لینے کے بعد بھی جمے رہے] اٹھ جائیں اور سمجھ جائیں کہ ان سے تشریف لے جانے کی درخواست کی گئی ہے۔ حضرت نظام الدین کے اس سوال کے جواب میں کہ نوبت جو آدھی رات کی نوبت تھی" کیا کہتی ہے" امیر خسرو نے فی البدیہہ اپنے اس مقصد کی تصویر اور اس کی محاکات ان الفاظ میں دکھائی:

"نان که خوردی خانه برو، نان که خوردی خانه برو، خانه برو،

خانه برو نه که بدست تو کردم خانه گرو، خانه برو خانه برو."

اب اگر اس کا ترجمہ کیا جائے گا تو یہ آواز پیدا نہیں ہوسکتی کیوں کہ ترجمہ میں یہ حروف کہاں، اور یہ وزن کہاں۔

دوسری طرف ترجمہ نہ ہوسکنے کی یہ ہے کہ شعر کی تخئیل یا محاکات کا دار و مدار محاورات پر ہو اور محاورے کا ترجمہ اول تو محاورے میں ہو نہیں سکتا، دوسرے یہ کہ اگر ہو بھی تو

محلِ استعمال میں فرق ہو جاتا ہے۔ مثلاً پہلو زدن" فارسی میں محاورتاً ایسے موقع پر کہا جاتا ہے جب کسی چیز کو کسی چیز کے برابر لا کے اسے اس سے بڑھا دینا مقصد ہوتا ہے۔ اس محاورے کو رضی سمرقندی ایسے موقع پر صرف کرتا ہے کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔

ستاره ایست دُرِ گوش آن هلال ابرو　　　　زروی حسن به خورشید می زند پهلو

میرا خیال یہ ہے کہ "می‌زند پہلو" کا ترجمہ اردو نثر میں بھی نہیں ممکن، بھلا شعر میں ترجمہ کہاں ہو سکتا ہے۔ بلکہ صائب ایسا قادر الکلام اور مسلم الثبوت استاد وہ بھی اس محاورے کو اس طرح نہ کہہ سکا۔

زند پهلو به گردون کوه عصیانی که من دارم　　　　به صد دریانه گرد د پاک دامانی که من دارم

یا خواجہ درد کے اس شعر میں محاورات ہی نے خوبیاں پیدا کی ہیں جو کہ ترجمہ میں ادا نہیں ہو سکتیں۔

ساقیاں لگ رہا ہے چل چلاؤ　　　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

تیسری صورت یہ ہے کہ صنعت ایہام جس شعر میں کسی لفظ دو معنی سے پیدا ہو جاتی ہے تو یہ مشکل ہے کہ اس کے ترجمہ میں بھی ایسا ہی ذو معنی لفظ مل جائے اور وہ صنعت اور وہی خوبی پیدا ہو جائے۔ صائب کہتا ہے:

اهل کمال رالبِ اظهار خامشی است
منت پذیر "ماهِ تمام" از هلال نیست

پہلے مصرع میں یہ مضمون بطور دعویٰ ہے کہ صاحبانِ کمال کو اپنے کمال کے اظہار میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں پڑتی، ان کا خاموش رہنا خود لبِ اظہار ہے، دوسرے مصرع میں ثبوت مثالیہ پیش کرتا ہے کہ "ماہ ہلالی" جب تیس دن کا ہو کر مکمل ہو جاتا ہے تو پھر چاند دیکھنے یعنی ہلال کے نمودار ہونے کی احتیاج نہیں رہتی۔ اس شعر میں "ماہ تمام" کے دوسرے معنی "بدر" کے بھی ہیں اور خیال اسی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اسی لیے اس میں ایہام ہے اور اسی میں لطف ہے ترجمہ کے بعد یہ

خوبی کہاں یا حضرت امیر مینائی نے اسی طرح ایک ذومعنی لفظ استعمال کیا ہے:

کیا غم ہے خزاں میں جو نہیں طاقت پرواز نکلیں گی جو "کلیاں" تو نکل آئیں گے پر بھی

چوتھی صورت یہ ہے کہ صرف ایک ہی لفظ کی تکرار مصرع میں جو بظاہر مہمل ہو مگر استعمال کا خاص طریقہ مفہوم پیدا کردے جیسا کہ سوز کا یہ قطعہ ہے:

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے

وہاں دیکھے کئی طفلِ پری رو ارے رے رے رے ارے رے رے رے رے

تیسرے مصرع کے آخر میں "ریرو" اور پھر "رے رے" کا ریند ھا دیکھنے میں تو نری "ریں ریں" ہے مگر ہر زبان میں ایسی آوازیں ہوتی ہیں جو معناً مہمل اور استعمالاً کسی کیفیت کو ظاہر کرتی ہیں بلکہ انہی سے محاکات ہو جاتی ہے۔آب حیات نے اس سے یہ مفہوم پیدا کیا ہے کہ غش آیا چاہتا ہے۔ یہاں تک کہ غش آ گیا مگر فی الحقیقت یہ منشا اس کا نہیں ہے بلکہ یہ اس کیفیت کا چٹخارا ہے جو کسی قلبی لذت کو آواز کے ذریعہ سے ظاہر کیا جائے۔غش کی محاکات "ارے رے رے رے رے" یعنی پہلا لفظ "ارے" پھر "رے رے" کی تکرار سے ہوتی ہے اور اس میں تین مرتبہ "ارے رے" مکرر ہے دونوں میں بہت نازک فرق ہے۔

پانچویں صورت یہ ہے کہ حروف روابط یا علامات تشبیہ وغیرہ کسی لفظ سے اس طرح مربوط و چسپاں ہو جائیں کہ ان کی تبدیلی سے محاکات برباد ہو جائے، ایسی حالت میں بھی ترجمہ بیکار و بے اثر ہو جاتا ہے، مثلاً لفظ "چندانکہ" علامت تشبیہ ہے۔امید رازی نے اس کو ایک شعر میں ایسا چسپاں کیا ہے کہ اگر اردو میں اس کا ترجمہ کیا جائے تو وہ کیفیت جو اصل شعر میں ہے پیدا نہیں ہوسکتی۔

کاش گردوں از سرم بیروں برد سودائے تو یا مرا صبرے دھد چندانکہ استغنائے تو

چھٹی صورت یہ ہے کہ شعر یا مصرع مجموعی حیثیت سے اس قدر سلیس وصاف اور زبان وادب کی صفائی سے سہل ممتنع ہو جائے کہ اس کا کیف واثر اس کی مجموعی حالت سے

وابستہ ہو، ترجمہ میں اس کی تاثیر ہرگز نہیں آسکتی:

عرفیؔ:

عرفی اگر بگریہ میسر شدی وصال　　　صد سال میتوان بہ تمنا گریستن

مومنؔ:

کسی کا ہوا آج کل تھا کسی کا　　　نہ ہے تو کسی کا نہ ہوگا کسی کا

قدسیؔ مشہدی:

بیگانۂ آشنا نما تو　　　تو بیگانہ نمائی آشنا من

ذوقؔ:

تو جان ہے ہماری اور جان ہی ہے سب کچھ　　　ایمان کی کہیں گے ایمان ہی ہے سب کچھ

انوریؔ:

در آدر آکہ ز تو کارمن بجان افتاد　　　عجب عجب کہ ترا یاد دوستان آمد

امیرؔ:

ان کو آتا ہے پیار پہ غصہ　　　مجکو غصے پہ پیار آتا ہے

عبدالرحیم خان خاناں:

شمار شوق ندانستہ ام کہ تاچند است　　　جز این قدر کہ دلم سخت آرزو منداست

ساتویں صورت یہ ہے کہ نظم کا انتظام الفاظ مکرر کے الٹ پھیر سے ایسا کیا جائے کہ صرف تنظیم ہی شعر میں کیفیت شعری پیدا کر دے۔ ترجمہ میں یہ اہتمام مشکل ہے۔

نواب عاقل خاں رازیؔ:

عشق چہ آسان نمود آہ چہ دشوار بود　　　ہجر چہ دشوار بود یار چہ آسان گرفت

آٹھویں صورت یہ ہے کہ کوئی مثل مکمل نظم ہو جائے، ظاہر ہے کہ محاورہ و مثل کا ترجمہ دوسری زبان میں اور اسی خوبی سے مشکل ہے۔

ناطق مکرانی:

پیالہ در کفم و محتسب ز دیر گذشت   رسیدہ بود بلائی ولی بخیر گذشت

ذوقؔ:

بد نہ بولے زیرِ گردوں گر کوئی میری سنے   یہ گنبد کی صدا جیسی کہے ویسی سنے

مصطفیٰ علی خاں خوشدل:

بوسم منِ بی برگ و نوا برگِ حنارا   تا بوسہ بہ پیغام دھم آن کفِ پارا

نویں صورت یہ ہے کہ کسی ترکیب سے بہت سا مضمون تھوڑے سے الفاظ میں آجائے اور وہ ترکیب اس زبان کے لیے مخصوص ہو جیسا کہ فارسی میں اضافتیں اور مختلف ترکیبیں جتنے مضمون کو سمیٹ لیتی ہیں کسی اور زبان خصوصاً اردو میں غیر ممکن ہے اور فارسی شاعری کا جنگل مضامین کے لحاظ سے جتنا گنجان ہے دنیا کی ہر زبان اتنے کم الفاظ میں اتنا مضمون پیش نہیں کرسکتی۔ عربی و سنسکرت میں یہ خصوصیت ضرور ہے کہ اکثر الفاظ اس قدر کثیر المعنی ہیں کہ ایک ایک لفظ کے بیسوں معانی ہیں اور ایک ایک مفہوم کے لیے صدہا الفاظ ہیں، مگر یہ صورت دوسری ہے اور میں جو کہہ رہا ہوں وہ یہ ہے کہ ترکیب اضافی کی چھ صورتیں اور توصیفی کی چند صورتیں اور اسم فاعل کا اختصار اور مختلف مرکب ٹکڑے [جیسے نو دولت، شیر دل وغیرہ] یہ سب مرکبات جو الفاظ کے لحاظ سے مختصر اور معانی کے اعتبار سے وسیع ہیں تمام زبانوں میں موجود نہیں ہیں۔ تلمیحات البتہ اکثر زبانوں میں موجود ہیں مگر یہاں اس سے بحث نہیں ہے۔ بہرحال فارسی کے ایسے ایک شعر کا ترجمہ اردو وغیرہ کے ایک شعر میں نہیں ہوسکتا۔

غالبؔ:

زلکنت می تپد نبض رگ لعل گھر بارش   شہید انتظار جلوۂ خویش است گفتارش

[ترجمہ] ہکلانے سے یاقوت [لب] جس سے موتی برستے ہیں اس [لعل لب]

کی نبض والی رگ تڑپتی ہے [یا پھڑکتی یعنی جنبش کرتی اور کانپتی ہے] [گویا] اس کی گفتگو خود اپنے جلوے کے انتظار میں شہید ہے ۔ یہ صرت ترجمہ ہوا اس کے مناسبات اور لطائف لفظی و معنوی اس ترجمہ میں نہیں آئے ۔ یہ رنگ مرزا عبدالقادر بیدلؔ، جلال اسیرؔ، شوکتؔ بخاری، غنیؔ کشمیری اور چند شاعروں کے یہاں زیادہ ہے ۔

اس نویں صورت کے علاوہ باقی تمام صورتیں حافظ کے کلام میں بہ کثرت ہیں اسی وجہ سے ان کے اور ان کے ہم رنگ شعراء کے یہاں سے چوری بہت کم ہوئی ہے ۔

دسویں صورت یہ ہے کہ شعر میں کسی خاص ملک کا ذوق ہو اور دوسرے ملک میں وہ مذاق قابل تعریف نہیں ہے تو اس مضمون کے منتقل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہوتی ۔ مثلاً فارسی کے اکثر اشعار میں ''من آں مرغم'' دیکھا گیا ہے، اردو میں اپنے آپ کو طائر تو کہہ سکتا ہے مگر مرغ یا مرغا نہیں کہہ سکتا ۔ یا ملا روز بہ شیرازی کا یہ شعر:

بہ ملک حسن بہ خوبی سر آمد است آں زلف کہ در نسبت بہ دو جانب ز آفتاب رسد [۴۲]

اردو نثر میں سرقے کی روایت:

اردو شاعری میں سرقے کی رسم ابتداء سے عام تھی لیکن اردو نثر میں سرقہ کب سے شروع ہوا تاریخ اس باب میں خاموش ہے ۔ دستیاب معلومات کے مطابق سرقے پر سب سے شدید ردعمل کا اظہار لکھنؤ کے ''الناظر'' کے شمارے مئی ۱۹۱۹ء میں کیا گیا ۔

سرقوں کی روکنے کی تحریک:

ہندوستان کے شعراء وادباء میں ادبی سرقوں کی وباء کو روکنے کے لیے رسالہ الناظر لکھنؤ نے ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا مجلس احتساب'' قائم کی ۔ اس مجلس کی پہلی اور غالباً آخری طویل دستاویز الناظر میں ''سرقہ کا دور مجیرہ'' کے نام سے شائع ہوئی ۔ دستاویز کا مرکزی خیال یہ تھا کہ '' کانفرنس کے سامنے ایک لمبی فہرست ایسے جرائم [سرقوں] کی موجود ہے ۔[۴۳]

سرقے کے خلاف ''الناظر'' کی دستاویز:

الناظر میں شائع شدہ دستاویز سرقہ کا دو ورقہ کا متن درج ذیل ہے:

''سرقہ کی رسم قبیح عہد عتیق کی یادگار ہے۔ اس رسم کی قباحت مسلم ہے، ہر قوم، ہر ملک، ہر وقت اور ہر زمانے میں اس کو مذموم و قبیح سمجھتی رہی ہے۔ یہاں تک کہ خداوند قدوس نے بھی اس کے سدباب کو ضروری سمجھا۔ چناں چہ منجملہ اور ذمائم و جرائم کی سزا و حدود مقرر فرمانے کے ساتھ سرقہ کی بھی ایک حد یعنی سزا مقرر فرمائی۔ چناں چہ قانون الٰہی کے اصل الفاظ یہ ہیں السّارق و السّارقة فاقطعوا ایدھما یعنی عورت و مرد جو بھی سرقہ کرے اس کے ہاتھ قطع کر دو، لیکن اس دنیا میں جو بدی و برائی کا بیج ایک مرتبہ بو دیا جاتا ہے پھر ہزار سعی کیجیے کہ وہ نہ اگے اور بالکل تباہ و برباد ہو جائے بالکل بے سود ہے اور یقیناً اس میں برگ و بار آئیں گے۔ چناں چہ بدی کی یہ رسم بھی باوجود تدابیر ممکنہ نہ رک سکی اور نہ مٹ سکی بلکہ زمانہ کے ارتقاء کے ساتھ یہ بھی تدریجی ترقی کرتی رہی۔ اس رسم مذموم کا سب سے پہلا قدم جو بڑھا وہ شعراء کی طرف سے تھا۔

فارسی کا پہلا سارق امیر مقری ملک الشعراء تھا:

یہ تو معلوم نہیں کہ اس گروہ میں سب سے پہلے اس رسم کی کس نے پذیرائی کی۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ یہ ایران کے راستے سے ہندوستان میں داخل ہوئی اور ایران میں جس نے سب سے پہلے سرقہ کیا وہ شاید امیر مقری تھا جو سلطان سنجر کا ملک الشعراء تھا جس نے سیف الدولہ کے خیالات متعلق بہ قوس قزح کو بالکل اپنا بنا کر پیش کیا۔ پھر تو رفتہ رفتہ اس طبقے میں یہ رسم عام ہو گئی چوں کہ اردو شاعری فارسی شاعری کے زیر اثر عالم وجود میں آئی اس لیے جب یہاں شعراء حشرات الارض کی طرح پیدا ہو گئے تو یہاں بھی یہ رسم وبا کی طرح عام ہو گئی۔ چناں چہ آپ ایسے شعراء کا کلام اٹھا کر دیکھیں سرقہ سے مملو ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ زمانے نے ان کو بالکل نیست و نابود کر دیا۔ لیکن پہلے سرقہ کا یہ طریقہ تھا کہ غیر معروف اور

گزشتہ لوگوں کے خیال کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتے تھے۔ایک عرصے تک یہی دستور رہا۔پھر ایک زمانہ ایسا آیا کہ معاصرین کے خیالات ونتائج افکار کو حک واضافہ کے بعد اپنا بنا کر پیش کیا جانے لگا چناں چہ میر انیس مرحوم کو کہنا پڑا:

لگا رہا ہوں مضامین نو کے پھر انبار خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

لیکن یہاں تک بھی غنیمت تھا کہ اس کا اثر صرف نظم کے اندر محدود رہتا تھا،ستم تو یہ ہوا کہ نثر بھی نہ بچی اور اس پر بھی بغیر کسی زحمت کے قبضہ ہو گیا۔

ہندوستانی صحافت سرقے کی صحافت ہے:

ہندوستان کی صحافت کی جب بھی تاریخ مدون کی جائے گی تو سرقہ کا ایک مستقل باب قائم کرنا پڑے گا کیوں کہ یہاں کی صحافت کی ترقی کا دارومدار اسی ایک صنعت پر رہ گیا ہے۔جرائد واخبارات کی کثرت کے ساتھ مضمون نگاری بھی کثرت ہو گئی ہے۔جس شخص کو کاغذ پر دو چار الٹی سیدھی لکیریں کھینچنی آ گئیں انشا پرداز ہو گیا۔حالاں کہ اگر آپ غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مولانا صاحب کا اس میں ایک حرف نہیں ہے،کسی دوسرے کا مضمون سامنے رکھا اور اس کی صورت مسخ کر کے ایک مضمون تیار کر لیا۔

قاعدہ ہے کہ ہر شخص کا ایک مخصوص رنگ انشاء ہوتا ہے۔یعنی تحریر کی روش ہر شخص کی جدا ہوتی ہے اور ایک خاص اسٹائل ہوتا ہے جس میں وہ ہر قسم کے مضامین لکھتا ہے،مگر گروہ سارقین میں یہ بات نہیں ہوتی۔کیوں کہ ذاتِ خاص کا کچھ بھی نہیں ہوتا۔جس کے مضمون سے سرقہ کیا اسی کا رنگ آ گیا۔ایسی صورت میں کوئی خاص رنگ کیوں کر قائم ہو سکتا ہے۔ایک زمانے میں ہندوستان کے ایک مشہور رسالہ کو ایڈٹ کرتا تھا۔اس قسم کے اہل قلم کا مجھ کو اس وقت خوب تجربہ ہوا ہے۔کوئی صاحب مضمون کے ساتھ منت وسماجت کا خط لکھتے ہیں۔بہر خدا ہمیں بھی کہیں چھاپ دیجیے۔

..........غرض یہ کہ اس قسم کے مضامین نگار آج کثرت سے پیدا ہو گئے ہیں،ان کا

استقراءِ تامہ محال ہوگیا ہے اور مجھے کہنے میں کوئی حجاب نہیں کہ اس خرابی کے باعث خود ایڈیٹر صاحبان ہیں۔

سارقوں کی فہرست طویل:

مجھے نہیں معلوم کہ میری طرح اور لوگ بھی ملک کی اس نئی ترقی سے واقف ہیں یا نہیں مگر میں ایک عرصہ سے واقف تھا چناں چہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وقت میرے سامنے ایک طویل فہرست ایسے فاضل مضمون نگاروں کی موجود ہے جن کی کارگاہ شہرت کا دارو مدار سرقہ کی رسم قدیم پر ہے۔اس معاملہ میں جب میری معلومات اس قدر وسیع ہوگئیں تو میں نے خیال کیا کہ بعض دیگر بہی خواہان ملک وقوم کو اس سے آگاہ کروں۔اتفاق سے جن جن بزرگوں سے میں نے ذکر کیا وہ بھی اس سے واقف نکلے۔

چناں چہ اس اہم معالے کی نسبت دیر تک گفتگو رہی اور یہ طے پایا کہ ایک آل انڈیا احتساب کانفرنس قائم کی جائے جس کا مقصد یہ ہو کہ پہلے خفیہ طریقے سے ان حضرات کو متنبہ کیا جائے۔اگر کوئی مفید نتیجہ نہ نکلے تو اس گروہ میں سے کسی ایک شخص کو پبلک میں لے آئیے تاکہ دوسروں کو اس سے عبرت و تنبیہ ہو، چناں چہ زیر نقاب کارروائی ہو چکی مگر کوئی اثر نہ ہوا۔اس لیے آج حسب قرارداد کانفرنس اس قوم کے ایک فرد کا حال مع اسناد و ثبوت پبلک میں پیش کیا جاتا ہے۔یہ واضح رہے کہ محض خیالات کی یکسانیت سے بدظنی نہیں قائم کر لی گئی ہے۔آپ دیکھیں گے کہ سرقہ صرف خیالات کا نہیں کیا گیا بلکہ الفاظ و عبارت کا سرقہ کیا گیا ہے۔پورے پورے پیراگراف نقل کیے گئے ہیں بلکہ جس مضمون سے سرقہ ہوا ہے اس کی صورت مسخ کر کے جا بجا حذف و اضافہ کر کے پیش کیا گیا ہے۔اس حیرت آباد عالم میں جرأت و جسارت کی ایسی ملعون مثالیں آپ کو کم ملیں گی جیسی آپ آگے چل کر ملاحظہ فرمائیں گے۔کانفرنس کے سامنے جو طویل فہرست ہے اس کے سرخیل ادیب جلیل حضرت مولانا مولوی منشی محمد الدین صاحب المتخلص بہ خلیقی وسابق المکنی بہ ابی الآزاد و بعدہ بابی المعانی وحال

کدیتہ ابوالمعالی ہیں''۔

اس کے بعد ''الناظر'' نے ابوالآرا خلیقی کے سرقہ شدہ مضامین کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے۔ یہ مضامین رسالہ ''نظام المشائخ'' اور ''اسوہ حسنہ'' میں کثرت سے شائع ہوتے تھے۔حیرت انگیز بات ہے کہ ان رسائل کے مدیر ابوالکلام آزاد کے اسلوب تحریر سے اس قدر بے خبر تھے کہ وہ سارق کو پہچان نہ سکے۔

''الناظر'' مزید لکھتا ہے''اس وقت تک جس قدر مضامین ہماری نظر سے گزرے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اکثر و بیشتر صنعت مسروقہ میں لکھے گئے ہیں اور چوں کہ ہمیشہ ہر دور میں آپ کا اسٹائل بدلتا رہا۔آپ نظام المشائخ اور اسوۂ حسنہ کی جلدیں اٹھا کر دیکھیے آپ یہ فرق بہت جلد محسوس کرلیں گے۔لیکن دورآخر میں چوں کہ الہلال پیش نظر رکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ الہلال ہی کے کسی نہ کسی نمبر سے ماخوذ و مسروق ہے اس لیے ابوالکلامیت ہر جگہ بول رہی ہے۔

سرقہ فن کے طور پر کیا جائے تو ہرج نہیں:

آل انڈیا احتساب کانفرنس،سرقہ کی اس قدر شدید مخالف نہیں کہ محض ایک آدھ خیال کے سرقے پر کسی کی پگڑی اتارلی بلکہ حقیقت میں ان لوگوں کی مخالف ہے جو اس فن کی بحیثیت فن توہین کرتے ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ سرقہ ایک مرتب فن ہے اس کے جو اصول وضوابط ہیں اگر ان کو ملحوظ رکھ کر پوری رازداری کے ساتھ انجام دیا جائے تو چنداں عیب نہیں۔

''الناظر کے صفحات میں سرقہ شدہ مضمون کی اشاعت:

نثر میں سرقے کا دوسرا بڑا واقعہ ۱۹۳۰ء میں پیش آیا اور حیرت انگیز بات یہ تھی کہ یہ سرقہ ''الناظر لکھنؤ'' کے صفحات پر جنوری ۱۹۳۰ء میں مولوی حکیم سید انیس شاہ، احمد قادری، الرزاقی کے قلم سے شائع ہوا۔ یہ وہی الناظر تھا جس نے ۱۹۱۹ء میں آل انڈیا احتساب کانفرنس قائم کرکے سرقے کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تھا۔

پنڈت کیفی کے مضمون کا سرقہ:

مولوی حکیم انیس شاہ نے پنڈت کیفی کے ایک خطبے شمس العلماء حضرت آزاد مرحوم کو من وعن اپنے نام سے شائع کیا۔ یہ خطبہ آلہ آباد کے رسالے ادیب بابت مارچ ۱۹۱۰ء میں طبع ہوا تھا۔ بعد میں یہ خطبہ پنڈت صاحب کی کتاب ''منشورات میں شامل کیا گیا۔ منشورات پنڈت کیفی کے مختلف خطبات کا مجموعہ ہے۔ یہ خطبے ہندوستان بھر میں دیے گئے تھے۔ پنڈت جی ان خطبات کی اشاعت سے پہلے نظر ثانی، ترمیم اور اضافے کا ارادہ رکھتے تھے۔ لیکن الناظر میں ان کے مضمون کی سرقہ شدہ صورت کی اشاعت کے بعد پنڈت نے یہ ارادہ ملتوی کر دیا اور ہنگامی بنیادوں پر ۱۹۴۲ء میں منشورات کی اشاعت کا فیصلہ کیا تاکہ سارقین دوسرے خطبات پر ہاتھ صاف نہ کر سکیں۔ منشورات کے شروع میں ''پہلے ایڈیشن پر نوٹ'' کے نام سے ناشر کا نوٹ ملاحظہ کیجیے:

حضرت کیفی ابھی ان لکچروں اور مضامین [منشورات] کو اس صورت میں طبع کرنا پسند نہیں کرتے تھے کیوں کہ ان میں سے بعض کی نظر ثانی کرنی تھی جس کی ان کو اس وقت فرصت نہیں۔ لیکن جب ان کو یہ بتایا گیا کہ آپ کے مضامین کے صفحوں کے صفحے لوگ سرقہ کر رہے ہیں تو مسکرا کر فرمایا کہ اب ضرور شائع کر دو۔ کیوں کہ اب یقین ہو گیا کہ ان میں کچھ ہے اور وہ نشر و اشاعت کے مستحق ہیں۔

یہاں ایسے سرقہ بالنثر کی صرف ایک نظیر دی جائے گی:

حضر ممدوح نے جناب آزاد مرحوم کے سانحہ پر ایک مضمون لکھا تھا جو شمس العلماء حضرت آزاد مرحوم'' کے عنوان سے ان کے نام پر الہٰ آباد کے مشہور مگر اب مرحوم رسالہ ادیب بابت ماہ مارچ ۱۹۱۰ء میں چھپا تھا اور جیسا کہ اس کا حق ہے۔ بہت مقبول ہوا۔ اس کے بیس برس بعد ایک صاحب مولوی حکیم سید شاہ انیس احمد قادری الرزاقی نے جنوری ۱۹۳۰ء سے لکھنؤ کے الناظر میں ایک سلسلہ مضامین شروع کیا جس کا عنوان تھا ''ادبا و دبیات اردو''۔

اس سلسلے کے دوسرے نمبر مندرجہ الناظر بابت فروری ۱۹۳۰ء [جلد ۲۷، نمبر ۲] مولوی حکیم انیس احمد صاحب مذکورہ سطریں ہی نہیں صفحے کے صفحے ادیب کے مذکورہ صدر مضمون سے اپنی تحریر میں ملا کر بلا تکلف نقل کیے جاتے ہیں۔ بالکل اس طرح کہ گویا وہ ان کے رشحات قلم ہیں۔ نہ اقتباس کے لیے واوین کا نشان ہے نہ ادیب کا حوالہ۔ نہ اصل مصنف کے قول کا ذکر، نہ ایسے ہی مبہم فقرے۔ ''یہ جوان کی نسبت کہا گیا ہے''۔ ''کسی نے ان کے متعلق ٹھیک لکھا ہے'' وغیرہ۔ تمثیل کے طور پر یہاں تشریح کی جاتی ہے:

ادیب، مارچ ۱۹۱۰ء	الناظر فروری ۱۹۳۰ء
۱۔ صفحہ ۱۱۴ کالم ۲ سطر ۵ [نیچے سے] ''آزاد واقعی اسم با مسمّٰی تھے'' سے لے کر صفحہ ۱۱۵ کالم ایک، سطر ۶ تک:	۱۔ ۹، سطر ۵ [نیچے سے]: سے لے کر صفحہ ۱۰ سطر ۳ تک ۷ سطریں۔
۲۔ صفحہ ۱۱۵، کالم ۲، سطر ۶، ''یہ کہنا ایک امر واقعی ہے'' سے لے کر آزاد کی تصنیف سے ہیں'' تک	۲۔ صفحہ ۱۰، سطر ۴ سے سطر ۹ تک، ۶ سطریں،
۳۔ صفحہ ۱۱۶، کالم ۱، آخری سطر سے سطر ۶ کالم ۲ تک، ''حق الامر یہ ہے'' سے نظارہ افروز کریں'' تک	۳۔ صفحہ ۱۰ سطر ۱۱ سے سطر ۱۴ تک، ۴ سطریں۔
۴۔ صفحہ ۱۱۸، کالم ۱، سطر ۱۳ سے ۱۴ تک، ''اور یہ صاحب ہمت'' سے فرماتے ہیں تک۔	۴۔ صفحہ ۱۱، سطر ۴ [نیچے سے] ایک سطر
۵۔ صفحہ ۱۱۹، کالم ۱، سطر ۱۰ سے سطر ۲۰ تک ''سب سے زیادہ غور کے قابل'' سے ''بیان کی ہے تک''	۵۔ صفحہ ۱۰، سطر ۱۰ سے سطر ۲۱ تک، ۷ سطریں

۶۔صفحہ ۱۲۰، کالم ۱، سطر ۱ سے شروع سطر ۵ تک ''مثنوی صبح امید کی تمہید'' سے شاہراہ بنا دی تک	۶۔صفحہ ۱۲، سطر ۱۹ سے صفحہ ۱۳، سطر ۳ تک، ۱۰ سطریں۔
۷۔صفحہ ۱۲۰، کالم ۱، سطر ۲۰ سے صفحہ ۱۲۱، کالم ۱، سطر ۹ تک	۷۔صفحہ ۱۳، سطر ۴ سے صفحہ ۶، سطر ۱، تک ۲۳ سطریں
۸۔صفحہ ۱۲۱ کالم ۱، آخری سطر سے کالم ۲ سطر ۲ تک، ''اگر نیرنگ خیال'' کے سر پہ ہے '' تک	۸۔صفحہ ۱۴، سطر ۲ سے سطر ۴ تک، ۳ سطریں
۹۔صفحہ ۱۲۲ کالم ۱، سطر سے سطر ۱۴ تک ''آزاد اگر چہ'' سے ''کمیاب ضروری ہے'' تک	۹۔صفحہ ۱۴، سطر ۵ سے سطر ۱۳ تک، ۹ سطریں۔
۱۰۔صفحہ ۱۲۲، کالم ۱، سطر ۱۶ سے کالم ۲ سطر ۵ تک ''میدان سخن'' سے ''پھر کہوں گا'' تک	۱۰۔صفحہ ۱۱۴، سطر ۱۴، سے صفحہ ۱۵، سطر ۱ تک، ۱۳ سطریں۔

مختصر یہ کہ آزاد سے متعلق جو کچھ بھی ان حضرات نے لکھا وہ یا تو لفظ بہ لفظ جناب کیفی کے مضمون سے جوں کا توں یا اس سے ماخوذ اور اپنے الفاظ میں۔اوپر دیے گئے حوالہ بجنسہ بلا تصرّف لفظی کے اصل مضمون مندرجہ ادیب سے لیے گئے ہیں۔

مال مسروقہ کی یہ لمبی فہرست دیکھ کر جناب کیفی نے مسکرا کر یہ فرمایا کہ میں غنیمت سمجھتا ہوں کہ سارق نے مسروقہ جیسا تھا ویسا ہی بازار میں لا کر رکھ دیا اس کا چہرہ نہیں بگاڑا۔[۴۴]

ماہنامہ معاصر پٹنہ اور سرقہ:

اکتوبر ۱۹۴۳ء کے ماہنامہ ''معاصر'' پٹنہ میں سید علی اکبر قاصد نے جو خانوادہ پھلواری شریف کے فرزند تھے عصمت چغتائی کی ''ضدی'' کوتر کی کی مصنفہ کے ناول ''ہاجرہ''

کا چربہ ثابت کیا۔ یہ ناول انگریزی زبان میں لکھا گیا تھا۔ اس کا اردو ترجمہ ۱۸۹۹ء میں مطبع مفید عام آگرہ سے شائع ہو چکا تھا۔ ۴۲ سال بعد اس کتاب کا چربہ عصمت چغتائی نے اتارا لطف کی بات یہ تھی کہ چربہ کرتے ہوئے اصل انگریزی ناول کو مشق ستم بنانے کے بجائے اردو ترجمہ پر انحصار کیا گیا۔[۴۵]

یورپی شعراء کے عربی فارسی شاعروں سے سرقے یا توارد:

یورپ کے ادب کی مشرقی تحریک عموماً اور جرمن ادب کی تحریک خصوصاً اس قابل ہے کہ اس پر مفصل تحقیق کی جائے۔ اس تحریک کی پیداور ترجمے بھی ہیں، جو زبانوں کو علمی و ادبی سرمائے سے بہرہ ور کرتے ہیں اور نظم و نثر کی وہ تصنیفات بھی ہیں جو مشرقی شاہکاروں کے تتبع میں یا ان سے متاثر ہو کر وجود میں آئیں۔ ان کے علاوہ وہ مختلف اور مفید کتابیں بھی ہیں جو مشرق کے علوم و فنون، رسم و رواج تاریخ و جغرافیہ اور مختلف انسانی اور طبعی خصوصیات کے متعلق لکھی گئیں۔ بعض اوقات مشرقی طرز فکر اور گرمی تخیل مغربی شعرا کے کلام میں ایسے دبے پاؤں داخل ہوتی ہے کہ شک بھی نہیں گزرتا۔ انگریزی شاعری ہی کو لیجیے۔ شیکسپیر [Shakespeare]، شیلے [Shelley]، کیٹس [Keats]، سون برن [Swinburne]، روسیتی [Rossetti]، فرانسس ٹامس [Francis Thomson] اور بہت سے دوسرے شعرا ایسے ہیں جن کی گرمی کلام، جذباتی گداز اور بلندی تخیل، ہمیں عربی اور فارسی شاعری کی یاد دلاتی ہے۔ مثال کے طور پر شیلے کہتا ہے:

She stood so robed in glory
That I beheld her not

[Epipsychidion]

وہ اپنے حسن کی تجلی میں اس انداز سے پوشیدہ تھی کہ میں اسے دیکھ نہ پایا۔

اس شعر کو غالب کے مندرجہ ذیل شعر کے برابر رکھ کر دیکھیے۔

وا کر دیے ہیں شوق نے بندِ نقابِ حسن

غیر از نگاہ اب کوئی حائل نہیں رہا

[دیوانِ غالب اردو]

یا اقبال کا شعر سنیئے۔

مرا ز دیدۂ بینا شکایتی دگر است

کہ چون بجلوہ در آیی حجاب من نظر است

[پیامِ مشرق]

مجھے اپنی چشم بینا سے ایک اور ہی شکایت ہے کہ اے محبوب! جب تو جلوہ افروز ہوتا ہے تو میری نگاہ خود میرے لیے ایک پردہ بن جاتی ہے۔

مغربی شعراء شرق کے سینے سے الہامی حرارت حاصل کرتے ہیں:

ایک انگریزی شاعر براؤننگ کہتا ہے:

Thoughts hardly to be packe'd

Into a narrow act

Fancies that broke through language and escaped

[Rabbi ben Ezra]

میرے دل میں وہ خیالات تھے جن کی پہنائی ایک محدود عمل میں نہیں سما سکتی تھی اور وہ تخیلات تھے جو الفاظ کی حدود کو توڑ کر باہر نکل جاتے تھے۔

اب غنی کشمیری کا شعر ملاحظہ فرمایئے:

اگر لب از سخن گوئی فرو بندیم جا دارد

کہ نتوان از نزاکت تاب بستن معني مارا

[دیوانِ غنی]

اگر میں سخن گوئی ترک کردوں تو بجا ہے کیوں کہ میرے معانی اتنے لطیف و نازک ہیں کہ الفاظ انھیں باندھ نہیں سکتے۔

البتہ یہ ضروری نہیں کہ ہم انگریزی شعر کے مقابلہ میں کوئی عربی یا فارسی کا شعر ہی پیش کریں۔ اصل چیز یہ ہے کہ جہاں بھی کوئی انگریز یا دوسرا یورپی شاعر مغربی دنیا کی سرد روحانیت اور بے کیف اقتصادی جدوجہد سے الگ ہو کر کچھ کہنا چاہتا ہے تو وہ دانستہ یا نا دانستہ طور پر مشرق کے سینے سے الہامی حرارت حاصل کرتا ہے۔

یوروپی شاعری پر فارسی اثرات:

فرانسس ٹامسن کی ایک نظم کا ایک بند ہے۔

She went her unremembering way

She wnet away and left in me

The pang of all he partings gone,

And partings yet to be

[Daisy]

اس نے بے نیازانہ اپنا راستہ لیا اور چلی گئی اور میرے لیے ان ساری جدائیوں کا کرب ودرد چھوڑ گئی جو اب تک نوعِ انسانی پر گزر چکے ہیں یا آیندہ پیش آنے والے ہیں۔

یہاں شاعر اپنی محبوبہ کی جدائی کو اس قدر نا قابلِ برداشت سمجھتا ہے کہ اس کے خیال میں اسے زمان ومکاں کی حدود میں مقید کرنا بھی اس کے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہ ایک مشرقی قسم کے جذبے کی عکاسی ہے۔ انگریزی میں یہ اشعار فوق العادت معلوم ہوتے ہیں، مگر حبیب یغمائی جب کہتا ہے کہ

نجوید عمرِ جاویدان ہر آنکو ہمچو من بیند

بیک شامِ فراق اندوہ عمرِ جاودانی را

جو شخص میری طرح محض ایک شامِ فراق میں ایک عمرِ جاوداں کے غم و اندوہ کا تجربہ کرے وہ کبھی عمرِ جاوداں کی خواہش نہیں کرے گا۔

تو ہمیں ٹامسن کا تخیل اور اس کا جذبہ فارسی شاعری کی روایات سے الگ محسوس نہیں ہوتا۔ فرانسس ٹامسن کی اسی نظم کا ایک اور بند ہے۔

Nothing begins and nothing ends

Thatis not paid with moan,

Fir we are born in other's pain

And perish in our own

دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی ابتدا اور انتہا اپنے اندر درد و کرب لیے ہوئے نہ ہو، خود ہم پیدا ہوتے ہیں تو ایک دوسرے انسان کا درد والم ہمارے ہمراہ ہوتا ہے۔ اور مرتے ہیں تو اپنے ہی درد و کرب میں۔

اس بند کو پڑھ کر ایسا لگتا ہے جیسے شیخ سعدی نے انگریزی میں شاعری کی ہو۔

مشرق کی پیروی میں تخلص کا استعمال:

یورپ کے شعرا اپنا نام یا تخلص شعر میں استعمال نہیں کرتے مگر کہیں کہیں غالباً فارسی کے اثر سے یہ بھی موجود ہے۔ مثلاً شیلے [Shelley] کی مشہور نظم "To Jane, A Recollection" کے آخری بند میں۔

Thought thou art ever fair and kind

The forest ever green

Less oft is peace in Shelly's mind

Than calm in waters seen

اے محبوب! اگر چہ تو ہر وقت حسین اور مہربان ہے اور جنگل ہمیشہ سرسبز اور شاداب ہے، لیکن شیلے کے دل کو سکون کم نصیب ہوتا ہے اور سمندر کو زیادہ۔

یوروپی شاعری پر عربی کا اثر:

جب ٹینی سن [Tennyson] اپنی نظم لاکسلے ہال [Locksley Hall] میں اپنی محبوبہ کے قدیم مسکن کو دیکھ کر اپنی جوانی اور ناکام محبت کو یاد کرتا ہے اور اپنے رفقا سے کہتا ہے۔

Comrades leave me here while as yet is early morn,

Leave me here and when you want me sound upon the bugle horn

اے میرے ساتھوں! مجھے یہاں چھوڑ دو اور جب تک صبح کا سماں ہے مجھے یہیں رہنے دو مجھے یہیں رہنے دو اور جب تم چاہو کہ ہم واپس چلیں تو تم اپنا بگل بجا دینا، میں چلا آؤں گا۔

تو یہ امراؤالقیس کے معلقے کی صدائے بازگشت معلوم ہوتی ہے:

قفا نبک من ذکریٰ حبیب و منزل

بسقط اللویٰ بین الدخول فحومل

''اے میرے دونوں دوستو! ٹھہرو تا کہ ہم مل کر محبوبہ کی یاد میں روئیں اور اس مسکن کو دیکھ کر آنسو بہائیں جو ریت کے ٹیلے پر دخول اور حومل کے درمیان واقع ہے''۔

واقعہ بھی یہی ہے کہ جب ٹینی سن نے یہ نظم لکھی وہ سر ایلفر ڈلائل کے سبعہ معلقہ کے انگریزی ترجمے سے متاثر تھا۔ ورنہ اپنے رفقا کو اس طرح خطاب کرنا جہاں عربی شاعری کی قدیم روایت ہے انگریزی شاعری سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہائیڈل برگ سے متعلق ایک گیت کا یہ مصرع

Die jahre sind vergangen und ich bin ganz allin,

{from ich hab' mcin Herz Hcidelberg verloren}

''سالہا سال گزر گئے اور اب میں بالکل اکیلا رہ گیا ہوں''۔

قیس عامری سے منسوب اس مصرعے کی یاد دلاتا ہے:

تذکرت لیلیٰ والسنین الخوالیا

''میں نے لیلیٰ کو اور گزرے ہوئے سالوں کو یاد کیا ہے''۔

اگر چہ یہ ضروری نہیں کہ اس مصرعے میں جرمن شاعر مجنوں بنی عامر کا مرہونِ منت ہی ہو۔

جب شیلے کہتا ہے:

Life of lifeO the lips enkindle

with their love the breath between them

[Prometheus Unbound]

اے جانِ جاں! تیرے ہونٹوں میں وہ جادو ہے کہ وہ اپنے محبت کے جذبے کی بدولت ہر سانس کو ایک نئی زندگی بخشتے ہیں۔ تو اس کے کلام میں محبت کی وہ شدت اور جذبے کی وہ حرارت محسوس ہوتی ہے جو عربی شاعری ہی کا حصہ ہے۔ ایک عرب شاعر کہتا ہے:

لیس الفؤاد محل شوقک وحدہ

کل الجوارح فی ھواک فؤادہ

صرف میرا دل ہی تیری محبت کا مرکز نہیں ہے بلکہ میری تو یہ کیفیت ہے کہ تیری محبت میں میرا انگ انگ دل بنا ہوا ہے۔

یہ محض چند مثالیں ہیں جن سے عربی اور فارسی شاعری کی جذباتی گہرائی کا شعوری یا غیر شعوری اثر یورپ کی شاعری پر دکھانا مقصود ہے۔[۴۶]

دانتے کا سرقہ ابن عربی کی تصانیف سے:

اطالوی شاعر دانتے نے نہ صرف کیتھولک عقائد کا احیاء کیا بلکہ معراج کی احادیث بنویہ کی نقل کر کے گناہ گاروں کو سزایاب اور نیکوکاروں کو انعام یافتہ دکھایا۔ دانتے کا فلسفۂ عشق ابن عربی کے معروف فلسفۂ عشق کا چربہ ہے۔ ابن عربی کی ''ترجمان الاشواق'' اور ''فتح الذخائر والاغلاق'' کے مضامین ہوبہو دانتے کے ہاں موجود ہیں۔

کامیڈی میں جہنم کا نمونہ ابن عربی سے ماخوذ ہے۔ابن عربی نے جہنم کا نقشہ اقلیدس کے اصولوں پر دائروں کی شکل میں بنایا۔ دانتے نے اس کی نقل کی۔کامیڈی کا نقشہ فردوس بھی ابن عربی کی من وعن نقل ہے۔ جنت کی تعبیر میں دانتے نے دیگر تشبیہات بھی ابن عربی سے سرقہ کی ہیں یا مستعار لی ہیں۔[۴۷]

یورپ میں ادب کی مشرقی تحریک:

آرتھر رے می کی انگریزی کتاب ''ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر'' جرمن ادب کی مشرقی تحریک پر پہلی کتاب ہے۔جرمن ادب کی یہ تحریک یوروپ کے مجموعی ادب کی مشرقی تحریک کا ایک اہم اور نمایاں حصہ ہے۔اس تحریک سے سر ولیم جونس، سر الفریڈ لائل، فٹز جیرالڈ، والیٹر، وکٹر ہیوگو جیسے بڑے بڑے ستارے متاثر ہوئے، اس تحریک کی پیداوار ترجمے بھی ہیں اور نظم ونثر کی وہ تصانیف بھی ہیں جو مشرقی شاہکاروں کی تتبع میں یا ان سے متاثر ہو کر وجود میں آئیں۔شیکسپئر، شیلے، کیٹس، سون برن رویتی نامسن کے کلام کی گرمی، جذباتی گداز اور بلندی تخیل عربی اور فارسی شاعری کا اثر ہے۔مشرقی تحریک کے نتیجے میں عربی و فارسی کے تراجم سے یوروپی شعراء اور ادباء نے استفادہ کیا۔ یہ استفادہ اخذ، ترجمہ، توارد، سرقہ، اسفاضہ کی صورت میں ان کی ادبی تخلیقات میں نمودار رہا۔ ڈاکٹر آرتھر رے می کی کتاب ترجمے، سرقے، توارد، اخذ اور اثرات کی بحث کو تقابلی جائزے کے ذریعے عیاں کرتی ہے۔رے می نے گوئٹے کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مشرق سے بے حد متاثر تھا۔ عربی لباس پہنتا تھا، حقہ پیتا تھا، مشرق نے صرف اس کی شاعری کو نہیں اس کے طرز زندگی کو بھی متاثر کیا تھا۔ رے می کی کتاب کا عمدہ ترجمہ ڈاکٹر ریاض الحسن نے کیا جو ۱۹۶۷ء میں گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کراچی نے شائع کیا تھا۔[۴۸]

گوئٹے کے کلام میں سرقہ نہیں ترجمہ ہے:

گوئٹے نے قرآن سیرت رسول اور تعلیمات اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا وہ قرآن کی دوسری صورت سورہ بقرہ کے شروع کی آیات کو قرآن کا خلاصہ اور اسلام کی تعلیم کی روح سمجھتا تھا۔ گوئٹے کے ''دیوان شرقی'' میں جو اس کے اواخر ایام حیات کی یادگار ہے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس پر اسلام کا کتنا اثر تھا وہ کہتا ہے ''مشرق بھی خدا کا گھر ہے اور مغرب بھی''۔

کیا یہ ''للہ المشرق والمغرب'' کا ترجمہ نہیں ہے؟ اسی طرح جب گوئٹے لکھتا ہے کہ ''خداوندا! جب میں کسی کام میں ہاتھ ڈالوں، یا جب بھی شعر کہوں تو سیدھے راستے کی طرف میری رہنمائی کر''۔

تو کیا همیں اهدنا الصراط المستقیم'' کی آیت یاد نہیں آتی؟

دیوانِ شرقی کا ایک شعر ہے:

''اگر اسلام کے معنی یہ ہیں کہ ہم اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیں تو ہم یقیناً اسلام ہی میں جیتے اور اسلام ہی میں مرتے ہیں''۔[۴۹] گوئٹے کے ان اشعار کو پڑھنے والے بعض نقاد اسے سرقہ یا توارد قرار دے سکتے ہیں لیکن یہ ترجمہ اور اخذ و استفادہ کے سوا کچھ بھی نہیں۔

عربی زبان میں سرقے کی روایت:

ماوردی کو الاحکام السلطانیہ کے مصنف اور افکار سیاسیہ میں اسلامی اقدار کے داعی ہونے کا جو فخر حاصل ہے اس میں ایک مصنف اس کا سہیم و شریک ہے مگر اسے ماوردی جیسی شہرت اور قبولیت عامہ نہ حاصل ہو سکی۔ یہ مصنف قاضی ابویعلی حنبلی ہے۔ اس نے بھی ماوردی کے زمانہ میں الاحکام السلطانیہ نامی کتاب تحریر کی اور اسلامی سیاسی افکار متعین کیے۔ قاضی ابویعلی کی کتاب بار اول قاہرہ کے مشہور ''مطبع مصطفی البابی الحلبی واولادہ'' سے

۱۳۵۷ھ[۱۹۳۸ء]شائع ہوئی۔

اس کا نام محمد بن حسین بن محمد بن خلف بن احمد الفراء اور کنیت ابویعلیٰ ہے۔وہ ۲۸محرم ۳۸۰ھ میں پیدا ہوا اور شب دوشنبہ ۱۹/رمضان ۴۵۸ھ میں بغداد میں وفات پائی۔
جنازہ میں شرکاء کی تعداد بے حساب تھی۔بغداد کے بازار بند رہے اور جنازہ کے ساتھ نقباء' امراء قضاۃ اور فقہاء بہت بڑی تعداد میں شریک رہے۔اسے اس کی وصیت کے مطابق ان کپڑوں میں کفن دیا گیا جو اس نے خود اس مقصد کے لیے کات کر تیار کیے تھے اور امام احمد بن حنبل کے مقبرہ میں سپرد خاک کیا گیا۔قاضی ابویعلیٰ نے پانچ سال کی عمر میں حدیث کی سماعت کی۔ابوالقاسم ابن حبابہ، ابوالقاسم السراج اور اپنے والد ابوعبداللہ وغیرہ سے حدیث کی تعلیم حاصل کی۔طلب حدیث میں بغداد کے علاوہ مکہ، دمشق اور حلب کا سفر کیا۔وہ خلیفہ قائم بامراللہ [۴۲۲ھ تا ۴۶۷ھ] کے عہد خلافت میں ۴۳۲ھ میں بغداد مستقل قیام کی غرض سے آیا۔اس کے ساتھ علماء اور طلبہ کا ایک جم غفیر تھا۔جب قاضی القضات ابن ماکولا شافعی کا ۴۴۷ھ میں انتقال ہوا تو خلیفہ نے قاضی ابویعلیٰ کو دارالخلافت کا قاضی بنانا چاہا۔اس نے ابتداء میں مصنف قضاء قبول کرنے سے انکار کیا مگر بعد میں خلیفہ کے پیہم اصرار سے اسے منظور کیا تو یہ شرط لگائی کہ وہ شاہی سواری کے جلوس میں شریک نہ ہوگا۔استقبال کے لیے نہ جائے گا اور دربار سلطانی میں حاضری نہ دے گا''طبقات حنابلہ'' کے مصنف نے فقہائے حنابلہ کے پانچویں طبقے میں اسے شمار کیا ہے۔اس کی جلالت شان کا یہ عالم تھا کہ جب اس نے جامع منصور میں امام احمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ بن احمد کی مسند درس پر فائز ہو کر درس حدیث دیا تو لوگ نہایت کثرت سے اس میں شریک ہوئے۔لوگوں کا مجمع اتنا زیادہ تھا کہ درس کے بعد جمعہ کی نماز میں نمازیوں نے جگہ کی تنگی کی وجہ سے فرش مسجد کے بجائے ایک دوسرے کی پیٹھوں پر سجدے کیے۔صاحب ''طبقات الحنابلہ'' کا بیان ہے کہ اس زمانہ میں حدیث کی سماع کے لیے اتنا بڑا مجمع دیکھنے میں نہیں آیا۔

قاضی ابو یعلیٰ کی تصانیف کی تعداد اکیس سے زیادہ ہے۔

ابو یعلیٰ کی ''الاحکام السلطانیہ'' مندرجہ ذیل پندرہ فصلوں پر مشتمل ہے:

[۱] امامت کے مسائل، [۲] تقرر حکام، وزارت، امارتِ اقلیم، امارتِ جہاد، ولایتِ قضاء، ولایت مظالم کے مباحث، [۳] نقیب الاشراف کا تقرر، [۴] امامتِ صلوٰۃ [۵] امارتِ حج، [۶] امارتِ صدقات [۷] تقسیم فئی، وغنیمت [۸] جزیہ وخراج کے مسائل [۹] مختلف شہروں کے احکام، [۱۰] غیر آباد زمینوں کی آباد کاری اور آب پاشی کے لیے کنویں کھودنے کے احکام، [۱۱] چراگاہ اور عام مفاد کے مقامات کے احکام، [۱۲] جاگیر کے احکام، [۱۳] قیامِ دیوان اور اس کے حکام کا بیان، [۱۴] جرائم کے احکام، [۱۵] احتساب کے احکام۔

ابوالحسن ماوردی کی ''الاحکام السلطانیہ'' بھی انھیں مباحث پر مشتمل ہے۔اس نے اپنی پوری کتاب کو بیس ابواب پر منقسم کیا ہے۔ان میں سے چودہ ابواب تو بعینہ وہی ہیں جو ابو یعلیٰ کے یہاں ہیں۔ابو یعلیٰ کی فصل دوم ''تقرر حکام'' کو ماوردی نے پانچ مستقل ابواب میں بیان کیا ہے، اور یوں دونوں کتابوں کے تمام عنوانات ایک جیسے ہیں۔صرف ماوردی کے ہاں ایک عنوان زائد ہے جو ابو یعلیٰ کی کتاب میں نہیں ہے اور یہ اس کتاب کا پانچواں باب ہے، جس کا عنوان ''مصالح ملکی کے لیے جنگ'' ہے اور جسے اس نے جہاد سے الگ بیان کیا ہے جب کہ ابو یعلیٰ کے ہاں یہ بحث امارت جہاد کے ضمن میں آ گئی ہے۔

جب یہ امر محقق ہو گیا کہ دونوں میں سے کوئی ایک کتاب نقل ہے تو اس بات کا پتہ چلانا چنداں دشوار نہیں رہ جاتا کہ اصل کون سی کتاب ہے، اور نقل کون سی۔اگر چہ ان کتابوں کے سنین تالیف معلوم نہیں ہیں مگر قرینۂ غالب یہی ہے کہ ابوالحسن ماوردی نے اپنی کتاب پہلے لکھی اور اس کے بعد ابو یعلیٰ فراء نے۔ابو یعلیٰ کے پیش نظر یہ کوشش ہے کہ ماوردی کی کتاب میں امام احمد بن حنبلؒ کے اقوال درج نہیں جس سے یہ اشتباہ ہوتا ہے کہ ان کے اپنے افکار

سیاسیہ نہ تھے۔اس لیے انھیں اصول کو پیش نظر رکھ کران سے متعلق امام احمد کے اقوال کو بالتفصیل بیان کر دیا جائے۔چناں چہ اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ماوردی کے اصول کہیں بعینہ اور کہیں تلخیص کے ساتھ اس نے نقل کر کے ان کے ضمن میں امام احمد کے اقوال کی تفصیل دی ہے اور دوسرے ائمہ کے اقوال سے بحث نہیں کی ہے۔علمی دیانت کا یہ اقتضاء تھا کہ ابویعلی اپنی کتاب میں اس کا ذکر کر دیتا مگر اس عہد میں اس قسم کی متعدد مثالیں موجود ہیں جب کہ لوگوں نے پوری کی پوری کتاب نقل کر کے اپنے نام سے موسوم کر لی اور اصل کا کوئی ذکر نہ کیا [بلکہ آج بھی یہ روش نادر الوقوع نہیں]۔[۵۰]

علی طنطاوی نے اپنی کتاب ''مقالات طنطاوی'' میں ڈاکٹر احمد امین مصری کے سرقے کا ذکر کیا ہے۔ضحی الاسلام،فجر اسلام کے نامور مصنف ڈاکٹر احمد امین نے ابن جوزی کی کتاب ''صید الخاطر'' کا سرقہ فیض الخاطر'' کے نام سے کیا ہے۔اس کتاب کے مضامین بھی ابن جوزی سے ملتے جلتے ہیں۔مگر علامہ طنطاوی کے خیال میں سرقہ بھی نہایت کمتر درجے کا ہے۔

سیوطی کی شہرت بسیار نویس کے طور پر ہے،ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ وہ اپنی کتابوں میں اجزاء کے اجزا نقل کر لیتے ہیں۔[۵۱]

مولانا مودودیؒ کا توارُد:

توارد اور سرقے میں فرق ہے۔ سرقہ دانستہ ہوتا ہے توارد نادانستہ۔

[بحر الفصاحت،ص ۱۲۲۸]

توارد کی ایک خوبصورت مثال سورہ نور کی آیت ۳۵ کے ضمن میں مولانا مودودی کا ترجمہ ہے یہ ترجمہ ۱۹۶۰ء کے لگ بھگ شائع ہوا۔اسی آیت کا ترجمہ مولانا ابو الجلال ندوی کے قلم سے ان کی کتاب ''کتاب الہدیٰ'' میں شائع ہوا۔ یہ کتاب بمبئی سے ۱۹۲۶ء میں طبع ہوئی۔اس کتاب پر یعقوب حسن کا نام درج ہے۔سید سلیمان ندوی نے اس کا دیباچہ تحریر کیا

ہے ۔لیکن اصلاً یہ کتاب مولانا ابو الجلال ندوی کے قلم سے ہے اس کی تفصیلات جریدہ کے شمارہ ۲۳ میں ملاحظہ کی جا سکتی ہیں ۔[۵۲]

ترجمہ ابو الجلال ندویؒ

اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق کہ اس میں ایک چراغ ہے، چراغ ایک شیشہ میں ہے، وہ شیشہ گویا چمکتا ہوا تارہ ہے، وہ چراغ زیتوں کے ایسے مبارک کے ایسے مبارک درخت کے تیل سے روش کیا گیا ہے جو نہ شرقی ہے اور نہ غربی اس کا تیل روشن ہونے کو ہے گو اسے آگ نہ بھی چھوئے، نور پر نور ہے، اللہ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے اور اللہ لوگوں کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے ۔[۵۳]

ترجمہ ابو الاعلیٰؒ مودودی

اللہ آسمانوں اور زمینوں کا نور ہے [کائنات میں] اس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق میں چراغ رکھا ہوا ہے چراغ ایک فانوس میں ہو، فانوس کا حال یہ ہو کہ جیسے موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا اور وہ چراغ زیتون کے ایک ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی جس کا تیل آپ سے آپ ہی بھڑک پڑتا ہو چاہے آگ اس کو نہ لگے اس طرح روشنی پر روشنی [بڑھنے کے تمام اسباب جمع ہو گئے ہوں] اللہ اپنے نور کی طرف جس کو چاہتا ہے رہنمائی فرماتا ہے وہ لوگوں کو مثالوں سے سمجھاتا ہے وہ ہر چیز سے خوب واقف ہے۔

مولانا مودودی کے سورہ النحل کے ترجمے میں بھی ایسے توارد ملتے ہیں ۔اس سلسلے میں تفصیلی تقابلی مطالعے کی ضرورت ہے۔

اردو نثر میں سرقہ بازی کی تاریخ:

اس موضوع پر آج تک کسی نے توجہ نہیں کی لہذا اردو ادب کا دامن اس حوالے سے ابھی تک خالی ہے۔ہم نے کوشش کی ہے کہ سرقہ سے متعلق جو معلومات مل سکتی انھیں جمع کر دیا جائے تا کہ مستقبل میں کوئی محقق اس موضوع پر تحقیق کا حق ادا کر سکے۔

محمد حسین آزاد کے سرقے:

''محمد حسین وہ ساحر ہے جس کی ''گپ'' بھی بقول شبلی وحی معلوم ہوتی تھی۔مہدی الافادی نے آزاد کو''اردو کے عناصر خمسہ میں شامل کیا ہے۔ڈاکٹر عبدالودود کا دعوی تھا کہ آزاد انگریزی نہیں جانتے تھے۔ڈاکٹر کشفی کی تحقیق ہے کہ آزاد انگریزی جانتے تھے۔اس بات پر اتفاق ہے کہ آزاد کے بہت سے مضامین اور کتابیں انگریزی ادبیات کا سرقہ، چربہ، استفادہ اور استفاضہ ہیں۔کشفی صاحب کی تحقیق کے مطابق ''شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار''، ''علمیت اور ذکارت کے مقابلے'' جانسن اور ایڈیسن کے مضامین کا اعلیٰ ترین ترجمہ ہیں۔

ڈاکٹر صادق نے نیرنگ خیال کے مضامین کے انگریزی ماخذات اور توبۃالنصوح کے ماخذ کا بھی سراغ لگایا اور تحقیقات پیش کیں۔

''سخن دانِ فارس کے ان ابواب کا [پہلا، چھٹا اور ساتواں، حصہ دوم] دوسرا اہم ماخذ مالکم صاحب کی تاریخِ ایران ہے۔ان اطلاعات کے علاوہ، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے، تقریباً تمام اطلاعات جو سخن دانِ فارس کے ان ابواب میں درج ہیں، اس تصنیف سے [اصولاً تالیف ہونا چاہیے] ماخوذ ہیں،لیکن تین اقتباسات کے سوا، جہاں آزاد نے اس تصنیف[تالیف] کی طرف اشارہ کیا ہے،انھوں نے کہیں بھی اس سے استفادے کا ذکر نہیں کیا''۔[۵۴]

مجھے اس سے اتفاق نہیں کہ آزاد انگریزی جانتے تھے، کچھ الفاظ معلوم ہوں تو اور

بات ہے۔ میں اسے بھی تسلیم نہیں کرتا کہ انھوں نے آبِ حیات اور سخندانِ فارس کی تصنیف میں ''مستشرقین یورپ کی علمی کاوشوں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ہے''۔ میں اس وقت صرف اظہارِ رائے پر اکتفا کرتا ہوں دلائل پیش کرنے کو تیار نہیں ۔[۵۵]

''جو شخص ایک پرانی رباعی کو سودا سے منسوب کر کے فاخر مکین کی ہجو بنا دیتا ہے، جو بیدل اور جعفر زٹلی کے بیچ کے معاملے کو جعفر اور سودا کا معاملہ بنا دیتا ہے، جو قاسم کے منشاء کے برعکس مرزا مظہر جان جاناں کے قاتل کو سنی قرار دیتا ہے، جو جھوٹ موٹ معرکے تصنیف کرتا ہے یا تذکروں سے بے ضرر مسابقتوں کو اٹھا کر معرکوں میں تبدیل کر دیتا ہے، جو یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ بیس سال تک دن رات ذوق کی حضوری میں رہا، حالاں کہ ذوق کے انتقال کے وقت اس کی عمر تقریباً ساڑھے چوبیس سال تھی، جو خود غزلیں کہہ کر ذوق کے نام سے ان کے کلام میں شامل کر دیتا ہے، وہ دور دور تک محقق نہیں، ادبی جعل ساز ہے ۔ بحیثیت راوی اس کی حیثیت صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، نصیر حسین خیال اور مفتی انتظام اللہ شہابی سے بہتر نہیں''۔[اردو کی ادبی تاریخیں، ڈاکٹر گیان چند انجمن ترقی اردو، کراچی ۲۰۰۰،ص ۱۰۰]

''مجھے ان مضامین کے انگریزی سے ماخوذ ہونے کا شبہ اس بدیہی مشابہت سے پیدا ہوا جو جانسن کے "Voyage of Life" اور آزاد کے مضمون ''سیرِ زندگی'' میں نظر آئی ۔موازنہ کرنے پر یہ انگریزی مضمون کا لفظ بلفظ ترجمہ ثابت ہوا''۔[۵۶]

آزاد کا دفاع:

نیرنگ خیال کی بحث میں ڈاکٹر اسلم فرخی نے آزاد کا دفاع کیا ہے ۔اور لکھا ہے کہ

''ڈاکٹر محمد صادق کی تحقیق نے کہ'' آزاد نے ان تراجم کو اپنا مال ظاہر کیا اور دوسروں کے خیالات کو اردو کا جامہ پہنا کر شہرت حاصل کی''۔اس حوالے کے بعد بعض شوخ چشم لکھنے والوں نے آزاد پر سرقے کا الزام بھی عائد کیا، تاہم نیرنگِ خیال کے پہلے ایڈیشن میں ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار کی تحقیق کے مطابق انگریزی سرورق پر یہ عبارت بھی ملتی ہے:

LXXXVII ستاسی

"Gems from west and east

or

The land of fact and fancy

being

a series of allegorical and other eassy based on the rambler and spectator and on oriental lore"

ڈاکٹر ذوالفقار اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں کہ اس اعتراف کے بعد ڈاکٹر محمد صادق کا یہ انکشاف کچھ بے ضرورت سا ہو جاتا ہے [۵۷]

علامہ نیاز فتح پوری کے سرقے:

سرقہ نگاری میں جناب علامہ نیاز فتح پوریؒ نے عالم گیر شہرت حاصل کی، ان کی سرقہ نویسی کے چرچے ان کے دور عروج میں عام ہو گئے تھے۔ اس باب میں کوئی ان کا حریف نہیں۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ نے انھیں سلسلہ وار مضامین کا مسودہ اشاعت کے لیے دیا تو شروع کے مضامین انھوں نے اپنے نام سے شائع کر لیے۔ مولانا مودودیؒ نے احتجاج کیا لہٰذا بقیہ مضامین ان کے نام سے شائع کر دیے گئے۔ [۵۸]

''فراست الید'' کیرو کی کتابوں کا چربہ ہے ہاتھوں کے عکس اور متن کیرو سے لیے گئے ہیں، مختلف دائرہ ہائے المعارف [انسائیکلوپیڈیا] سے تراجم کر کے باب ''استفسارات'' میں وہ علم کے موتی بکھیرتے تھے۔ یوسف بخاریؒ صاحب کی روایت ہے کہ کئی بار علامہ کی خواہش پر انھوں نے ان کا گھڑا ہوا سوال باب استفسارات کے لیے بھیجا اور اس کا تفصیلی جواب جو پہلے سے سرقہ یا ترجمہ شدہ تھا شائع ہو گیا۔

''ترغیبات جنسی'' ہیولاک ایلیس کی شہرہ آفاق کتاب Studies in the Pcychology of Sex کا چربہ ہے۔ نیازؒ کی کتاب ''انتقادیات'' کا مضمون ادبیات اور

اصول نقد ولیم ہنری ہڈسن کی کتاب An introduction to the Study of Litrature کا سرقہ ہے۔انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد سے ملحق دعوہ اکیڈیمی کے رسالے ''دعوہ'' میں نیاز فتح پوری کے خدا نمبر کو بھی سرقہ قرار دیا گیا ہے اور اس کے ثبوت و شواہد پیش کیے گئے ہیں۔نیاز صاحب نے مولانا مودودیؒ کے کن مضامین کا سرقہ کیا اس کی تفصیلات بھی درج ہیں۔یہ مضمون پروفیسر اختر راہی نے تحریر کیا ہے۔یہ مضمون کتابت کے وقت گم ہوگیا ہے لہٰذا اس کا مکمل حوالہ فی الحال پیش نہیں کیا جا سکتا۔مجنوں گورکھپوری کے ''جن'' اور غیر محسوس دنیا سے متعلق اہم مضامین نیاز صاحب نے اپنے نام سے شائع کر لیے تھے۔دارالمصنفین اعظم گڑھ کی کتاب سیر الصحابیات کا سرقہ بھی نیاز صاحب نے کیا حسن مثنیٰ ندوی کی روایت کے مطابق نیاز صاحب نے اپنے داماد کی کتاب بھی سرقہ کی تھی جو خود کسی کتاب کا سرقہ تھی۔اردو میں سرقہ بازی کی تاریخ میں نیاز صاحب کو خاص مقام حاصل ہے اور ان کے سرقوں کی تعداد ان گنت ہے۔انگریزی زبان سے ان کے بیشتر سرقہ شدہ مضامین کا ماخذ بیرسٹر حسن امام کا کتب خانہ تھا جہاں وہ اکثر تشریف لے جاتے اور انگریزی کتابیں پڑھتے ہوئے متعلقہ حصوں کو قلم زد کرتے اور ان کا جیسا تیسا ترجمہ کر کے مضامین شائع کر لیتے۔عموماً یہ ترجمہ بھی ناقص اور نامکمل ہوتا۔انگریزی متن کے جو حصے مشکل ہوتے یا جن کی تفہیم نیاز صاحب کے لیے مشکل ہوتی انھیں چھوڑ کر خالی جگہ اپنی بلند خیالی اور رالعیلی انشاء پردازی سے اس طرح پُر کر لیتے تھے کہ سرقے پر اصل کا گمان ہوتا تھا۔انہی غلط سلط محرف سرقوں سے وہ کتابیں مرتب کر ڈالتے۔حسن مثنیٰ ندوی صاحب کے پاس ذخیرہ حسن امام کی وہ تمام کتابیں موجود تھیں جن سے نیاز صاحب نے سرقہ کیا تھا اور ان کتابوں پر نیاز صاحب کے اشارات اور نشانات بھی محفوظ تھے۔اب یہ کتب بیدل لائبریری شرف آباد میں محفوظ ہیں۔حسن مثنیٰ ندوی صاحب کی تحقیق تھی کہ عربی، اردو، فارسی، ترکی اور انگریزی میں نیاز فتح پوری سے بڑا سارق پیدا نہیں ہوا۔ندوی صاحب یہ بھی بتاتے تھے کہ قاضی غفار نے جب

جبران کی عربی کتاب سے ترجمہ کرتے ہوئے ''اس نے کہا'' کے اوراق کا سرقہ کیا تو اس کا ایک صفحہ یا تو چائے پیتے ہوئے الٹ گیا تھا یا اس کتاب میں موجود نہ تھا لہٰذا اس سرقہ شدہ ترجمہ سے وہ پورا صفحہ غائب ہے۔

کرشن چندر کا سرقہ:

دیگر سرقوں کے ضمن میں جناب حسن مثنیٰ ندوی صاحب کے رسالے مہر نیم روز میں شائع ہونے والے خطوط اور ان کے بعض نوٹس سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ ذیل میں درج ہیں:

دلی سے جو چمنستان نکلتا تھا اس میں ایک صاحب نے کرشن چندر کے ناول ''شکست'' کے بارے میں ایک عجیب وغریب مضمون لکھا تھا۔ انھوں نے بھی دلائل وشواہد دے کر ثابت کیا تھا کہ کرشن چندر نے خیالات اور الفاظ کہاں کہاں سے لیے ہیں۔ مجھے اس کی تفصیل یاد نہیں لیکن اتنا ضرور یاد ہے کہ اس نے دل پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں چھوڑا تھا۔[۵۹]

مراۃ الشعراء سرقے کا شاہکار:

حال ہی میں تنہا صاحب نے جو تذکرۂ شعراء بنام مراۃ الشعراء دو جلدوں میں چھپوایا ہے اور جس میں ''ولی دکنی سے لے کر محمد یحییٰ تنہا'' تک جملہ شعرائے اردو کے حالات ہیں۔ ہر شاعر کے ۷۲ نشتر جمع کیے گیے ہیں اور لطیفہ در لطیفہ یہ ہے کہ وہ ۷۲ نشتر میر کے بھی جمع نہ ہو پائے نہایت پھسپھسا انتخاب ہے۔ اگر انھیں ۷۲ نشتر کے بجائے ۷۲ لٹھ کہا جائے تو بے جا نہیں!

حالات میں تحقیق کا یہ عالم ہے کہ شروع میں تو میں نے کتاب کے حاشیوں پر نوٹ لکھنے کی ابتدا کی اور یہ سوچا کہ انھیں مرتب کر کے ایک مضمون کی شکل دے دوں گا لیکن جب وہ غلطیاں بجائے خود ایک تصنیف بننے کی منزل میں آنے لگیں تو گھبرا کر پنسل رکھ دی۔

''مراۃ الشعراء'' پڑھنے کے بعد یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ آخر اس تذکرے کے نہ ہونے سے ہمارے ادب میں کون سی کمی تھی؟ اور کس معیار و اعتبار سے فاضل مصنف نے اسے لکھ کر [اپنا وقت تو خیر ٹھیک ہی صرف کیا!] ہمارا وقت کھویا!

مراۃ الشعراء بھی ملاحظہ فرمایئے اور اس میں جو ''آبیاریاں'' کی گئی ہیں ان کی قلعی کھولیے۔[۶۰]

پروفیسر عقیل کا سرقہ:

پروفیسر سید محمد عقیل نے اقبال کے ایک ''غیر مطبوعہ'' خط کو ایک ''نئی دریافت'' کے طور پر ''ہماری زبان'' ۲۲/مارچ ۱۹۹۷ء میں پیش کیا تھا اس مضمون پر نقد کرتے ہوئے ڈاکٹر مختار الدین آرزو نے اپنے مضمون ''علامہ اقبال کے ایک نو دریافت خط کے بارے میں'' میں بتایا کہ جس خط کو غیر مطبوعہ کہا گیا ہے وہ اقبال نامہ مرتبہ شیخ عطاء اللہ میں موجود ہے۔[۶۱]

حکیم الامت کا سرقہ: الزام یا حقیقت

''مولانا تھانوی نے مرزا قادیانی کی مختلف کتابوں کی بعض عبارات اپنی کتابوں میں من وعن نقل کی ہیں۔ہم مزید تحقیق تو اہل تحقیق کے سپرد کرتے ہیں۔اس وقت مولانا تھانوی کی ایک کتاب ''المصالح العقلیہ'' زیر نظر ہے۔

مرزا قادیانی نے اپنی کتاب کشتی نوح میں پنج وقتہ نمازوں فجر،ظہر،عصر،مغرب، عشاء کے اوقات کے تعین کی وجہ بیان کرتے ہوئے جو کچھ لکھا مولانا تھانوی نے اس کی من و عن نقل اپنی مذکورہ بالا کتاب میں کی''۔اس دعویٰ کے بعد مولف کتاب ''شاہ حسن گردیزی'' میں ص ۵۵۴ سے لے کر ۵۶۶ تک دونوں کتابوں کے حوالے آمنے سامنے نقل کیے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے مرزا غلام احمد کی کتاب ''اسلامی اصول کی فلاسفی'' کے کچھ اقتباسات کا بھی موازانہ پیش کیا ہے۔ان طویل اقتباسات کے بعد ان کا تبصرہ درج ذیل ہے:

اسلامی اصول کی فلاسفی ۱۸۹۶ء اور کشتی نوح ۱۹۰۲ء میں طبع ہوئی جبکہ ''المصالح العقلیہ'' یکم رجب بروز جمعرات ۱۳۳۴ھ کو ختم ہوئی اس لحاظ سے عیسوی سن ۱۹۱۶ء قرار پاتا ہے۔اس سرقے کے ضمن میں علامہ ڈاکٹر خالد محمود نے جامعہ اشرفیہ کے رسالے ''الحسن'' میں سرقے کے الزام کو رد کرنے کے لیے ایک سیر حاصل مضمون لکھا ہے جس میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا غلام احمد نے ایک اور اہل حدیث مصنف کی تحریروں سے یہ سرقہ کیا تھا اور مولانا تھانوی کے پیش نظر اس مصنف کی اصل تحریریں تھیں جب کہ مرزا صاحب نے سرقہ کیا ہے۔ یہ موقف بہ ظاہر وزنی ہے لیکن مزید تحقیق کا متقاضی ہے۔[۶۲]

متفرق سرقے:

مہر نیم روز میں شائع ہونے والے بعض خطوط سے بھی سرقوں پر روشنی پڑتی ہے۔ چند خطوط درج ذیل ہیں۔اس وقت میرے ذہن میں کچھ عرصے پہلے کے دو واقعات ابھر رہے ہیں ایک دلی کے کسی رسالے میں چند ماہ قبل کسی ہندو دوست نے موپاساں کا کافی مشہور افسانہ "The Necklace" ''قیمتی ہار'' کا عنوان دے کر اسے اردو میں ترجمہ کر کے مقامی ناموں اور پس منظر کے ساتھ......... اپنے نام سے چھپوایا تھا۔

دوسرا کچھ عرصہ گزرا جب جناب شوکت صدیقی کراچی سے روحِ ادب کو ترتیب دیتے تھے۔ روحِ ادب کے ایک شمارہ میں ایک مشہور اردو ڈرامہ نویس کا ڈرامہ نظر سے گزرا۔آسکر وائلڈ کے ڈرامے [The Importance of Being Earnest] من وعن نقل تھی۔صرف کرداروں کے نام دیسی تھے۔

۵/ اپریل ۱۹۵۸ء بروز ہفتہ ڈھائی بجے سے سوا تین بجے دوپہر تک ریڈیو پاکستان [کراچی] سے جنوبی ایشیا میں سننے والوں کے پروگرام میں جناب پرویز رومانی کا ''افسانوں کی بستی'' نشر ہوا۔جسے شمس الدین بٹ نے پیش کیا۔

مجھے اب جناب پرویز رومانی سے پوچھنا ہے کہ ''افسانوں کی بستی'' کا امریکن

ناول [Leave her to Heaven] کے ساتھ اس حد تک توارد کا جواز آپ کیا پیش کرتے ہیں؟ کیا اسے خیالات اور پلاٹ کا توارد کہا جا سکتا ہے؟

ہیروکا ادیب ہونا، اپنے چھوٹے اور اپاہج بھائی پر جان چھڑکنا، ہیرو کی محبوبہ اور بیوی کو اس میں ڈبو دینا، پھر خود سیڑھیوں سے جان بوجھ کر پھسلن سے ہونے والے بچے کو ہلاک کرنے کی کوشش کرنا .... آخر میں خودکشی کر لینا لیکن اپنی رقیبہ کو پھنسوانے کے لیے چند بناوٹی شہادتیں چھوڑ جانا۔

عدالت کا سین ۔[۶۳]

محمد یونس بٹ کے سرقے:

''محمد یونس بٹ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر [ایم بی بی ایس] ہیں اور فن کے لحاظ سے مزاح نگار ہیں۔ اب تک ان کی بیس سے زائد شگفتہ تصانیف منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان کے ہاں پہلی سے آخری کتاب تک مشتاق احمد یوسفی کے اثرات موجود ہیں، بلکہ خود یوسفی موجود ہیں۔ ان کے ہاں اثرات نے ''سرقہ'' کا روپ دھار لیا ہے۔ یوسفی کے جملے ایسے ہیں جو یونس بٹ نے ذرا سی تبدیلی کے ساتھ اپنے نام منتقل کر لیے ہیں، بعض اوقات تو ذرا سی تبدیلی کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی''۔ خوشاب سے نکلنے والے سہ ماہی رسالے ''شیہبہ'' نے مشتاق احمد یوسفی نمبر میں ص ۲۸۸ سے ص ۳۲۰ تک سرقہ شدہ جملے نقل کیے ہیں جو سرقہ کا شاہکار ہیں۔ یونس بٹ کو سرقہ کرنے میں شاید بے حد روحانی تسکین میسر آتی ہے، اس بارے میں وہ خود اپنی معذوری بیان فرماتے ہیں:

> ''اب آپ کو کیا بتائیں، جس سیانے کی بات یاد رہتی ہے، اس کا نام یاد نہیں رہتا، جس کا نام یاد رہتا ہے اس کی بات یاد نہیں رہتی''۔

اس بحث میں مشتاق احمد یوسفی کی رائے بھی پیشِ نظر رکھی جانی چاہیے:

''نئے لکھنے والوں میں سب سے ذہین اور طباع ڈاکٹر
یونس بٹ ہیں، لیکن انھوں نے اپنے ساتھ بہت ظلم کیا، افتخار عارف
نے انہی کی تقریب میں کہا تھا کہ ڈاکٹر یونس بٹ واوین سے الرجک
ہیں، تعریف بھی کی تھی، لیکن اس خامی کی طرف بھی اشارہ کیا تھا۔ اب
چوں کہ انھیں کالم کا پیٹ بھرنا پڑتا ہے اور کچھ نہ کچھ لکھنا پڑتا ہے، تو وہ
اس Pitfall میں گر جاتے ہیں کہ مثلاً English Jokes کا ترجمہ کر
دیا، یا اپنے ہم عصروں کے جملوں کو جوں کا توں، یا تھوڑی رد و بدل
سے، یا ان کے خیالات کو مختلف انداز میں پیش کر دیا۔ عام پڑھنے والا
اخبار کا، وہ تو نہیں جانتا اس کو وہ تو داد دے گا، تو وہ بہت پاپولر بھی
ہو جائیں گے، مگر کوئی دن تو آئے گا، جب محاسبہ ہو گا اور ظاہر ہے جو
نقاد ہو گا وہ باخبر آدمی ہو گا تو اس میں پھر نقصان یہ ہو گا کہ ان کا اپنا بھی
جو Contribution ہے وہ بھی مسروقہ میں شامل ہو جائے گا، حالاں
کہ جیسا فقرہ ڈاکٹر یونس بٹ بنا سکتے ہیں ویسا فقرہ ہم نہیں لکھ سکتے،
لیکن پھر بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ اپنے سے کم تر درجے کے لکھنے
والوں سے اس طرح استفادہ کرنے کی کوشش کیوں کرتے ہیں۔''

ڈاکٹر یونس بٹ کی ایک کتاب کی تقریبِ رونمائی میں جس کی صدارت خود مشتاق احمد یوسفی کر رہے تھے اور جو لاہور کے کسی پنج ستارہ ہوٹل میں منعقد کی گئی تھی، صاحبِ صدر کو خطبۂ صدارت میں یہ تک کہتے ہوئے سنا کہ:

''میں یونس بٹ صاحب کو یہ مشورہ دینا چاہوں گا کہ وہ
مجھے کم پڑھا کریں، اگر مجھے پڑھنا ضروری ہے تو مجھے Quote نہ
کریں اور اگر مجھے Quote کرنا بھی ضروری ہے تو خدارا واوین

میں کیا کریں اور اگر میرے جملے بڑھ جائیں تو اپنے واوین میں کرلیا کریں، اس طرح کم از کم ان کے جملے، میرے کھاتے میں تو نہیں پڑیں گے۔''

طارق حسین نے ''یوسفیات'' میں کچھ ایسے جملے دیے ہیں جو یا تو مشتاق احمد یوسفی کے جملوں کا من وعن چربہ ہیں یا ان کے جملوں سے ہی تراشے گئے ہیں، سرقے کی نشان دہی کرتے ہوئے انھوں نے یونس بٹ پر بلیغ تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ انگریزی کے معروف نقاد جانسن نے کسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے جو رائے دی تھی، کہیں ایسا نہ ہو کہ ڈاکٹر یونس بٹ کی ہر تصنیف کے بارے میں کل ہر صاحب رائے کی یہی رائے ہو:

"This book is both good and orignal. But unfortunately where it is good, it is not orignaland where it is orignal, it is not good". [295] [۶۴]

مشتاق احمد یوسفی کے سرقے یا توارد یا اثر:

رشید احمد صدیقی	مشتاق یوسفی
ہر چارپائی، چارپائی نہیں ہوتی، کہنے کو تو پلنگ، پلنگڑی، چھپر کھٹ، مسہری، سب پر اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔	اردو میں چارپائی کی جتنی قسمیں ہیں، اس کی مثال اور کسی ترقی یافتہ زبان میں شاید ہی مل سکے۔ کھاٹ، کھٹا، کھٹولہ، اڑن کھٹولہ، کھٹولی، چھپر کھٹ، کھرا، کھری، جھلنگا، پلنگ، پلنگڑی، ماچ، ماچی، ماچا، چارپائی، نواری، مسہری، منجی۔
کتنی زیادہ عورتیں کتنی کم جگہ میں آجاتی ہیں، اس کا اندازہ کوئی نہیں کرسکتا، جب تک کہ چارپائی کے بعد کسی یکہ اور تانگہ پر	رہا یہ سوال کہ چارپائی پر بیک وقت کتنے آدمی بیٹھ سکتے ہیں تو گزارش ہے کہ چارپائی کی موجودگی میں ہم نے کسی کو کھڑا

ان کو سفر کرتے نہ دیکھ چکا ہو۔

نہیں دیکھا۔

جو شخص ایسی غزل لکھ سکتا ہے اس کے
سارے قصور معاف کیے جا سکتے ہیں خواہ وہ
غلط اردو ہی لکھتا کیوں نہ ہو۔

ممتاز مفتی

مرنے کے بعد لوگ بڑی سے بڑی غلطی بھی
معاف کر دیتے ہیں حتیٰ کہ زبان کی غلطیاں
بھی۔

مشتاق یوسفی

یہ بھیتر کی باتیں ہیں ......بات وہ جو بھیتر کی
ہو، گری ہو، چھلکا نہ ہو، جو مٹی ہو، جگ مٹی
نہیں ......بھیتر کے نشے سے ڈرو، بوتل کا تو
کام کاج کا نہیں چھوڑتا، بھیتر کا کسی جوگا
نہیں چھوڑتا''

دھرتی بھیتر ہی بھیتر میٹھی میٹھی آنچ میں تپتی
رہتی ہے۔

عبداللہ حسین

یہ ایسے ہی معمولی آوارہ کتے تھے جو ہر گاؤں
میں ہوتے ہیں اور گاؤں والوں کی رائے یا
خواہش کے بغیر ہی اپنے اوپر سارے گاؤں
کی حفاظت اور دیکھ بھال کا ذمہ لے لیتے
ہیں۔ یہ کتے عموماً قریب سے گزرنے والے
مسافر کو بیرونی حملہ آور اور گاؤں کی سلامتی
کے لیے سخت خطرے کا باعث سمجھتے ہیں،
اپنے خدشات کا اعلان اونچی آواز میں بھونک
بھونک کر کرتے اور اسی طرح مخالفت کا

مشتاق یوسفی

ہر موڑ پر گلی کے کتے چاروں طرف سے
انھیں اور اسے گھیر لیتے اور کھدیڑتے
ہوئے دوسری گلی تک لے جاتے، جس کی
بین الکلبی سرحد پر دوسرے تازہ دم کتے
چارج لے لیتے ......انھیں آج پہلی دفعہ
معلوم ہوا کہ گاؤں میں اجنبی کی آمد کا
اعلان کتے، مور اور بچے کرتے ہیں، اس
کے بعد وہ سارے گاؤں اور ہر گھر کا
مہمان بن جاتا ہے۔

اظہار کرتے ہوئے اگلے گاؤں تک تعاقب
جاری رکھتے، جہاں وہ آپ کو اپنے جیسے ہی
معمولی اور شکی المزاج کتوں کے حوالے کر
کے باطمینان سے واپس لوٹتے۔"

محمود نظامی

ایک مرتبہ پھر میں کھڑکی کے ٹھنڈے شیشے
کے ساتھ سر جوڑ کر باہر کی دنیا کا نظارہ
کرنے لگا۔آسمان کی گہری نیلی چادر پر
ٹکے ہوئے روپہلی اور نقرئی تارے جھلمل
جھلمل کر رہے تھے اور دور چاند کا طلائی
سفینہ دھیرے دھیرے مغرب کی سنہری
دھار کے پیچھے چھپ جانے کی کوشش میں
مصروف تھا۔

مشتاق یوسفی

اس سے پھوٹتی ہوئی سوندھی بھاپ کے
پرے ایک بھولی بسری صورت ابھرتی
ہے۔گرد آلود بادلوں کے پیچھے شرارت
سے روشن آنکھیں...... بیری سے ہولے
ہولے اپنی کینچلیاں اتارتا چلا جاتا ہے اور
ننگے پاؤں، تتلیوں کے پیچھے دوڑتا، رنگ
برنگے بادلوں میں ریزگاری کے پہاڑ،
پریوں اور آگ اگلتے اژدہوں کو بنتے بگڑتے
دیکھتا......کھڑا رہ جاتا ہوں۔[۶۵]

ڈاکٹر محمد صادق کے سرقے:

آزاد کے بارے میں بیسیوں اطلاعات فراہم کرنے کا دعویٰ بے بنیاد اور بے اصل ہے۔اس مضحکہ خیز دعوے کا پس منظر یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ایک مضمون ''آزاد معاصرین کی نظر میں'' لاہور کے رسالے سویرا میں شائع ہوا تھا۔اس مضمون میں ''نظم اردو'' کے شاعروں کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔مجھے اس مضمون کے مطالعے میں جابجا یہ احساس ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کا طرز بیان نہیں۔کوئی حوالہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ خیال ہوا کہ یہ ڈاکٹر صاحب کی ذاتی تحقیق کیسے ہو سکتی ہے۔جگہ جگہ انداز بیان مختلف تھا۔غور کرتا رہا،شہادتیں تلاش

کرتا رہا، آخرکار سراغ مل گیا، یہ ساری تفصیل ''مقالاتِ گارساں دتاسی'' سے ماخوذ تھی۔

ڈاکٹر صاحب نے سہواً یا عمداً حوالے سے گریز کیا۔ غالباً وہ ''ممنونیت کی گراں باری'' کا اظہار نہیں چاہتے تھے۔ میں نے جب نظم اردو کے شاعروں کی تفصیل قلم بند کی تو ڈاکٹر صاحب کے بیانات کے ساتھ ساتھ مقالات گارساں دتاسی سے بھی استفادہ کیا اور دونوں کا حوالہ دیا۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے اس مضمون کو اپنی کتاب آب حیات کی حمایت میں ...... شامل کیا۔ مضمون کو کتاب میں شامل کرنے کے لیے انھیں دتاسی کے تمام حوالے قلم بند کرنا پڑے، کیوں کہ میں انھیں اپنی کتاب میں واضح کر چکا تھا۔[۶۶]

سرقے یا تسامحات:

ڈاکٹر صادق کے سرقے کو سرقہ کہنے کے بجائے ڈاکٹر اسلم فرخی صوفیانہ لہجے میں اسے تسامحات کہتے ہیں اور دوسرے سرقے کی نشاندہی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تسامحات کی یہ روداد اتنی طویل ہے کہ ان کو ترتیب دے کر ایک پوری کتاب مرتب کی جا سکتی ہے۔ میں نے صرف چند ہی پر اکتفا کیا ہے۔ برسبیلِ تذکرہ ایک لطیفہ بیان کرنا بھی ضروری ہے:

ڈاکٹر محمد صادق کے انگریزی مقالے کا ایک ٹائپ شدہ نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں موجود تھا۔ اس مقالے میں ڈاکٹر صاحب نے آزاد کی تاریخ پیدائش ۱۵/ذی الحجہ مطابق ۱۲/جون ۱۸۳۰ء لکھی ہے۔ میں نے اپنی کتاب میں اس کی تردید کی اور تحقیق کے بعد ۱۸/ذی الحجہ ۱۲۴۰ھ مطابق دس جون ۱۸۳۰ء کو صحیح تاریخِ ولادت قرار دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا یہ انگریزی مقالہ کتابی صورت میں شائع کیا تو میری پیروی میں آزاد کی تاریخِ ولادت ۱۰/جون ۱۸۳۰ء قرار دی، لیکن اس تصحیح میں میرا کوئی حوالہ نہیں دیا، تاکہ وہ ''ممنونیت کی گراں باری سے محفوظ رہیں''۔[۶۷]

ڈاکٹر اسلم فرخی پر سرقے کا بہتان:

ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی دو کتابوں ''آبِ حیات کی حمایت میں'' اور ''محمد حسین آزاد احوال و آثار میں'' ڈاکٹر اسلم فرخی پر سرقے کے بہتان باندھے ہیں۔

۱۔ ''تدوینِ دیوانِ ذوق'' اور ''سخن دانِ فارس پر مزید روشنی'' کو مستثنیٰ کر دیا جائے تو باقی مضامین کا معتد بہ حصہ آپ کو محمد حسین آزاد مصنفہ ڈاکٹر اسلم فرخی میں مل جائے گا۔ اگر چہ انھوں نے اپنی تالیف نیرنگِ خیال میں اپنی انتخاب کردہ مثالیں دے کر اس کے ماخذ کا ذکر کیا ہے، لیکن یہ کہیں بھی نہیں لکھا کہ یہ معلومات انھیں کہاں سے دستیاب ہوئیں۔[۶۸]

۲۔ ''علم اور معلومات کی اشاعت ایک قابلِ تعریف کام ہے اور اس میں بخل سے کام لینا تنگ نظری کے مترادف، لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ رسمی آداب سے کام لیا جائے اور مستعار معلومات کا اعتراف کیا جائے۔ [ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب نے] اس بات پر پوری طرح عمل نہیں کیا۔ انھوں نے ایسی اطلاعات کا، جن کا علم یا مواد ہمارے سوا اور کسی کو نہیں، استفادے کا اعتراف کیا ہے، لیکن بیسیوں ایسی اطلاعات کا، جو ہم نے ایسی تصانیف سے انتخاب کی ہیں، جو دستیاب ہیں ہمارا حوالہ دیے بغیر اصل تصنیف کا حوالہ دے دیا ہے۔ غالباً اس سے وہ ممنونیت کی اس گراں باری سے، جو ان پر عائد ہوتی ہے، کسی حد تک سبک دوش ہونا چاہتے ہیں''۔[۶۹]

ڈاکٹر اسلم فرخی پر سرقے کے الزام کی حقیقت:

ڈاکٹر محمد صادق نے اپنی پہلی کتاب ۱۹۷۳ءاور دوسری کتاب ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر اسلم فرخی پر سرقے کے بے بنیاد الزامات عائد کیے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس وقت خاموشی اختیار کی مگر اب اٹھائیس سال کے بعد اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے تو شرافت اور روحانیت کے پھول بکھیر دیئے ہیں، ۱۹۷۳ء اور ۱۹۷۶ء میں ڈاکٹر صادق کے بہتان پر فرخی صاحب نے شریفانہ سکوت اختیار کیا۔ ۲۸ برس بعد اکرام چغتائی کے جواب میں وہ اس طویل خاموشی سے

پردہ اٹھاتے ہیں اور ہمیں تہذیب شائستگی اور سلیقے کی رسم قدیم سے آگاہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں۔

"میرے قارئین مجھ سے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کی زندگی میں ان کی تنقید کا جواب کیوں نہیں لکھا؟ ان کی پہلی کتاب ۱۹۷۳ء اور دوسری ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ ستائیں برس کے بعد جواب اور اس رد کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ اس زمانے میں بزرگوں اور احباب نے مجھے جواب اور رد لکھنے کی بڑی تاکید کی۔ بعض بزرگ جواب نہ لکھنے پر مجھ سے سرگراں بھی رہے، لیکن میں نے کوئی جواب نہیں لکھا، کیوں کہ ۱۹۷۳ء سے پہلے ہی میں ایک ایسے روحانی سفر کا آغاز کر چکا تھا، جس میں جواب اور رد اور شخم بحثی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ پیرو مرشد حضرات استاذی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب قبلہ نے بھی منع فرمایا کہ جواب لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ دیدۂ بینا کے حامل افراد اور صاحبانِ بصیرت خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ تمہارا کام کس نوعیت اور قدر و قیمت کا ہے۔

اکرام چغتائی صاحب کا مضمون پڑھ کر بھی میں نے یہی فیصلہ کیا تھا کہ میں حسب سابق اس کا کوئی جواب نہیں لکھوں گا، لیکن اس دفعہ میرے بعض تلامذہ نے یہ دھمکی دی کہ اگر آپ جواب نہیں لکھیں گے تو ہم خود جواب لکھ دیں گے۔ میرا تعلق باب نبرد سے نہیں ہے، لہٰذا میں دھمکی میں آ گیا اور پیرو مرشد حضرت استاذی کی اجازت سے، مجبوراً یہ جواب قلم بند کیا۔ مجھے اندیشہ تھا کہ اگر میں نے جواب نہیں لکھا تو میرے تلامذہ جذبات کی رو میں بہ کر نجانے کیا لکھ دیں۔ کہیں کہیں میرا لہجہ تیز بھی ہو گیا، کیوں کہ "قلندر ہر چہ گوید فاش گوید"۔ تاہم میں ڈاکٹر محمد صاق صاحب کی روح سے شرمندہ ہوں، معذرت خواہ ہوں۔ اکرام چغتائی صاحب ملک کے نامور کتابیات ساز اور محقق ہیں۔ میرے اس جواب سے وہ ضرور آزردہ ہوں گے میں ان سے بھی معذرت خواہ ہوں۔[۷۰]

ناموں کا سرقہ:

کتابوں کے ناموں کے سرقے کی روایت بھی اردو میں بہت مستحکم ہے۔آج کل عموماً مولفین وسیع المطالعہ نہیں ہوتے لہٰذا انھیں معلوم نہیں ہوتا کہ اس نام کی کتاب پہلے شائع ہو چکی ہے۔بعض مصنفین دانستہ پرانے نام رکھ لیتے ہیں، انگریزی خواں مصنفین ناموں کا ترجمہ کر لیتے ہیں یہ بھی سرقے کی ایک شکل ہے مثلاً ''سرگزشت الفاظ' احمد دین صاحب کی کتاب پادری ٹرینچ کی انگریزی کتاب Study of Words سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اس کتاب کے انگریزی نام کا خوبصورت ترجمہ ''سرگزشت الفاظ'' کیا گیا ہے۔مصنف نے اس امر کی وضاحت ابتدا ہی میں کر دی ہے کہ یہ کتاب دراصل انگریزی کی ایک کتاب کی بنیادوں پر کھڑی ہے۔لیکن انگریزی کتاب کا نام نہیں بتایا گیا۔اصل کتاب میں انگریزی، فرانسیسی اور لاطینی الفاظ کی مثالیں دی گئی ہیں اور احمد دین صاحب نے ان کی جگہ اردو، فارسی، عربی اور ہندی الفاظ کو لے لیا ہے۔[۱۷]

روزنامہ جسارت کے ادبی صفحات پر ۱۹۸۸ء میں ایک مضمون ''کتابوں کے ناموں میں سرقہ'' کے عنوان سے شائع ہوا تھا جس میں کتابوں کی فہرست بھی شائع ہوئی تھی لیکن اس کا تراشہ ہمیں کوشش کے باوجود نہیں مل سکا۔

سرقوں کے خلاف مہرِ نیم روز کا جہادِ اکبر:

۱۹۵۶ء میں خانوادہ شاہ سلیمان پھلواری کے فرزندوں حسن مثنّیٰ ندوی اور علی اکبر قاصد نے کراچی سے مہرِ نیم روز نکالنے کا فیصلہ کیا۔مجلسِ ادارت میں تین سید حسن مثنّیٰ ندوی، علی اکبر قاصد اور سید ابوالخیر کشفی شامل تھے۔اس رسالے کی اشاعت کا پس منظر حسن مثنّیٰ ندوی کے الفاظ میں یہ تھا:

علی اکبر قاصد انگریزی کے بہت اچھے ادیب اور نقاد تھے۔غالب کی آواز ان کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی:

"بی خبران" را خبری بازده
زان می دیرینہ قدری بازدہ

ترجمہ: بے خبروں کو ایک "خبر" پھر پہنچاؤ تاکہ اپنی مئے دیرینہ کی قدر و منزلت ان کے دلوں میں پھر تازہ ہو۔

اثر پردۂ سازت چہ شد
زمزمہ خارا گدازت چہ شد

ترجمہ: ان سے پوچھو کہ تمہارے ساز کے پردوں سے جو نغمہ ابھرتا تھا اس کا اثر آج کہاں ہے وہ زمزمہ جو پتھر کو بھی گلا دیتا تھا آخر کیا ہوا۔

در ہوس جاہ فرو رفتہ
حیف کہ در چاہ فرو رفتہ

ترجمہ: تم ہوس جاہ میں ڈوب گئے افسوس تم کنویں کے اندر جا پڑے؟

بندۂ زر بودن از اہریمنی است
مرد خدا این چہ خدا دشمنی است

ترجمہ: بندۂ زر ہو جانا اہرمن پرستی کی دلیل ہے" "مرد خدا" یہ تو یزداں پرستی نہیں ،سراسر خدا دشمنی ہے۔

یہ آواز مسلسل ہمارے نہاں خانے میں گونج رہی تھی۔ ہم لوگ بالعموم فکر و نظر کو قتل ہوتے دیکھ کر شدید اذیت میں مبتلا تھے۔ قاصد نے کہا آیئے ایک رسالہ نکالیں "مہر نیم روز"۔ میں نے کہا کہ مشکل نام ہے، انھوں نے کہا "دنیا میں کوئی چیز مشکل نہیں ہے" ہم دونوں نے سید ابوالخیر کشفی کو ساتھ لیا، ادارت میں ہم تینوں کے نام داخل ہوئے۔ ۱۹۵۶ء کی فروری سے اس رسالے کی اشاعت شروع ہوئی۔ یہ غالب کی وفات کا مہینہ تھا اور رسالے کا نام بھی غالب ہی سے مستعار لیا گیا تھا۔ یہ علمی و ادبی رسالہ تھا۔ علم اور ادب ہی بنیادی چیز ہے جو

آدمی کو آدمی بناتی ہے۔ غالب کی آواز طرح طرح سے گونج رہی تھی:

ترا ای بی خبر کار یست درپیش

بیابانی و کہسار یست درپیش

تن آسانی بہ تاراج بلادہ

چو بینی رنج خود را رونما دہ

ھوس راسر بہ بالین فنانہ

نفس را ازدل آتش زیرپا نہ

دل ازتاب بلا بگداز و خون کن

زدانش کارنکشاید جنون کن

شرر آسا، فنا آمادہ، برخیز

بیفشان دامن و آزادہ برخیز

زالآ دم زن و تسلیم لا شو

بگو اللہ و برق ما سوا شو

ترجمہ: اے بے خبر! تمہارے سامنے ایک [بڑا] کام پڑا ہے، ایک بیاباں ہے اور ایک کہسار ہے جس کو طے کرنا ہے۔

تن آسانی کو آزمائش وابتلا کے ہاتھوں برباد ہونے کے لیے چھوڑ دو اور اگر تکلیف محسوس ہو تو خود آگے بڑھ جا۔

ہوس کے لیے ایسا کچھ کرو کہ کسی کا سر فنا کے بالین پر دھرا ہوا ہو اور تمہاری ہر سانس کے قدموں کے نیچے ایک آگ دہک رہی ہو۔

اپنے دل کو آمائش وابتلا کی آنچ پر خوب گھلاؤ اور پگھلاؤ اور خون گرم میں تحلیل کرو کہ اب دانش مندی کے ہاتھوں کسی کام واقدام کی راہ کھلنے کی نہیں، جنون اختیار کرنا ہے،

وہی راستہ کھولے گا۔

چنگاری کی طرح، فنا ہو جانے کا عزم لے کر اٹھو، اپنے دامن کو جھاڑو اور آزادی
کے ساتھ اٹھ کر کھڑے ہو جاؤ۔

نعرہ مارو الا کا اور اپنے آپ کو لا کے سپرد کر دو، نام لو اللہ کا اور ماسوا کے حق میں
برق ہو جاؤ اور اس پر بجلی بن کے ٹوٹ پڑو۔

کیا گونج تھی، اس کو تو سننے والوں اور محسوس کرنے والوں کے دل سے پوچھیے۔
رسالہ نکلا اور بڑی شان سے نکلا۔ ادارے نے اس رسالے کو عام کرنے کے لیے اپنی جانب
سے سخاوت تک کے اقدامات کیے، پورے برعظیم میں اس کو پہنچایا۔ بھارت میں اور اپنے
پاکستان کے دونوں حصوں میں۔ اعزازی کاپیاں بھی بہت سے ادیبوں کی خدمت میں
ارسال کیں، لیکن کم ہی لوگ تھے جن کو قلمی امداد کا خیال آیا اور جن کو آیا ان میں سے بعض ممتاز
صاحبان اخلاص کی خدمت میں ''نجی طور پر'' بغیر کسی اعلان کے ادارے نے کچھ پیش بھی کیا۔
ان میں سے مرحوم ممتاز مفتی اور مرحوم ڈاکٹر ابواللیث کو میں کبھی بھول نہیں سکتا۔ اللہ ان کی
مغفرت فرمائے۔ اس رسالے کی طرف لپکتے سب تھے، اس میں مضامین ایسے شائع ہوتے
تھے۔ علمی وادبی اور فکری راستہ دکھانے والے اور زندگی کے نکتے یاد دلانے والے۔ یہ رسالہ
بھی شیخ عبدالقادر کے مخزن لاہور اور علامہ سید سلیمان ندوی کے معارف اعظم گڑھ کی طرح
دور جدید میں ایک ''مشن'' کا حامل تھا۔ لیکن مشن کے حامل رسالے اور اخبارات کی راہ میں
بھی دشواریاں بہت حائل ہو جاتی ہیں، دوسرے ہی سال سے ''مہر نیم روز'' کی راہ میں
رکاوٹیں مختلف اندازکی پیدا ہونے لگیں، تاہم یہ رسالہ کبھی رکتا اور کبھی جاری ہوتا رہا، مہر نیم
روز اس کا نام تھا اس لیے یوں کہیے کہ ڈوبتا بھی رہا اور ابھرتا بھی رہا۔ سید علی اکبر قاصد کو امداد
باہمی کے طوفانی کاموں نے دل کی بیماری میں مبتلا کر دیا تھا اس کی خبر کسی کو نہ تھی۔ میں اسکندر
مرزا کے قائم کیے ہوئے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں یہ جاننے کے لیے داخل ہو گیا کہ یہ

کیا ہے؟ اور کیوں ہے؟ ورنہ میں تو نیشنل کالج میں پڑھاتا تھا اور کبھی ریڈیو پر چہکتا تھا، سید ابو الخیر کشفی کراچی یونیورسٹی میں داخل ہو گئے، ۱۹۶۲ء کا چوتھا مہینہ تھا سید علی اکبر قاصد کے دل نے خاموش ہو جانے کی ٹھانی، آخر ڈوب گیا:

دل اپنی طلب میں صادق تھا گھبرا کے سوئے محبوب گیا

دریا سے یہ موتی نکلا تھا دریا ہی میں جا کر ڈوب گیا

تو میں سب کچھ بھول گیا اور انسٹی ٹیوٹ سے نکل کے گھر کی جانب متوجہ ہو گیا لیکن کسی کام میں جی لگتا نہ تھا۔[۷۲]

مہر نیم روز کا پہلا شمارہ فروری ۱۹۵۶ء کو منظر عام پر آیا اور ادبی سراغ رساں کے نام سے چہ دلاوراست'' کے عنوان سے علمی، ادبی و تحقیقی سرقوں کا مستقل سلسلہ شروع ہوا۔

مہر نیم روز کے ادبی سراغ رساں:

یہ ادبی سلسلہ ادبی سراغ رساں کے قلمی نام سے دو سال تک مسلسل جاری رہا۔ سراغ رسانوں کی فہرست میں حسن مثنیٰ ندوی، ابوالخیر کشفی، علی اکبر قاصد، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، نظیر صدیقی، قاضی عبدالودود وغیرہ شامل تھے۔

مہر نیم روز کے مضامین کی تفصیلات:

ذیل میں ''مہر نیم روز'' میں چہ دلاوراست'' کے عنوان سے علمی، ادبی، تحقیقی سرقوں کی سرگزشت کی تفصیل پیش کی جا رہی ہے۔کل اکتیس مضامین تحریر کیے گئے، ۲۴ مضامین شائع ہوئے جب کہ سات مضامین غیر مطبوعہ ہیں۔ایک مضمون جو دانتے کے سرقے کا احاطہ کرتا ہے حبیب الحق ندوی صاحب نے تحریر کیا تھا یہ کسی اور رسالے میں شائع ہوا بعد ازاں کاروان ادب لکھنؤ میں بھی شائع ہوا۔

یہ مضامین اپریل ۱۹۵۶ء تا ستمبر ۱۹۵۸ء تک مسلسل شائع ہوئے، کچھ وقفے کے بعد مارچ ۱۹۶۰ء میں دو مضامین شائع ہوئے پھر ایک طویل وقفے کے بعد آخری مضمون ۱۹۷۰ء

میں شائع ہوا۔۱۹۷۷ء میں مہر نیم روز ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔مطبوعہ مضامین کی ترتیب زمانی درج ذیل ہے:

مرزا حیرت	ابوالخیر کشفی	غیر مطبوعہ
تاریخ امت	سید حسن مثنی ندوی	غیر مطبوعہ
ترجمان القرآن	سید حسن مثنی ندوی	غیر مطبوعہ
انڈین فلاسفی	سید حسن مثنی ندوی	غیر مطبوعہ
اعجاز المسیح	سید حسن مثنی ندوی	غیر مطبوعہ
علامی ابوالفضل	سید ابوالخیر کشفی	غیر مطبوعہ
مرزا حیرت	سید ابوالخیر کشفی	غیر مطبوعہ
اطالوی بیداری	ڈاکٹر حبیب الحق ندوی	غیر مطبوعہ
ترغیبات جنسی	سید حسن مثنی ندوی	جون ۱۹۵۶ء
سیر المصنفین	سید حسن مثنی ندوی	جولائی ۱۹۵۶ء
نیلی چھتری	سید حسن مثنی ندوی	اکتوبر ۱۹۵۶ء
اس نے کہا	سید حسن مثنی ندوی	نومبر ۱۹۵۶ء
عالم گم گشتہ	سید حسن مثنی ندوی	دسمبر ۱۹۵۶ء
فانی بدایونی	سید حسن مثنی ندوی	جنوری ۱۹۵۷ء
نظامِ اقتصادیات	سید حسن مثنی ندوی	مارچ ۱۹۵۷ء
اردو	سید حسن مثنی ندوی	مئی ۱۹۵۷ء
نقادانِ کرام	سید حسن مثنی ندوی	اکتوبر ۱۹۵۷ء
ضدی	سید علی اکبر قاصد	مارچ ۱۹۵۶ء
ن،میم راشد	سید علی اکبر قاصد	اپریل ۱۹۵۶ء

پتھر	سید ابوالخیر کشفی	فروری ۱۹۵۶ء
نیرنگِ خیال	سید ابوالخیر کشفی	اگست ۱۹۵۶ء
احتساب کانفرنس	رسالہ الناظر لکھنؤ	مئی ۱۹۵۶ء
تصورِ اقبال	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	جولائی، اگست ۱۹۵۷ء
نرگس جمال	نظیر صدیقی	جون ۱۹۵۷ء
مزدور کی بیٹی	رسالہ زمانہ کانپور	اپریل ۱۹۵۷ء
شہزادہ اور عورت	سید ابوالخیر کشفی	اپریل ۱۹۵۸ء
فارابی	پروفیسر حافظ غلام مرتضیٰ	ستمبر ۱۹۵۸ء
مثنوی	قاضی عبدالودود بیرسٹر	جون، جولائی ۱۹۵۸ء
چراغ تلے اندھیرا	سلیم عاصمی	جنوری سالنامہ ۱۹۵۸ء
اصولِ تمدن	سید ابوالخیر کشفی	اپریل ۱۹۵۹ء
ید بیضا	مولانا احسن مارہروی	ستمبر ۱۹۶۰ء

مولانا حسن مثنّیٰ ندوی مرحوم کے مسودات سے سرقہ بازوں کی ایک فہرست بھی برآمد ہوئی ہے۔ اس فہرست کی تفصیل ابوالانشاء کے قلم سے پڑھیے: ان موضوعات پر کام کرنے کی ضرورت ہے۔ نشانات راہ مولانا نے بتا دیے ہیں۔

شاپنہاور: شوپنہاور کی جہاں تک زندگی اور فلسفے کا تعلق ہے، مجنوں گورکھپوری کی کتاب تمام تر تامس وٹیکر کی تلخیص و ترجمہ ہے۔

ابواب وعنوانات بھی انھوں نے اسی سے اخذ کیے ہیں۔

صحابیات: نیاز فتح پوری نے لکھی ہے اور دارالمصنفین کی کتاب سیر الصحابیات ان کا ماخذ ہی نہیں حاصل ہے۔

فتنۂ تاتار: ایم اسلم کی مشہور کتاب ہے مگر اس ناول نگار نے دوسرے

مشہور ناول نگار عبدالحلیم شرر کی کتاب زوالِ بغداد کو اپنا حاصل بنا لیا ہے۔

آغازِ ہستی: مجنوں گورکھپوری کی کتاب ہے مگر کہتے ہیں کہ برنارڈ شا کی کتاب Back to Methnila ان کے سامنے تھی۔

مصرف رقاصہ: پطرس بخاری کی کتاب ہے، میری کوریلی ان کے سامنے تھی۔

طلسمات: عبدالحلیم شرر کی کتاب ہے اور ملک العزیز ورجینا بھی، رام بابو سکینہ کا بیان ہے کہ اسکاٹ کی تصنیف ان کے سامنے تھی۔

خواب ہستی: مرزا محمد سعید کی کتاب ہے۔ چارلس ریڈ کا چربہ ہے۔

الحمراء کی کہانیاں: غلام عباس نے لکھیں، واشنگٹن ارونگ کی انگریزی کتاب اسی نام سے ہے الحمراء کی کہانیاں۔

کرنیں، شگوفے حماقتیں: شفیق الرحمٰن ......لیکاک، [Library Lappes]

پچھتاوے: شفیق الرحمٰن ...... ڈیمن رینیاں [Good solder shewich]

سلیم اللہ خاں [افسانہ]: منٹو ......سمرٹ ماہم

اس منجدھار میں [ڈرامہ]: منٹو ......سمرٹ ماہم

جاڑے، سردی گرمی [افسانہ]: فرحت اللہ بیگ...... Destrninter series 5th

مرزا مینڈک [افسانہ]: ایم اسلم ...... مارک ٹوئین [Jumping frog]

نرگس: ایم اسلم ...... ایلگزینڈر ڈوماز، [Lady with the canalions]

رات [افسانہ]: اے حمید موپاساں [Night]

مثلث[افسانہ]:	عزیز احمد......ڈمر چارلس
کلیاں[افسانہ]:	عزیز احمد......ڈمر چارلس
ابھوش:	پریم چند......ایوام آڈن
گنا:	مجنوں گورکھپوری ...... ٹیمنی سن اور ٹامس ہارڈی[Tess]
ترقی پسند ادب:	عزیز احمد......ڈیوڈ گوما[Croche]
تاریخ الدولتین:	نیاز فتح پوری ......جرجی زیدان، التمدن الاسلامی۔
دلیر مجرم:	ابن صفی ......پٹیر سنی [The centre design]
نیلی سوئی:	مظہر انصاری......پیٹر سنی [The centre design]
پہاڑوں کی ملکہ:	ابن صفی ......سرا یچ رائیڈر ہیگرڈ
خونی دیوتا:	ابن صفی ......سرا یچ رائیڈر ہیگرڈ
انور:	ابن صفی ......لیلی چارٹرس' دی سائمن ٹمپلر [[۴۳]

مہر نیم روزاور حسن مثنّیٰ نے سرقہ نویسی اور سرقہ بازوں کے سلسلے میں جہاد اکبر کیا۔

شبیر میواتی: مشفق خواجہ: عابد مسعود کی معلومات سرقہ

لاہور کے نامور اہل علم شبیر میواتی صاحب نے سرقہ کے سلسلے میں بعض نادر اور اہم معلومات مشہور مفکرین کے حوالے سے مہیا کی ہیں۔ ہماری خواہش ہے کہ وہ خود اس معلومات کی ادارت فرما کر شائع کریں۔حسن مثنّیٰ ندوی صاحب کی وہ بیاض جس میں غالب اور بیدل کے اشعار آمنے سامنے ہیں سرقہ کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔یہ بیاض ڈاکٹر تحسین فراقی کے سپرد کی جا رہی ہے تا کہ وہ مقالہ تحریر فرمائیں۔ جناب مشفق خواجہ مرحوم نے عصر حاضر کے سرقوں پر بعض اہم معلومات مہیا فرمائی ہیں جو کسی اور موقع پر پیش کی جائیں گی۔ چیچہ وطنی سے عابد مسعود صاحب نے مولانا مودودیؒ کی الجہاد فی الاسلام کے کئی صفحات کو مولانا آزاد کا سرقہ قرار دیا ہے لیکن ابھی تک وہ اس کے ٹھوس شواہد مہیا نہیں کر سکے۔غلام احمد پرویز صاحب

نے اپنی تفسیر کے بہت سے مقامات مولوی چراغ علی سے سرقہ کیے ہیں اور بہت سے افکار و نظریات کا سرقہ سرسید، احمد دین امرتسری اور حضرت علامہ اقبالؒ سے کیا ہے، لیکن اس کا اعتراف کہیں نہیں کیا گیا۔ لغات القرآن کی تالیف، تدوین وترتیب میں علامہ تمنا عمادی، جعفر شاہ پھلواریؒ اور عمر احمد عثمانی کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن پرویز صاحب نے اس کا اعتراف نہیں کیا۔ پھلواری صاحب کو تو معاونت رقم ادا کر دی گئی تھی، لیکن عمادی اور عثمانی صاحب کو تو معاوضہ بھی ادا نہیں کیا گیا۔

سرقے کی ایک عجیب وغریب قسم:

بعض محققین کا خیال ہے کہ ''ڈاکٹر فاروق خان صدر دانش سرا پاکستان کی تمام کتابیں جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار، تقاریر، خیالات کا لفظ بہ لفظ سرقہ ہیں۔ وہ اسے استفادہ کا نام دے کر معصومانہ اعتراف فرماتے ہیں، کئی کتابوں میں یہ اعتراف بھی موجود نہیں ہے۔ اگر اس حقیقت کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر جاوید غامدی صاحب کی بہت سی کتب ڈاکٹر فاروق کا سرقہ قرار پائیں گی۔ مثلاً اصول ومبادی اور اسلام کیا ہے مولفہ ڈاکٹر فاروق کے تمام مباحث لفظ بہ لفظ اور معناً بھی ایک جیسے ہیں۔ ڈاکٹر فاروق خاں کی تمام [۱] کتب اسلام اور عورت، [۲] جہاد وقتال اور عالم اسلام [۳] اسلام کیا ہے؟ [۴] جدید ذہن کے شبہات اور اسلام کا جواب [۵] مرد اور عورت سماجی تعلق کے آداب [۶] حدود آرڈیننس اور خواتین جاوید غامدی صاحب کی تین سو تقاریر اور سوال و جوابات کا مکمل سرقہ ہیں۔'' ہماری تحقیق کے مطابق اسے سرقہ کہنا زیادتی ہے۔ ڈاکٹر فاروق دانش سرا کے صدر ہیں اور یہ کتابیں اپنے مسلک کی تبلیغ کے لیے مسلک کے بانی کی اجازت، رہنمائی، مشاورت اور سرپرستی سے تیار کی گئی ہیں۔ یہ سرقے کی وہ قسم ہے [اگر اسے سرقہ کہا جاسکے] جو افہام وتفہیم اور باقاعدہ وباضابطہ اجازت سے یا منصوبہ بندی، مصلحت، حکمت اور بعض نزاکتوں کے باعث عمل میں آتی ہے۔ دانش سرا کے سرپرست جناب غامدی صاحب ہیں اور اس کے صدر

جناب ڈاکٹر فاروق لہٰذا اس کو سرقہ کہنا مشکل ہے کیونکہ اس طرح کے کاموں کے لیے کوئی اصطلاح ابھی تک وجود میں نہیں آئی ۔لہٰذا اسے سرقے کے ذیل میں رکھنا مناسب بات نہیں ۔اس قسم کے معاملات کی مثال ماضی میں بھی ملتی ہے مثلاً اہلحدیث عالم جناب نواب صدیق حسن قنوجی کی بہت سی کتابیں ان کے صاحبزادوں کے نام سے ہیں جب کہ ان مصنفین کی عمریں کتابوں کی تالیف کے وقت دس بارہ سال سے زیادہ نہیں تھی ۔ڈاکٹر معین الدین عقیل کے تحقیقی مقالات کے مجموعے میں اس موضوع پر تفصیلی معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ اس فعل کو سرقہ کہنا بہت مشکل ہے ۔اس کی تفصیلات کسی اور موقع پر پیش کی جائیں گی کم وبیش یہی معاملہ ڈاکٹر فاروق خان صاحب کی کتابوں کا ہے۔

جامعات کے تحقیقی مقالے سرقہ کی نئی روایت :

بیسویں صدی کے عظیم ترین سرقے کا ارتکاب اردو ادب کے دو بڑے لوگوں پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر آل احمد سرور کی زیر سرپرستی جامعہ لکھنؤ میں ڈاکٹر محمد علی زیدی نے کیا۔ یہ بیسویں صدی کا المیہ ہے۔ایسے المیے پاکستان و ہندوستان کی جامعات میں کثرت سے ہو رہے ہیں۔ جامعہ پشاور نے اس الزام میں ایک استاد کو ملازمت سے برطرف کر دیا تھا۔ جامعات میں سرقوں کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور تحقیق کا ایک الگ موضوع ہے ۔بیسویں صدی کے سرقوں کی بے شمار اقسام کو اس میں دانستہ شامل نہیں کیا گیا ۔

وقار عظیم اور سجاد باقر رضوی کے سرقے

ممتاز لیاقت کی تحقیقات سرقہ'' بکف چراغ دارد'' کے مطابق پروفیسر سید وقار عظیم نے '' تاریخی ناول اور اس کا فن'' کے نام سے رسالہ سویرا کے ۲۶ ویں شمارے میں ایک سرقہ شدہ مضمون شائع کیا۔یہ مضمون Alfred Tresidder Sheppard کی کتاب The Art & Praetice of Historical Fiction سے لفظ بلفظ سرقہ کیا گیا ہے۔یہ کتاب ۱۹۳۰ء میں Humphrey Toulmin نے لندن سے شائع کی تھی اور تاریخی ناول کے فن پر مشہور اور معرکہ

آراء تصنیف ہے۔ وقار عظیم صاحب دانش گاہ پنجاب سے وابستہ تھے۔ جامعہ پنجاب کے دائرہ المعارف اسلامیہ کے لیے وقار عظیم صاحب نے امانت لکھنوی پر مقالہ تحریر فرمایا تو یہ مقالہ بھی حسب سابق سرقہ تھا اور سید مسعود حسن رضوی ادیب کی کتاب "لکھنؤ کا عوامی اسٹیج [مطبوعہ ۱۹۵۷ء سلیمی پریس الہ آباد] سے لفظ بلفظ سرقہ کیا گیا۔ جامعہ پنجاب سے ملحقہ علمی ادارے اورینٹل کالج کے استاد پروفیسر سجاد باقر رضوی نے مجلس ترقی ادب کے سہ ماہی مجلّے "صحیفہ" کے ۳۶ ویں شمارے بابت جولائی ۱۹۶۶ء میں "ہنسی کے متعلق عرب حکماء کے چند نظریات" پر مقالہ تحریر فرمایا۔ یہ مقالہ Franz Rosenthal کی کتاب Humour in Early Islam سے سرقہ کیا یہ سرقہ کتاب کے ضمیمہ Appendix: on Langhter صفحہ ۱۳۲ تا ۱۳۸ سے چربہ کیا گیا ہے۔ اورینٹل کالج اور دانش گاہ پنجاب کے دو اہم اساتذہ کے سرقوں سے صورت حال کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر کی سرقہ شدہ کتاب:

جامعات میں سرقوں کی روایت پاکستانی اور ہندوستانی جامعات سے مخصوص نہیں ہے دنیا کی بڑی بڑی جامعات میں بڑے پیمانے پر سرقہ کی وارداتیں ہوتی ہیں جنھیں جامعات کے عزت و وقار کی خاطر دبا دیا اور چھپا دیا جاتا ہے۔ حال ہی میں ہارورڈ یونیورسٹی کے نسل پرست یہودی پروفیسر درشووٹز کی کتاب Chutzpah [1992] کے بارے میں Norman Finkelstein نے اپنی کتاب Beyond Chutzpah: on the misue of anti semiticism & abuse of history میں اس سرقے کے بارے میں چونکانے والے انکشافات کیے ہیں۔ نارمن فنکلسٹائن Norman Finkelstein کی کتاب امریکہ میں آج کل توجہ کا مرکز ہے۔ یہ کتاب ہاورڈ یونیورسٹی کے نسل پرست اور اسرائیل کے زبردست حامی قانون کے پروفیسر درشووٹز کی کتاب Chutzpah [1992] کی جعلسازی اور سرقہ بازی بے نقاب کرنے کے لیے لکھی گئی ہے۔ نارمن فنکلسٹائن خود ایک یہودی ہیں، اپنی کتاب میں انھوں

نے اسرائیل کا اصل چہرہ دکھایا ہے۔ نارمن The Holocaust Industry کے مصنف بھی ہیں جس نے پوری یہودی دنیا کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ وہ De Paul University شکا گو میں سیاسیات کے پروفیسر ہیں اور اپنی تازہ ترین تصنیف میں انھوں نے ہاورڈ میں قانون کے صیہونی پروفیسر Allan Dershowitz کے علمی بت کو مسمار کر دیا ہے۔ پروفیسر درشووٹز جو کئی کتابوں کے مصنف ہیں اور ان کی بعض کتابیں صیہونیت، یہودیت اور اسرائیل کی رواں حکمت عملی کی مدلل مداح کرتی ہیں، ہمیشہ سے فلسطینیوں پر اسرائیل کے مظالم کے معذرت خواہانہ حامی رہے ہیں۔ اپنی کتاب [1992] Chutzpah اور [2003] The Case for Israel میں انھوں نے صیہونیوں کے حق میں جذباتی دلائل بھی دیے ہیں مگر نارمن فنکلسٹائن نے Beyond Chutzpah میں پروفیسر درشووٹز کو دھوکہ باز، جھوٹا اور سارق قرار دیا ہے۔ کتاب The case for Israel کے تعارفی باب میں ہاورڈ کے پروفیسر درشووٹز نے دعویٰ کیا تھا کہ کتاب میں دی گئی معلومات اور حقائق کو دیکھ کر وہ لوگ یقیناً حیران رہ جائیں گے جو ہمیشہ یک طرفہ ذرائع سے معلومات حاصل کرتے ہیں۔ مگر وہ لوگ جو اسرائیل فلسطین تضاد پر شائع ہونے والی تاریخی تعصبات سے بھرپور Peer کی انگریزی کتاب سے واقف ہیں وہ اس کتاب کے مندرجات سے قطعی حیران نہیں ہوں گے۔ نارمن کی تحقیق کے مطابق اپنی اس کتاب میں درشووٹز نے جان پیٹر کی یادگار تاریخی دھوکا بازی پر مبنی تصنیف From time immemorial کے تمام ماخذات کا چربہ کر لیا ہے۔ نیز اس نے انتہائی بے شرمی سے نہ صرف Peter کے مواد کی ہو بہو نقل کی ہے۔ بلکہ انھوں نے بہ بانگ دہل اس کتاب سے مواد چوری کیا ہے، اس عمل کی سنجیدہ اہل علم طبقہ [اسکالرز] نے مذمت بھی کی ہے۔ یہ عالمانہ بدنامی ہے یا سرقہ بازی یا دونوں؟ چند سال قبل دونوں پروفیسرز کو ایک ٹی وی شو میں درشووٹز کی کتاب پر گفتگو کرنے کے لیے بلایا گیا تو فنکلسٹائن نے مصنف پر الزام لگایا کہ مصنف نے ایک بڑا دھوکہ تخلیق کیا ہے۔ ان دونوں کے درمیان ہونے والی تکرار ایک جنگ کی صورت اختیار کر گئی۔ فنکلسٹائن کا کہنا تھا کہ اسے اس دھوکے سے صدمہ پہنچا

ہے اور یہ صدمہ اس لیے شدید ہے کہ یہ ہارورڈ کے ایک پروفیسر کی طرف سے ہے جبکہ قانون کے پروفیسر ورشووٹز نے اس الزام کو مسترد کرتے ہوئے اسے فنکلسٹائن کی ذاتی مخاصمت کا نتیجہ قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اصل مسئلے پر گفتگو کرنے کے بجائے اس کی ذات کو نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ جو حرکت ہاورڈ کے پروفیسر نے کی ہے۔ اسی کا ارتکاب اگر وہاں کا طالب علم کرتا تو اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا؟ فنکلسٹائن نے اپنی کتاب Beyond Chutzpah کے اجراء کے بعد یہ سوال کیا۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اسے ہارورڈ سے نکال دیا جاتا تو پھر ہارورڈ فنکلسٹائن کے اس قدر سنجیدہ الزامات کے جواب میں کیوں خاموش ہے؟ کیا یہاں طلباء کے لیے ایک قانون اور پروفیسرز کے لیے دوسرا قانون ہے؟ ایسا سوچا جا سکتا ہے کیونکہ ہارورڈ یونیورسٹی کے موجودہ صدر Lawrence Summers ایک یہودی اور اسرائیل کے حامی ہیں۔ MIT کے مثالی دانش ورنوم چومسکی نے فنکلسٹائن کے کام کی تعریف کی ہے اور اسے ٹھوس، اہم اور بہت زیادہ معلومات انگیز کتاب قرار دیا انھوں نے ورشووٹز کو اسٹالن کے انداز کا ٹھگ قرار دیا۔ آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر علوی شلیم کا کہنا ہے کہ Beyond Chutzpah ایک نہایت عالمانہ کتاب کی اشاعت رکوانے کے لیے ورشووٹز نے ہر طرح کے اقدام کا عندیہ دیا، جب یہودی قوت ہر اس شخص کے لیے خطرناک اور مہلک ہے جو اس کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ ورشووٹز نے کیلیفورنیا کے گورنر شوارزنجر سے درخواست کی ہے کہ اس کتاب پر پابندی عائد کی جائے جس کے جواب میں گورنر کے قانونی امور کے مشیر نے جواب دیا کہ وہ اس معاملے میں کسی بھی قسم کا دباؤ استعمال نہیں کرنا چاہتے کیوں کہ یہ علمی آزادی کا معاملہ ہے۔

نیویارک کی مشہور کتابوں کی دکانیں جہاں تمام مقبول کتابیں دوکان کے سامنے سجائی جاتی ہیں وہاں نارمن فنکلسٹائن کی کتاب سامنے موجود نہیں تھی بلکہ یہ دکان کے پچھلے حصے میں رکھی گئی تھی اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ دکان کے مالکان یہودیوں کے خلاف کوئی بھی مواد سامنے نہیں رکھنا چاہتے اس سے فوراً یہ سوال ذہن میں ابھرتا ہے کہ اس کے علاوہ اور کیا کیا چیزیں چھپائی گئی

ہوں گی؟

بیسویں صدی سرقوں کی نئی اقسام کی صدی:

بیسویں صدی میں سرقوں کے ان گنت اقسام ایجاد کی گئیں مثلاً محققین کے مسودات چوری کر کے اپنے نام سے شائع کرا لینا، دوسروں محققین کی عسرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اونے پونے داموں پر مسودات خرید لینا، عقیدت مند کی طرح حاضر خدمت ہو کر کسی موضوع کو چھیڑنا اور گفتگو کے دوران بکھرنے والے لولوئے لالہ کو سمیٹ کر مقالے تیار کرنا، کسی گوشہ نشین اہل علم سے استفادہ کرتے ہوئے گفتگو ریکارڈ کر لینا یا ان کی مجالس کو محفوظ کر کے اپنے نام سے کتاب تیار کرنا اور کتاب ان کے نام معنون کر دینا۔ جناب ضمیر نیازی نے ایم کے ایک ایسے ہی مقالے کا ذکر کیا تھا جو ایک جامعہ کے مرکز مطالعات پاکستان کی طالبہ نے ضمیر نیازی کی کتاب صحافت پابند سلاسل سے حرف بہ حرف سرقہ کیا اور اس کا انتساب ضمیر نیازی کے نام کر دیا اور یہ کتاب اسی مرکز سے شائع بھی ہو گئی۔ مختلف ناشرین اور اداروں کے پاس طباعت کے لیے آنے والے مسودوں کا مطالعہ کر کے اسی موضوع پر کتاب اصل کتاب کی طباعت سے پہلے شائع کرا لینا، طلباء و طالبات سے تحقیق کرا کے اپنے نام سے مقالات اور کتابیں شائع کرانا، قینچی کے ذریعے تحقیق کر کے کتابیں اور مضامین تیار کرنا، کتاب کے شروع میں لکھ دینا کہ کتاب لکھتے ہوئے یہ اہم کتابیں پیش نظر رہیں اور ان اہم کتابوں کے مضامین ودلائل لفظ بہ لفظ نقل کر لینا، اس کے علاوہ انٹرنیٹ سے سرقے کے جدید ترین طریقے جن کی تاریخ تحریر کرنے کے لیے الگ مقالے کی ضرورت ہے۔ بیسویں صدی کی ایک نئی بدعت اہل علم کے مسودے طباعت سے پہلے چوری کر کے اپنے نام سے شائع کرانے کی ہے، یہ نہایت خطرناک روایت ہے۔ اس کام میں اردو ادب کے بعض عالی مرتبت لوگ بھی شریک رہے ہیں جن کا ذکر ایک مستقل مقالے کا طلب گار ہے۔ یہ تمام موضوعات ایک علیحدہ کتاب کا تقاضہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں کام جاری ہے۔

کتابیات

۱۔ مولوی حکیم نجم الغنی بحرالفصاحت، مطبوعہ نول کشور لکھنو، [طبع سوم ۱۹۲۶ء]

۲۔ رسالہ الناظر لکھنؤ مئی 1919ء بحوالہ مہر نیم روز، مئی ۱۹۵۶ء

۳۔ ناطق لکھنوی ''سرقہ وتوارد'' مشمولہ ماہنامہ زمانہ کانپور، ۱۹۳۱ء، جلد ۵۶ نمبر ۳

۴۔ یاس یگانہ چنگیزی غالب شکن مطبوعہ آگرہ، [اشاعت اول ۱۹۳۴ء]

۵۔ پنڈت برج موہن کیفی، منشورات، [دانش محل امین گنج دہلی] [طبع ثالث ۱۹۴۵ء]

۶۔ عندلیب شادانی سرقہ اور توارد مشمولہ ''تحقیق کی روشنی میں'' شیخ غلام علی لاہور [طبع اول ۱۹۶۳ء]

۷۔ سرقہ یعنی چوری مشمولہ ''دورِ حاضر اور اردو غزل گوئی''، ایضاً، [طبع اول ۱۹۵۱ء]

۸۔ بکف چراغ دارد، سرقے پر ممتاز لیاقت کے مضامین ہفت روزہ چٹان میں شائع ہوئے تھے بعد میں کتابی شکل میں شائع ہوئے لیکن کتاب نہیں مل سکی۔

۹۔ ناطق لکھنوی سرقہ وتوارد، ص ۱۵۳، ایضاً

۱۰۔ پنڈت برج موہن کیفی ''نظر اور خودنظری'' مشمولہ منشورات، ایضاً، ص ۱۷۳

۱۱۔ عندلیب شادانی سرقہ اور توارد، ص ۱۷۱، ایضاً،

۱۲۔ ایضاً، ص ۱۷۳

۱۳۔ فراق گورکھپوری بحوالہ سرقہ یا چوری مشمولہ دورحاضر اور اردو غزل گوئی، ص ۲۶۲

۱۴۔ عندلیب شادانی سرقہ یا توارد، ص ۴۷۱

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۷۲۔

۱۶۔ ماثر الکرام صفحہ ۶۹ حیدرآباد ایڈیشن بحوالہ ''تحقیق کی روشنی میں''، ص ۴۶۹

۱۷۔ شادانیؒ نے مطول کا حوالہ دے کر کلیم کے اشعار بحرالفصاحت کے ص ۱۲۲۲ سے نقل کیے ہیں لیکن ان کا حوالہ نہیں دیا۔ ''سرقہ یا توارد'' پر جتنے بھی اہم مضامین شائع ہوئے ہیں ان کا ماخذ ''بحرالفصاحت'' ہے۔ امثال بھی اسی کتاب سے لی گئی ہیں لیکن حوالہ ندارد۔

۱۸۔ عندلیب شادانی سرقہ یا توارد، ص ۴۷۱، ۴۷۰

۱۹۔ ایضاً، ص ۵۰۲ تا ۵۰۳، [ایضاً]

۲۰۔ ناطق لکھنوی ''سرقہ توارد'' مشمولہ زمانہ کانپور، ص ۱۵۹ تا ۱۵۸، [ایضاً]

۲۱۔ ایضاً، ص ۱۶۵۔

۲۲۔ عندلیب شادانی سرقہ اور توارد، ص ۴۷۱، ایضاً

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۷۲،

۲۴۔ ایضاً

۲۵۔ ایضاً

۲۶۔ حکیم نجم الغنی بحرالفصاحت، ص ۱۱۷۴، مطبع نول کشور لکھنو، [۱۹۲۶ء طبع سوم]

۲۷۔ حکیم نجم الغنی بحرالفصاحت، ص ۱۲۲۶ تا ۱۱۷۴ [سرقے کی قسمیں] ایضاً

۲۸۔ ناطق لکھنوی ''سرقہ وتوارد''، ص ۱۵۹، ایضاً

۲۹۔ خودکشی سے متعلق یہ مضمون مشتاق یوسفی نے کسی کتاب میں بڑی خوبصورتی سے باندھا ہے لیکن اس کا حوالہ سردست دستیاب نہیں۔

۳۰۔ ناطق لکھنوی سرقہ وتوارد، ایضاً، ص ۱۶۶

۳۱۔ ایضاً،ص ۱۶۶۔۱۶۵

۳۲۔ عندلیب شادانی ''سرقہ اور چوری''،ص ۴۹۶،ایضاً

۳۳۔ ناطق لکھنوی ''سرقہ وتوارد'' زمانہ کانپور، ایضاً،ص ۵۹

۳۴۔ عندلیب شادانی ''سرقہ یعنی چوری''،ص ۲۲۵،ایضاً

۳۵۔ ایضاً،ص ۲۶۵ تا ۲۲۷،ایضاً

۳۶۔ عندلیب شادانی ''سرقہ یا توارد'' مشمولہ تحقیق کی روشنی میں،ص ۵۰۴ تا ۲۷۴

۳۷۔ ناطق لکھنوی ''سرقہ وتوارد'' ایضاً،ص ۱۶۴ تا ۱۶۱

۳۸۔ حسرت موہانی ''نکات سخن'' [غضنفر اکادمی کراچی][بار اول ۱۹۹۶ء]

۳۹۔ منیر لکھنوی ''منیر البیان تحقیق لسان''ص ۹۷ تا ۹۹ مطبع مجیدی کانپور[بار اول جنوری ۱۹۳۰ء] منیر لکھنوی نے فارسی شعروں کے اردو سرقوں کی نشاندہی کی ہے ان کا عکس دیا جا رہا ہے۔

اشعار فارسی	اشعار اردو
اشرف ـه درچشم ودلم دام بودی آموختی از کہ این ادا را	میر ـه آنکھوں میں بسے ہو ولے نہیں لگتے ہو حیران ہوں تجھ کو بھی آتی ہیں یہ گھاتیں
ناصر علی ـه برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش تا نکہت گل بیختہ آید بدماغش	عبد الجلیل بلگرامی ـه پھولوں ہی گھونگھٹ کر باغ میں جات مکھ باس بن چھانے نا نکہت سمات

عہ باغ میں گھونگھٹ نکالے اسلیے جاتی ہے کہ پھول کی خوشبو بے چھنے حسین تک نہ پہنچے ۱۲ منہ

اشعار فارسی	اشعار اردو
میر معزی سے ہیچگونی کرہا تو انتقاد بست	میر سے کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
بگو غلام کرارا اعتقاد لیست	ہاں کہو اعتقاد ہے ہم کو
ناصر علی سے دست خواہم زد بدامان سکندر روز حشر	میر سے دیکھو آئینہ کو یار ہوا محو ناز کا
شوخی لیلی لاادہ اسرار رنگ مجنون کو ا	خانہ خراب ہو جیو آئینہ ساز کا
نظام سے گنہ نا بہت ار ہستے در شمار	ناظم سے آمادہ عفو پر تو خدا سے غفور تھا
ترا نام کے بود سے آمرزگار	کرتا نہ میں گناہ تو میرا قصور تھا
علی حزین سے تا چشم تو زہ کردہ کمانے بہ کشیدنے	سودا سے ناوک نے ترے صید نہ چھوڑا زمانے میں
یک صید نما سود زمانے بہ زمینے	تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں
ناظم سے خیدہ اثر زنسخ گریہ مطلب چیست ناصح را	فناؔ سے شکوہ اثر گریہ کرے ہے عبث ... کا
دل از مژگان دیدہ آستین از من گناہ	کہ تیری آستین ہے لہو سے بھر گئی

۴۰۔ ناطق لکھنوی "سرقہ و توارد" ص ۱۵۸، ایضاً

۴۱۔ ایضاً ص ۱۵۷

۴۲۔ ایضاً ص ۱۵۸ تا ۱۵۴

۴۳۔ الناظر، مئی ۱۹۹۹ء بحوالہ، ماہنامہ مہر نیم روز، مئی ۱۹۵۶ء، کراچی

۴۴۔ پنڈت برج موہن کیفی "منشورات" پہلے ایڈیشن پر نوٹ، ص ۵۔۴

۴۵۔ علی اکبر قاصد "ضدی" مشمولہ مہر نیم روز، مارچ ۱۹۵۶ء کراچی۔

۴۶۔ ڈاکٹر ممتاز حسن "مقالات ممتاز مرتبہ شان الحق حقی، ص ۲۵۸ تا ۲۵۳، ادارہ یادگار غالب کراچی، [۱۹۹۵ء بار اول]

۴۷۔ ڈاکٹر حبیب الحق ندوی "اطالوی بیداری" ص ۳۹۲، ۳۹۶ جریدہ شمارہ ۲۷

۴۸۔ پروفیسر رے می کی انگریزی کتاب کا ترجمہ "ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر" مترجم ڈاکٹر ریاض الحسن ۱۹۶۷ء گوئٹے انسٹی ٹیوٹ کراچی

۴۹۔ ممتاز حسن "مقالات ممتاز" ایضاً ص ۴۴۵۔۴۴۴

۵۰۔ پروفیسر علی محسن صدیقی "تاریخی مقالات [قرطاس کراچی]" ص ۲۹۹ تا ۳۰۹ [طبع اول ۲۰۰۲ء]

۵۱۔ یہ معلومات جناب خالد اسحاق صاحب کے کشیدہ نہیں سو رجناب طاہر کی صاحب نے مہیا فرمائیں۔

۵۲۔ "یعقوب حسن" "کتاب الہدیٰ" مدراس ۱۹۲۶ء دیباچہ سید سلیمان ندوی اصلاً یہ کتاب مولانا ابوالجلال ندوی کی ہے۔ یعقوب حسن صاحب ملکی سیاسی آدمی تھے۔ کانگریس سے وابستہ تھے، علمی کاموں سے دلچسپی تھی اور اہل علم کی بھرپور سرپرستی کرتے تھے۔

۵۳۔ ابوالجلال ندوی، کتاب الهدی، ص ۱۷۱،[طبع اول بمبئی ۱۹۲۶ء]
۵۴۔ ڈاکٹر محمد صادق آب حیات کی حمایت میں، ص ۱۸۷، ۱۹۷۳ء لاہور
۵۵۔ قاضی عبدالودود کا خط مدیر مہر نیم روز کے نام، مطبوعہ مہر نیم روز ، اکتوبر ۱۹۵۶ء
۵۶۔ ڈاکٹر محمد صادق "محمد حسین آزاد احوال و آثار" ص ۷۵۔۷۴
۵۷۔ اسلم فرخی "محمد حسین آزاد" مشمولہ بازیافت ۳، ص ۳۰، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج۔
۵۸۔ سرقے کی اس واردات کے بارے میں ڈاکٹر جعفر احمد ناظم مرکز مطالعہ پاکستان جامعہ کراچی نے راقم کو معلومات مہیا کی تھیں اور "تاریخ جماعت اسلامی" آباد شاہ پوری حصہ دوم اور ترجمان القرآن ابوالاعلیٰ مودودی نمبر دو جلد سے رجوع کرنے کے لیے کہا تھا لیکن وقت کی تنگی کے باعث ان مصادر سے استفادہ نہیں کیا جا سکا۔
۵۹۔ صادق الخیری کا خط مدیر مہر نیم روز کے نام مطبوعہ اپریل ۵۶
۶۰۔ ڈاکٹر نثار فاروقی کا خط مدیر مہر نیم روز کے نام مطبوعہ خاص نمبر ۱۹۵۶ء
۶۱۔ مختار نامہ مرتبہ ڈاکٹر عطا خورشید، ص ۸۶، علی گڑھ ہیریٹیج پبلی کیشنز، بحوالہ بازیافت ۳
۶۲۔ شاہ حسن گردیزی، تجلیات مہر انور ص ۵۵۲ تا ۵۶۷، مکتبہ مہریہ گولڑا شریف اسلام آباد [بار اول ۱۹۹۲ء]
۶۳۔ محمود علی کا خط مدیر مہر نیم روز کے نام مطبوعہ اکتوبر ۱۹۵۸ء
۶۴۔ طارق حبیب یوسفیات، ص ۲۲۷۔۲۱۸، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد [۲۰۰۳ء بار اول]
۶۵۔ طارق حبیب "یوسفیات" ص ۲۱۴ تا ۲۱۰، ایضاً
۶۶۔ اسلم فرخی "محمد حسین آزاد" مشمولہ بازیافت شمارہ ۳، ص ۳۳۔
۶۷۔ ایضاً ص ۵۳۔
۶۸۔ ڈاکٹر محمد صادق "آب حیات کی حمایت میں" پیش لفظ
۶۹۔ ڈاکٹر محمد صادق "محمد حسین آزاد احوال و آثار
۷۰۔ ڈاکٹر اسلم فرخی "محمد حسین آزاد" مشمولہ بازیافت، ص ۶۳
۷۱۔ ڈاکٹر عبدالرؤف پاریکھ "عصری ادب اور سماجی رجحانات" ص ۶۳، ۶۲، اکادمی بازیافت کراچی [اشاعت اول ۲۰۰۳ء]
۷۲۔ حسن مثنیٰ ندوی "کچھ یادیں کچھ باتیں" "ابلاغ"، شعبۂ ابلاغیات، مئی ۱۹۹۶ء جامعہ کراچی کا مجلّہ ص ۹۷ تا ۹۵۔
۷۳۔ "چہ دلاور است" مولانا حسن مثنیٰ کی زندگی میں مرتب کر دی گئی تھی۔ مولانا اس پر مقدمہ لکھنا چاہتے تھے لیکن ان کی خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ان کے چچازاد بھائی ابوالانشاء نے اس کتاب کا پیش لفظ تحریر کیا ہے۔ یہ معلومات غیر مطبوعہ پیش لفظ سے لی گئی ہیں۔ چہ دلاور است کتابی شکل میں شائع ہو رہی ہے جس میں یہ پیش لفظ بھی شامل ہوگا۔